ایم اے راحت

ایم اے راحت

25 سی لوئر مال لاہور
فون 7325418
wasishah786@hotmail.com
wasishah786@yahou.com

"اے رب! میرے علم میں اضافہ کر"

ہماری کتابیں، معیاری کتابیں، پیاری کتابیں

ناشر: وصی شاہ

wasishah786@hotmail.com
wasishah786@yahoo.com

2002ء

اہتمام : زاہد شیخ
مارکیٹنگ : محمد قاسم
سرورق : عاطف اقبال
پرنٹنگ : اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
قیمت : 140 روپے
بیرون ملک : 5 امریکی ڈالرز

سراب

سورج کی ننھی سی کرن روشندان کی چوکھٹ کے روزن سے نکل کر میری آنکھوں پر پڑی اور پلکوں کے پپوٹے گردش کرنے لگے۔ چھت کے قریب اس روشندان کا وجود کئی بار مجھے ناگوار گزرا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ صبح ناشتے کے وقت ملازم سے کہوں گی کہ اس روشندان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کردے۔ ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں اول تو اس روشندان کا وجود ہونا ہی نہیں چاہیے تھا اور اگر یہ پہلے سے موجود تھا تو جب یہ کمرہ ائیر ٹائٹ کیا گیا تو اس روشندان کو ختم کیوں نہیں کیا گیا۔ لیکن سورج کی اس ننھی سی کرن سے میرا بہت پرانا رشتہ تھا اور یہ ہمیشہ ہی آسمان سے اتر کر سیدھی میرے پاس شوخیاں کرنے چلی آتی تھی۔ اگر روشن دان کی چوکھٹ کا یہ روزن بند ہوجاتا تو اس کرن سے میرا رابطہ ٹوٹ جاتا اور ہر شے سے رابطہ توڑنا بہرطور پر اچھا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمیشہ کی طرح آج بھی میں نے اس ننھی سی، نازک سی، کومل کرن کو معاف کردیا اور میرے جسم میں انگڑائی ابھر آئی۔ میں نے مسکراتی آنکھوں سے اردگرد کے ماحول کو دیکھا پلاسٹک امَلشن پینٹ سے رنگی ہوئی خوبصورت دیواریں بلند و بالا اور کمرے کا بہترین فرنیچر، ڈیکوریشن پیس اور سامنے ہی نظر آنے والا خوبصورت باتھ روم کا دروازہ جس کی دوسری جانب سے پانی گرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ احمر جاگ گئے تھے اور غسل کررہے تھے۔ بلند و بالا قد، خوبصورت چہرہ، متناسب، بدن کالے گہرے سیاہ بال، خوبصورت روشن آنکھیں، مسکراتے ہوئے گلابی ہونٹ، مردانہ حسن کا شاہکار احمر میرے شوہر تھے۔ انگڑائیاں جسم کو پارہ پارہ کرنے لگیں، ائیرکنڈیشن کی ٹھنڈک پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میری زندگی کا حاصل میری

آرزوؤں کا مرکز' میرا یہ گھر۔ قریب ہی سے امانت علی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ۔

دل میں میٹھے میٹھے درد کے پھول کھلے

یہ آواز' یہ آواز اور پھر مجھے یاد آیا کہ احمر کی چھوٹی بہن کو موسیقی سے بے حد لگاؤ ہے اور وہ عموماً امانت علی کے نغمے بجاتی رہتی ہے۔ پھر کچھ اور مناظر نگاہوں کے سامنے سے گزرے اور اس کے بعد نجانے کس طرح میری یہ نیند ٹوٹ گئی میں نے ہراساں نگاہوں سے نیچی چھت' بوسیدہ کمرے اور مدہم روشنی والے گہرے نیلے بلب کو دیکھا۔ سارے خواب چکنا چور ہوگئے تھے اور یہ بدنما دنیا پھر میرے سامنے بے نور ہو چکی تھی۔ بے نور اور تاریک دنیا' رات کا آخری پہر بھی گزر چکا تھا اور کھڑکی سے روشنی اندر آرہی تھی۔ ہاں میرا سہانا خواب ٹوٹ گیا تھا اور ایک بار پھر سے میں آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستی تک پہنچ گئی تھی۔ اپنے آپ سے واقف اپنے آپ کی نگراں ایک بے حقیقت بے وقعت عورت۔ احمر کا کوئی وجود نہیں تھا اور یہ اس رات کا شوہر تھا میرے لئے۔ ہاں میرے خوابوں میں ہمیشہ میری آرزوؤں کی تکمیل ہوا کرتی تھی۔ کبھی احمر اور کبھی عدیل' کبھی شاد ایک ہی نام تھے۔ ایک ہی وجود تھا جو مختلف صورتیں دیکھا کر میرے سامنے آجاتا تھا۔ میرا گھر میری جنت' میری آرزوؤں کا مرکز لیکن صرف خوابوں تک محدود' کیوں کہ خواب سے باہر کی دنیا نہایت مکروہ اور بدنما تھی۔ بالکل اس کمرے کی مانند جس کی دیواروں کا پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ میری آنکھوں کی کوروں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں۔ یہ معمول تھا میری زندگی کا۔ معمول۔ نجانے یہ حسین خواب کہاں سے میری آنکھوں میں آچکے تھے۔ دل کی گہرائیوں میں ایک گھر کا تصور تھا اور یہ تصور اس وقت سے اور شدید ہوگیا تھا جب سے میرا وجود پامال کردیا تھا۔ اور مجھے ریزہ ریزہ کرنے والا میرا باپ تھا۔ ہاں میرا باپ مجید خان جس کے خراٹے اس وقت بھی برابر والے کمرے میں زور و شور سے گونج رہے تھے۔ میں نے اس آواز کو نفرت بھرے انداز میں سنا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک سر چکراتا رہا۔ ٹوٹے خواب اس طرح دکھ دیتے ہیں یہ خواب دیکھنے والوں کا دل ہی جانتا ہے۔ میرے ٹوٹے خواب نے بھی مجھے دکھ دیا تھا۔ میرا خواب کتنا حسین تھا۔ گو وہ ائیرکنڈیشن کمرہ اونچی اونچی دیواریں' پلاسٹک املشن پینٹ سے رنگی ہوئی'

بلندی پر روشن دان جس سے جھانکنے والی ننھی سی سورج کی کرن مجھ سے شناسا تھی۔ اور اور غسل خانے سے گرتے ہوئے پانی کی آواز۔ آہ احمر کا کوئی وجود نہیں تھا۔ عدیل بھی کوئی نہیں تھا۔ شاد کا بھی کوئی وجود نہیں تھا۔ میں تنہا تھی بالکل تنہا۔ اس بے رنگ و نور دنیا میں قطعی تنہا۔ صحرا میں کھڑے ہوئے اکیلے درخت کی مانند جس کا کوئی شناسا نہیں تھا۔ شناسا تو اکثر میری زندگی میں آجاتے تھے۔ ہوس کے مارے ہوئے۔ آنکھوں میں مکروہ کیفیات لئے ہوئے۔ مجھ سے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے اور مجھے ان کی باتوں کا جواب دینا پڑتا تھا۔ کیوں کہ یہ مجید خان کا حکم تھا۔ جو میرا باپ ہونے کی حیثیت رکھتا تھا اور اس طرح میری زندگی کا مالک بن بیٹھا تھا۔ اس کی دی ہوئی گناہ کی پرچھائیوں کے ساتھ گناہ کی وادیوں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ تھی میری زندگی۔ عدیل' احمر اور شاد میرے تراشے ہوئے نام تھے۔ جنہیں میں نے اپنی تنہائیوں کا ساتھی بنالیا تھا۔ یہ تنہائیاں میرے دل میں ان کا تصور دیتی تھیں اور میں ان کے تصور میں کھو کر جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتی تھی۔ میرے لئے خواب دیکھنے کا وقت رات کی تاریکیاں ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ دن کی روشنی میں بھی جب کبھی آرام کا موقع مل جاتا تو میں آنکھیں بند کرلیتی۔ چھت کے قریب روشندان تھا اور اس سے جھانکنے والی ایک کنواری کرن جو میری دوست تھی اور' اور غسل خانے میں گرتا ہوا پانی' دور سے آتی ہوئی امانت علی کی آواز۔

دل میں میٹھے میٹھے درد کے پھول کھلے

یہ درد میرے وجود میں سما گیا تھا۔ اور جب بھی راتوں کے خواب ٹوٹ جاتے یہ درد شدید سے شدید تر ہوجاتا۔ ماضی میری نگاہوں کے سامنے کھڑکی کے اس جانب پھیلا ہوا تھا۔ نجانے کیوں ایک بار پھر ماضی کو دیکھنے کو جی چاہا۔ اپنی جگہ سے اٹھی۔ آہستہ آہستہ کھڑکی کے قریب پہنچی اور کھڑکی کھول دی۔ ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے کسی کی ملکیت نہیں تھے اور انہیں اندر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میرے تپتے ہوئے وجود کو ہوا کے ان جھونکوں نے سہارا دیا۔ اور میری نگاہیں سامنے کے پیلے مکان سے پرے اور پرے اس مکان تک پہنچ گئیں جہاں میں نے ہوش سنبھالا تھا۔ جہاں میری ماں تھی۔ زرد چہرہ' ڈھکی ہوئی آنکھیں' بکھرے بال جو شام کو سنور جایا کرتے تھے اور نجانے شام ہوتے ہی اس زرد

چہرے کی زردی کہاں چلی جاتی تھی۔ اس پر سرخی پاؤڈر کی تہیں نظر آنے لگتی تھیں اور آنکھوں کے حلقے بھی چھپ جایا کرتے تھے۔ اس وقت کتنی اچھی لگتی تھیں مجھے ماں اور میں ان سے کہتی تھی۔

"آپ دن بھر ایسی ہی کیوں نہیں رہتیں امی' آپ کتنی اچھی لگ رہی ہیں اس وقت" اور جن نگاہوں سے وہ مجھے دیکھتی تھیں ان لمحات میں ان کا تصور آج کرتی ہوں تو ان نگاہوں کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ امی کی آنکھیں کہتی تھیں کہ بدبخت یہ وقت تو میری زندگی کا بدترین وقت ہوتا ہے۔ یہ وقت تو وہ ہوتا ہے جب میری لاش سامنے پڑی ہوتی ہے۔ اور اسے گدھ اپنی لمبی لمبی نوکیلی چونچ سے نوچ رہے ہوتے ہیں۔ آہ کاش یہ وقت کبھی نہ آئے۔ میرے چہرے پر ہمیشہ زردی رہے۔ میری آنکھوں میں دھند لاہٹیں رہیں' میرے ہونٹوں کی یہ مصنوعی سرخی بھی میرے ہونٹوں تک نہ پہنچ سکے۔ اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن آج ماں کی آنکھوں کی زبان میرے وجود کے ایک ایک ذرے میں بسی ہوئی تھی اور ان ساری چیزوں کا محرک میرا باپ تھا۔ وہ کمبخت جسے نجانے کیوں باپ کا نام دے دیا گیا تھا۔ ایک ہاتھ کٹا ہوا شخص جس کی صورت پر شیطان رقصاں ہی رہتا تھا۔ ہاں مجید خان میرا باپ تھا۔ ماں کی اور بہت سی باتیں تو مجھے معلوم نہیں تھیں ہوش کے لمحات اچھی طرح یاد تھے۔ دوپہر ہوتی تو میرا باپ اپنا مخصوص عمل شروع کردیتا۔ یعنی بند کمرہ ہوتا۔ شائیں شائیں کی آوازیں آرہی ہوتیں۔ اور ماں کے چیخنے کی آواز۔ مجھے برآمدے میں بٹھادیا جاتا تھا۔ اور میں وہاں بیٹھی روتی رہتی تھی۔ جانتی تھی کہ اندر کوئی کھیل نہیں ہورہا۔ بلکہ شاید بندر سدھانے والا بندر سدھارہا ہے۔ تاکہ بندر اپنا بہترین تماشہ عوام کے سامنے پیش کرسکے۔ مجید خان کسی زمانے میں کسی مل وغیرہ میں کام کرتا تھا۔ نجانے وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اپنی لخت جگر کو اس بدبخت سفاک درندے کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا اور خود کہیں تاریکیوں میں گم ہوگئے تھے یا پھر کون جانے کہ ماضی کیا تھا حالات کیا تھے۔ میری ماں اس خوفناک شخص کی بیوی کیسے بنی۔ مجھے یہ ساری باتیں نہ کسی نے بتائیں نہ مجھے کبھی معلوم ہوئیں۔ بس جب میں نے ہوش سنبھال کر دیکھا تو ماں کہتی تھی کہ وہ کٹے ہاتھ والا تیرا باپ ہے۔ اس کا ہاتھ مشین میں آکر کٹ گیا

تھا اور اس دن سے اس نے اپنی زندگی کے معمولات ترک کردیئے تھے اور دوسری چیزوں کی جانب توجہ دینے لگا تھا جن میں شراب' جوا' اور نجانے کیا کیا تھا۔ لیکن شاید شراب اور جوئے کا مسئلہ کچھ پریشان کن تھا کیوں کہ اس کے بعد میرے گھر میں نئے نئے مہمان آنے لگے تھے اور جب بھی شام ہوتی میری ماں اپنے آپ کو لیپ پوت کر بند کرلیتی اور اس کے بعد مجھے معمول کے مطابق دالان کی چارپائی پر سلا دیا جاتا۔ میرا باپ مجید خان برابر کے کمرے میں کسی اجنبی شخص کے ساتھ ہوتی جس میں دن میں اس کی پٹائی کی جاتی تھی' اور اسے تربیت دی جاتی تھی۔ پھر صبح ہوتی' مہمان نہ ہوتا ماں ہوتی' باورچی خانہ ہوتا۔ ناشتا ملتا اور اس کے بعد زندگی وہی رنگ اختیار کرلیتی جو دن بھر کے رنگ ہوا کرتے تھے۔ مجید خان اپنے اس کمرے میں لیٹا خراٹے بکھیرتا رہتا۔ بھیانک ہولناک خراٹے' جو اس وقت بھی برابر والے کمرے سے اٹھ رہے تھے۔ یہ تھا میرا ماضی یہ تھی میری کہانی' اس کے بعد کہانی میں کچھ نئے رنگ پیدا ہوئے میں کچھ اور بڑی ہوگئی۔ واقعات و حالات میری سمجھ میں آنے لگے۔ ماں کی خاموش زبان بہت کچھ بتانے لگی۔ اور میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہونے لگیں۔ پڑوس کی بشیرن خالہ نے کہا۔

"کمبخت تو بھاگ جا' کہیں تو بھاگ جا۔ تیری ماں تو موت کے قریب ہے لیکن تو تو بے موت ماری جائے گی۔ بھاگ جا یہاں سے کسی بھی جگہ بھاگ جا۔ کسی گھر میں پناہ لے لے یہ گھر تیرے لئے ایک بدترین عذاب گاہ ثابت ہوگا۔" بشیرن خالہ کا چہرہ دیکھتی رہ جاتی تھی میں۔ بھلا کیسی بے تکی بات ہے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہاں بھاگ جاؤں؟ یہاں میری ماں ہے' میرے ابا ہیں جو جیسے بھی ہیں لیکن بہرطور میں انہیں ابا کہتی ہوں۔ جب کہ انہوں نے مجھے کبھی کسی نام سے نہیں پکارا۔ جھڑکیاں' گھڑکیاں اور بس۔ یہی میری زندگی تھی۔ گھر کے کام کاج اب میں کرنے لگی تھی۔ کیوں کہ ماں کو کھانسی کے دورے پڑتے تھے۔ البتہ شام کو یہ کھانسی نجانے کیسے غائب ہوجاتی تھی۔ اس وقت وہ بالکل نہیں کھانستی تھی۔ اور اس کا چہرہ بھی اتنا ہی اچھا لگنے لگتا تھا جتنا پہلے لگتا تھا۔ لیکن ایک دوپہر وہ اس زور سے کھانسی کہ اس کے بعد اس کی کھانسی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ پھر پڑوسی جمع ہوئے ماں کو ہار پھول پہنائے گئے اور نہلا دھلا کر نجانے کہاں پہنچا دیا گیا۔ شاید قبرستان۔

پھر ماں دوبارہ واپس نہیں آئی اور مجھے علم ہوگیا کہ وہ مرچکی ہے۔ اب اتنی نادان بھی نہیں تھی۔ کسی کو مرتے ہوئے تو نہیں دیکھا تھا لیکن اتنا جانتی تھی کہ جب جنازے نکلتے ہیں تو جانے والے پھر واپس نہیں آتے۔ اور میری ماں بھی اسی شکل میں وہاں سے گئی تھی۔ جس کا مقصد ہے کہ وہ واپس نہیں آئے گی۔ میں کئی دن تک روتی رہی اور مجید خان نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔ لیکن اس کے بعد مجید خان کو میرے رونے پر غصہ آنے لگا اور وہ بھی مجھے ڈانٹنے لگا۔

"ہر وقت بھوں بھوں کرتی رہتی ہے۔ میں کہتا ہوں تو بھی ماں کے ساتھ ہی قبر میں دفن کیوں نہیں ہوگئی۔ کیا کروں گا میں اب تیرا' بول بتا کیا کروں گا؟" اور اسی وقت مجید خان کا ایک دوست اندر گھس آیا۔ ہمارے گھر کے دروازے مجید خان کے دوستوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے ان دروازہ پر کبھی کوئی دستک دے کر نہیں آتا تھا۔ مجید خان اتنا ہی فراخ دل انسان تھا۔ اس دوست نے ہنستے ہوئے مجید خان کے کان میں کچھ کہا اور مجید خان چونک کر پہلے اپنے دوست کو پھر مجھے دیکھنے لگا پھر شیطانی انداز میں ہنس پڑا۔

"ابے ہاں ٹھیک ہی تو کہتا ہے تو۔ واقعی۔ واقعی کمال کرتا ہے یار۔ میں نے تو اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔" اور نجانے کیا بات کہی تھی مجید خان کے دوست نے اس کے کان میں کہا مجید خان کا رویہ میرے ساتھ بالکل ہی تبدیل ہوگیا۔ میرے لئے اب نئے نئے کپڑے بھی آنے لگے۔ خوراک کا بھی بہتر بندوبست ہونے لگا اور میرے ساتھ سختیاں بھی کم ہونے لگیں۔ شاید میرے باپ کو یہ بتایا گیا تھا کہ میں اس کی بیٹی ہوں اور وہ میرا باپ ہے۔ باورچی خانے کا کام مجھے اب بھی کرنا پڑتا تھا۔ مجید خان کے گھر کے رنگ و ڈھنگ وہی تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کے کمرے میں جوئے کا اڈہ جما رہتا تھا۔ وہ عموماً نشے میں رہتا تھا اور اس کے دوست گھر میں رنگ رلیاں مناتے تھے۔ لیکن محلے والوں کو یہ بات پسند نہیں آئی اور ایک دن پورا مجمع لگ گیا ہمارے گھر کے سامنے۔ مجید خان کو برا بھلا کہا گیا۔ مجید خان نے اپنی پرانی بندوق نکال لی اور لوگوں کو دھمکیاں دیں اور اس کے بعد بات پولیس تک پہنچ گئی۔ چنانچہ کسی صاحب اختیار نے ہم لوگوں کو وہاں سے بے گھر کردیا اور مجید خان کو وہ گھر چھوڑ کر ایک اور محلے میں آنا پڑا۔ نیا محلہ بھی برا نہیں تھا۔ یہاں اچھے

لوگ رہتے تھے۔ لیکن اچھے لوگوں میں مجید خان جیسے لوگوں کا گزر نہیں ہو سکتا تھا۔ دو چار مہینے ہی گزرے تھے کہ یہاں بھی وہی کیفیت ہوگئی۔ لوگ مجید خان کے خلاف ہوگئے۔ انہیں اس گھر میں جواء ہونے پر اعتراض تھا۔ یہاں بری عورتیں بھی آیا کرتی تھیں اور لوگوں نے یہاں پھر ویسا ہی مجمع لگا لیا۔ میں نے دل میں سوچا نجانے کیسے لوگ ہیں یہ کسی کو کہیں رہنے ہی نہیں دیتے۔ بھلا اور بھی تو سب رہتے ہیں نجانے کیوں یہ ہم لوگوں کے دشمن ہوگئے ہیں۔ یہاں مجید خان نے اپنی بندوق نہیں نکالی تھی۔ کیوں کہ بندوق شاید اس سے چھین لی گئی تھی۔ تاہم اسے یہ گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ وہ بہت بددل ہوگیا تھا۔ اس بار اس نے ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کیا تھا۔ اس کے اتنے دوست ضرور موجود تھے جو اس کی اس قسم کی مدد کردیا کرتے تھے۔ فلیٹ میں ہم نے البتہ کافی وقت گزارا اور یہاں ہمیں کوئی مشکل نہیں پیش آئی۔ مجید خان اکثر مجھے دیکھ کر کہتا تھا کہ کمبخت تو کب اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئی اور میں حیران ہو کر اپنے پیروں کو دیکھنے لگتی تھی۔ کھڑی تو میں اپنے پیروں پر ہی ہوں۔ مگر نجانے کیوں مجید خان یہ بات کہتا ہے۔ "میں اپنے پیروں پر ہی تو کھڑی ہوں۔" میں نے ایک بار مجید خان کو اس کا جواب بھی دے دیا تو وہ میری بات سن کر ہنس پڑا۔

"گدھی ہے تو۔ بیوقوف ہے۔ تو دیکھنا ایک دن' ایک دن تیرا مستقبل کیا سے کیا ہوجائے گا۔ میں اس کی پیشگوئی کردیتا ہوں۔" اور میں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگتی۔ نجانے میرا مستقبل کیا سے کیا ہوجائے گا۔ مجید خان کے جوئے کا اڈہ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ وہ جوئے کے پیسوں میں سے نال نکالتا تھا اور اسی سے اس کا کاروبار چلتا تھا۔ اکثر مجھ سے کہتی تھیں "بھاگ جا منحوس تیرا باپ تجھے بیچ دے گا۔ تیرا باپ تجھے برباد کردے گا۔" میرے باپ نے ابھی تک مجھے برباد نہیں کیا تھا۔ لیکن پھر ایک دن میری زندگی میں انوکھے دن کی حیثیت سے آیا۔ اور یہ انوکھا دن مجھے نجانے کتنے آنسو دے گیا۔ میں بڑی پریشان رہی۔ بہت پریشان رہی کوئی شناسا نہیں تھا۔ کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ ایسے موقع پر باپ ہی کام آیا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں مسرور کن کیفیت دیکھ کر مجھے تعجب ہوا تھا۔ وہ شخص' وہ شخص میری پریشانی سے خوش ہو رہا تھا لیکن اس کی خوشی کی وجہ بہت بعد

میں میرے علم میں آئی۔ آہ نادانیاں بھی کیا چیز ہوتی ہیں۔ میرا باپ مجید خان مجھ پر مہربان ہوتا چلا گیا۔ اس کی مہربانیاں میرے لئے تعجب خیز تھیں۔ چونکہ میں اس کا سلوک اپنی ماں کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔ اور پھر اس کی ان مہربانیوں نے مجھے خوف زدہ کرنا شروع کر دیا۔ نجانے کیوں' نجانے کیوں یہ سب نجانے کیوں ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ لیکن اس کے حل کے سلسلے میں مجھے زیادہ وقت نہ صرف کرنا پڑا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مجھ سے ناشاد بابو کی ملاقات کرائی گئی۔ ناشاد بابو کسی فرم میں اچھی حیثیت سے ملازمت کرتے تھے۔ اچھا لباس پہنتے تھے۔ مجید خان نے مجھے ان سے ملاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے شہزادی۔"

"بلاشبہ اس میں شک کی کیا بات ہے۔ مگر یہ شہزادی تمہارے گھر کہاں سے آ گئی مجید خان؟..."

"بس ناشاد بابو۔ اللہ کی دین ہے۔"

"خوب دیتا ہے اللہ بھی کسی کسی کو۔" ناشاد بانو نے مجھے میلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ مجید خان بولا۔

"ناشاد بابو بہت اچھے ہیں۔ ان کے پاس بہت خوبصورت گاڑی ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ تمہیں سیرو سیاحت کرائی جائے۔ دنیا دکھائی جائے۔" میں نے بے چین ہو کر مجید خان کو دیکھا تو وہ بولا۔

"اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جاؤ کپڑے پہن لو۔ اور ناشاد بابو کے ساتھ چلی جاؤ۔" یہ آخری لہجہ تھا او اس آخری لہجے کے بعد جو کچھ ہو سکتا تھا اسے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ گو یہ میرے ساتھ تو نہیں ہوا تھا لیکن ماں کے ساتھ جب یہ لہجہ استعمال ہوتا تھا تو اس کے بعد ماں مجید خان کے ساتھ کمرے میں بند ہو جاتی تھی اور پھر اس کے چیخنے چلانے کی دلدوز آوازوں کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ لیکن ناشاد بابو کے ساتھ جانا پڑا۔ اور کچھ دیر کے بعد ہی میں مطمئن ہو گئی۔ کیوں کہ ناشاد بابو تو بہت اچھے انسان تھے۔ بڑی عمدہ گفتگو کرتے تھے۔ بار بار حیران ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے دنیا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ انہوں نے مجھے دنیا دکھائی' بہترین

لباس خریدے میرے لئے اور میں ان کی شکر گزار ہو گئی۔ اس دنیا میں ایسے ایسے بے غرض لوگ بھی ہیں جو دوستوں کی بیٹیوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ لیکن جب انہوں نے میرے ساتھ دوسرے قسم کا سلوک کیا اور اس میں' میں نے اپنے باپ کی مرضی بھی پائی تو دنیا میری نگاہوں میں تاریک ہو گئی۔ میں حقیقتوں کو نہیں جانتی تھی۔ لیکن وقت نجانے کون کون سی حقیقتیں بتا دیتا ہے اور مجھے اپنی حقیقت بھی معلوم ہو گئی۔ ناشاد بابو کافی عرصے ہمارے ہاں آتے رہے اور اس کے بعد غلام علی آ گیا۔ یہ غلام علی ایک غنڈہ آدمی تھا اور اس کے بل پر نجانے کتنے غنڈے پل رہے تھے۔ بھلا میں اس کی منظور نظر ہو جاتی تو پھر کس کی مجال تھی۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ مجید خان کو اس کی ضرورت کی ہر چیز غلام علی کی طرف سے مہیا ہو جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے غلام علی میری پوری زندگی کا مالک بن گیا ہے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ تقدیر نے ایک بار پھر ساتھ دیا۔ غلام علی کسی جھگڑے میں چاقو لگنے سے مارا گیا اور اس کے بعد اس کے آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ہاں اس کی جگہ زاہد نے لے لی۔ زاہد کے بعد ماجد اور پھر نجانے کون کون۔ میں اب اس دنیا کی عادی ہونے لگی تھی۔ لیکن دل میں زخمی پرندوں جیسی پھڑپھڑاہٹ ہمیشہ پیدا ہوتی رہتی تھی۔ پھر جمال آیا شوخ و شنگ رنگوں میں زندگی ڈالنے والا جمال۔ وہ مصور تھا۔ لیکن بہت ہی بری طبیعت کا مالک۔ ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ جس کی نگاہوں میں رنگ و جمال بکھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا....

"آہ تم یہاں رہتی ہو۔ اس بوسیدہ فلیٹ میں جس کی دیواروں پر پلاستر بھی نہیں ہے۔ جس میں زندگی موجود نہیں ہے۔ تم شہزادی ہو تمہارے لئے تو ایک محل ہونا چاہیے تھا۔ یہ محل چھوڑ کر اس دنیا میں کیوں آ گئیں۔ اونچی اونچی دیواریں جس میں پلاسٹک املشن پینٹ ہوا ہو اور ایئر کنڈیشنڈ لگا ہوا ہو ملحقہ باتھ روم اور زمین پر بچھا ہوا قیمتی قالین۔" جمال نے جو تصویر کھینچی وہ میری نگاہوں میں بس گئی اور پھر وہی تصویر میری زندگی کا سب سے انوکھا خواب بن گئی۔ میں جاگتی آنکھوں سے زندگی کے خواب دیکھنے لگی۔ اس زندگی میں میری لئے ایک شہزادہ بھی تھا۔ کیوں کہ میری عمر ابھی شہزادی کی حد سے نہیں گزری تھی۔ وقت سے بہت پہلے مجھے زندگی سے روشناس کرا دیا گیا تھا۔ لیکن دل

کی جو مانگ تھی وہ جوں کی توں میرے وجود میں موجود تھی۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ یہ مانگ شدت اختیار کرتی چلی گئی اور اس مانگ میں میری اپنی پسند کا ایک نوجوان موجود ہوتا تھا۔ کبھی احمر کبھی شلو اور کبھی عدیل۔ نجانے کون کون۔ سارے پسندیدہ نام میں نے اپنا لئے تھے۔ اور یہ نام ایک ہی شکل میں میرے ذہن میں تازہ ہوجاتے تھے۔ شکل بھی میری تراشی ہوئی تھی اور کبھی کبھی اس میں زلزلہ سا پیدا ہو جاتا تھا۔ بہریں پڑنے لگتی تھیں۔ لیکن بالاخر یہ شکل میری نگاہوں میں سماتی چلی گئی تھی اور اس شکل میں میں اپنے شہزادہ کی منتظر رہی۔ لیکن یہ بات ہوش و حواس کے عالم میں آنے کے بعد اچھی طرح میرے ذہن میں آجاتی کہ صرف یہ خواب ہی میری زندگی ہیں۔ خواب سے آگے کوئی دنیا نہیں ہے۔ وہ محل وہ ایئرکنڈیشنڈ کمرہ اور اس کی بلندی پر چمکتا ہوا خوبصورت چھوٹا سا روشندان جس سے آنے والی ننھی سے سورج کی کرن میری پلکوں کے پپوٹے کو گدگدا کر مجھے جگا دیتی تھی اور اس وقت وہ شہزادہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا تھا۔ بلند و بالا دیواریں چھوٹے سے کمرے کی بدنما دیواروں میں تبدیل ہوجاتی تھیں۔ اور کھڑکی کے دوسری جانب زندگی سسکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

آہ اس زندگی میں بالاخر تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور وہ جو کہنے والے کہتے ہیں کہ وقت اپنی کہانی خود دہراتا ہے چنانچہ میری کہانی کا یہ انداز تبدیل ہوا۔ اور کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جنہوں نے مجھے زندگی کے کئی رموز سے آشنا کیا۔ بدکار مجید خان نشے کا عادی ہونے کی وجہ سے اب اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ بندوق اپنے ہاتھوں سے اٹھا سکے۔ لیکن نشے کے عالم میں وہ یہ کام سرانجام دے گیا۔ اس نے بندوق اٹھائی اور زندگی میں پہلی بار کسی پر گولی چلا دی۔ یہ جوئے میں ہارنے والا ایک ایسا شخص تھا جو مجید خان سے اپنی رقم کی واپسی کے لئے جھگڑا کر رہا تھا۔ مجید خان کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ مجید خان گرفتار ہوگیا۔ اس پر مقدمہ چلا۔ پیروی کرنے والا کوئی نہیں تھا مقدمہ مکمل طور پر اس کے خلاف تھا۔ چشم دید گواہوں میں بہت سے لوگ تھے جن میں مجھے بھی شامل کیا گیا تھا۔ میں ان تمام چیزوں سے ناآشنا تھی جو حقیقت تھی وہ میں نے کٹہرہ عدالت میں بیان کردی اور مجید خان کو عمر قید کی سزا ہوگئی۔ کمبخت کی عمر بھی کتنی تھی وہ اپنی اس قید کو بھگتنے کے لئے جیل چلا گیا اور مجھے

اس فلیٹ میں بے سہارا چھوڑ دیا۔ عمر قید تو مجھے بھی برداشت کرنی پڑ رہی تھی۔ لیکن فرق تھا۔ میں اپنے اس قید خانے سے فرار ہو سکتی تھی جس میں نت نئے لوگ آکر جھانکتے تھے۔ مجھ سے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے اور مجھے نجانے کون کون سے راستے دکھاتے تھے۔ ان میں میرے شناسا بھی تھے اور اجنبی لوگ بھی ہوا کرتے تھے۔ محلے والوں کو جب مجید خان کے عذاب سے چھٹکارا ملا تو انہوں نے مجھ سے بھی چھٹکارا پالینے کے بارے میں سوچا۔ میں تو خود اس قید سے پیچھا چھڑا رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر وہی محل جاگ اٹھے۔ اگر اس قید خانے سے رہائی مل جائے تو شاید محل کا کوئی راستہ مجھے نظر آجائے۔ ایک گھر ایک چھوٹا سا گھر جس کی دیواریں بے شک محل کی دیواروں کی مانند بلند و بالا نہ ہوں لیکن جہاں سکون ہو۔ ایک انسان ہو ایک ایسا انسان جو زندگی کو سہارا دے سکے۔ آرزو تھی یہ لیکن مجھ جیسے لڑکی کے لئے نہیں۔ میں نے تو زندگی کی تمام برائیاں اپنا لیں تھیں، حالانکہ حق گواہ ہے کہ ان برائیوں میں سے ایک بھی برائی ایسی نہیں تھی جس سے خود میں آشنا ہوتی بس ایک دور تھا جو کسی کے پنجہ ستم میں گزر رہا تھا اور میں اس دور میں گزارا کر رہی تھی۔ کیا کروں' کیا کرنا چاہیے میں لوگوں کی عجیب و غریب باتیں سن رہی تھی' انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنے والے آتے تھے اور مجھے ورغلانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن مجید خان کی موت کے بعد ایسا کوئی نہیں تھا جو مجھے مار پیٹ کر اس مصیبت میں گرفتار ہونے پر مجبور کر دیتا۔ حل یہی نکلا کہ خاموشی سے یہ جگہ چھوڑ دوں۔ جہاں بھی موقع ملے نکل جاؤں کہیں بھی کسی بھی جگہ اس دنیا سے دور کسی ایسی دنیا میں جہاں میرا کوئی جاننے والا نہ ہو۔ جہاں لوگ مجھے اجنبی سمجھیں۔ عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اور یہ تصور میرے لئے بڑا فرحت بخش تھا جب مجھے کوئی جانتا ہی نہ ہوگا تو پھر بے عزتی کی نگاہ سے کیسے دیکھے گا۔ آہ مجھے بھی ایک نئی زندگی ملے گی۔ اور کچھ نہیں تو پھر کم از کم لوگوں کی نگاہوں میں میرے لئے پاکیزگی تو ہوگی۔ اور میں اس پاکیزگی کی تلاش میں چل پڑی۔ جو معلومات مجھے اب تک حاصل ہوئیں ان کے تحت میں اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں بیٹھ گئی۔ اور جب ٹکٹ بنانے والا میرے پاس آیا تو میں نے اس کی طلب کردہ رقم اسے دے دی اور وہ ٹکٹ بنا کر میرے

ہاتھ میں دے گیا۔ طرح طرح کے لوگ تھے میں اکیلی تھی۔ خوف محسوس ہو رہا تھا۔ بہت
سی نگاہیں مجھے اپنی جانب نگراں محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ میرے
بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں ان سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔ عورتیں
تھیں لیکن کوئی عورت میری جانب متوجہ نہیں تھی۔ جیسے جیسے یہ سب میرے بارے میں
جانتے ہوں۔ جیسے انہیں علم ہو کہ میں ایک بری لڑکی ہوں۔ ہاں وہ سب شاید میرے آشنا
تھے۔ یا پھر انہیں کسی نے یہ بات بتا دی تھی۔ کافی دیر تک یہ سفر جاری رہا۔ میں خوفزدہ
بیٹھی رہی۔ میرا دل الٹ رہا تھا جی چاہ رہا تھا کہ ٹرین کے ڈبے سے باہر چھلانگ لگا دوں۔
نجانے کیوں مجھ پر یہ خوف طاری ہو گیا تھا کہ یہاں بھی مجھے جاننے والے موجود ہیں اور یہ
ٹرین' یہ ٹرین نجانے مجھے کہاں لے جائے گی۔ اور اس کے بعد جب میں وہاں پہنچوں گی تو
نجانے کیا ہو چکا ہوگا۔ شام کے جھٹپٹے فضاؤں میں اترتے آ رہے تھے۔ ایک غیر معروف سا
اسٹیشن تھا۔ جس کا میں نام بھی نہیں پڑھ سکی تھی۔ ٹرین یہاں کافی دیر کے لئے رکی اور میں
ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاں مجھے اب ٹرین کے اس ڈبے میں نہیں رہنا چاہیے۔ ورنہ
یہ لوگ' ورنہ یہ لوگ میرے بارے میں طرح طرح کے منصوبے بنا رہے ہیں نجانے
میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ لرزتے قدموں سے میں ریل کے اسٹیشن پر اتر گئی۔ اجنبی
جگہ پراسرار ماحول چاروں طرف سنسان خاموشی طاری تھی۔ غالباً عشا کا وقت ہو گیا تھا۔
اذان کی آواز کانوں میں گونجی اور میں آہستہ آہستہ ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل آئی۔ بہت
چھوٹی سی آبادی تھی۔ کچے پکے مکانات چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ دھندلے میں
بہت زیادہ صاف چیزیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ جگہ جگہ مدہم روشنیاں ہو رہی تھیں لیکن
اذان کی یہ آواز مجھے سہارا دے رہی تھی اور نجانے کیوں میرے قدم ایک سمت بڑھتے
چلے جا رہے تھے۔ پھر ایک جگہ درخت کا سایہ نظر آیا تو میں وہاں ستانے کے لئے بیٹھ
گئی۔ بے یارو مددگار آنکھوں میں آنسو' دل میں نجانے کیسے کیسے وسوسے۔ اب کیا
ہوگا رات ہو گئی ہے۔ رات کیا اس درخت کے نیچے گزاری جا سکتی ہے۔ سامنے ہی سے
بہت سے لوگ نظر آ رہے تھے میں نے غور سے دیکھا مسجد کا دروازہ تھا۔ نمازی نماز پڑھ کر
واپس جا رہے تھے۔ اور اس کے بعد خاموشی پھیل گئی تھی۔ تمام آوازیں گم ہو گئیں سوائے

کتے کے بھونکنے کی آوازوں کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں سہمے ہوئے
انداز میں مسجد کے دروازے پر پہنچی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر روشنی نظر آ رہی تھی۔
سیڑھیوں پر پہنچنے کے بعد میں رکی اور اسی وقت مجھے ایک آہٹ سنائی دی۔ ایک باریش
شخص ایک سمت سے نکل کر میری طرف آ رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد وہ میرے قریب پہنچ
گیا۔ اور مجھے بغور دیکھنے لگا۔ میں پوری جان سے لرز رہی تھی۔ اس شخص نے کہا۔
"کہاں سے آئی ہو بیٹی۔ مسافر ہو؟ اس بستی کی ہو۔ کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟
" اس کے لہجے میں جو نرمی اور جو ہمدردی تھی اور اس نے جو لفظ میرے لئے استعمال کیا
تھا اس سے ڈھارس بندھی اور میری سسکیاں جاری ہو گئیں۔ میں ایسی بے اختیار ہو کر
روئی کہ وہ شخص بے چین ہو گیا۔ میرے قریب آیا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
"میرا نام نیاز اللہ ہے۔ یہیں مسجد کے حجرے میں رہتا ہوں۔ اگر تم مناسب سمجھو
بیٹی تو میرے ساتھ حجرے میں آجاؤ۔ اطمینان رکھو یہ خدا کا گھر ہے۔ یہاں کسی کو تکلیف
نہیں دی جا سکتی۔ آؤ میرے ساتھ آجاؤ۔ مجھ پر اعتماد کرو۔" میں اپنی چھوٹی سی پوٹلی اٹھائے
اندر داخل ہو گئی۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ضروریات زندگی کی چیزیں نظر آ رہی
تھیں۔ معزز بزرگ نیاز علی نے مجھے بیٹھنے کی پیشکش کی اور پھر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے
بولے۔

"کہیں سے آئی ہو۔ گرد آلود لباس' الجھے ہوئے بال اور خوفزدہ حلیہ یہی بتاتا ہے۔
کیا گھر سے بھاگ کر آئی ہو کسی ستم کا شکار ہو؟" میری ہچکیاں ایک بار پھر جاری ہو گئیں۔
نیاز علی اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔
"دیکھو بیٹی اللہ تعالیٰ کا گھر ہے یہ۔ یہاں اس سے پناہ مانگو۔ تمہیں ہر طرح کی پناہ
ملے گی سکون ملے گا۔ جو کچھ بیت چکی ہے وہ مجھے بتا دینا دل ہلکا ہو جائے گا۔ نماز پڑھتی
ہو۔؟" اس نے سوال کیا اور میں نے نفی میں گردن ہلادی۔
"خیر بری بات ہے۔ نماز پڑھنی چاہیے۔ کل سے نماز کا آغاز کردو۔ غسل کر لینا اور
سنو اگر اپنے بارے میں کوئی بات نہ بتانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن جو کچھ
بھی ہے اگر تم بے سہارا ہو تو یہاں تمہیں بھرپور پناہ ملے گی۔ مجھے اپنے باپ کی مانند سمجھو

اور اطمینان رکھو میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں یہاں بے شک تنہا رہتا ہوں لیکن باپ بیٹی کہیں اور کسی بھی جگہ رہ سکتے ہیں۔ لوگ اگر مجھ سے پوچھیں گے کہ یہ لڑکی کون ہے تو میں انہیں بتادوں گا کہ میری بھتیجی ہے۔ دوسرے شہر سے آئی ہے۔ اور میرے بھائی کا انتقال ہوچکا ہے۔" میں نیاز اللہ کی بات پر غور کرنے لگی۔ یہ عجیب دنیا تھی عجیب لوگ تھے۔ بہر طور میرے لئے ایک سہارا اس وقت نہایت ضروری تھا پوری دنیا میری نگاہوں میں تاریک تھی۔ چنانچہ میں نے نیاز اللہ صاحب کی یہ پیشکش قبول کرلی۔ اپنے آنسو خشک کئے منہ ہاتھ دھویا۔ نیاز اللہ صاحب نے میرے سامنے کھانا رکھا تو میں نے خاموشی سے کھانا کھالیا اور اس کے بعد انہوں نے کہا۔

"دیکھو میں یہاں یہ پردہ ڈالے دیتا ہوں۔ پردہ کے دوسری جانب تم رہو گی اور اس طرف میں۔ ویسے تو باپ بیٹی کا رشتہ مقدس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتی۔ لیکن بہر طور تم ابھی اجنبی ہو۔ یہاں کے ماحول کو سمجھ لوگی اور مکمل اعتماد مجھ پر کرلوگی۔ لیکن سنو بیٹی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ وقت کی' زمانے کی ضرورت ہے۔ مجھے چچا جان کہہ کر پکارا کرو۔ اور اگر کبھی کوئی خاتون یہاں آجائیں اور تم سے یہ پوچھنے کی کوشش کریں کہ تم کون ہو تو انہیں یہی بتانا کہ نیاز اللہ کی بھتیجی ہوں۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے آنسو بھری آواز میں اپنا نام شہزادی بتایا تو نیاز اللہ چچا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یقیناً تم شہزادی ہی معلوم ہوتی ہو۔ بیٹی جو کچھ بھی دل پر بیتی ہے بس اپنے تمام دکھ خدا کے حوالے کردو۔ اگر کوئی ایسی مشکل درپیش ہو جو مجھے بتانا ممکن ہو تو ضرور بتا دینا بساط بھر اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"میری اور کوئی مشکل نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں بے سہارا ہوں۔"

"خدا سب کا سہارا ہوتا ہے اطمینان رکھو۔ مکمل اطمینان رکھو۔" نیاز اللہ کے الفاظ ایسے ڈھارس آمیز تھے کہ میرے دل کو ایک دیوار کا احساس ہونے لگا۔ پردے کی دوسری جانب میں بستر میں لیٹ گئی اور ماضی کی تلخیوں میں گم ہوگئی۔ دوسری صبح میں نے نیاز اللہ صاحب کی ہدایت کے مطابق نماز کا آغاز کیا۔ فجر کی نماز میں نے اس حجرے میں پڑھی تھی۔ پھر دو بجے کے قریب کچھ عورتیں آئیں اور انہوں نے مجھ سے ملاقات کی۔ میں نے نیاز

اللہ چچا کی ہدایت کے مطابق انہیں یہی بتایا کہ میں نیاز اللہ کی بھتیجی ہوں۔ اور میرے والدین کا انتقال ہوچکا ہے۔ جس کی بنا پر میں نیاز اللہ صاحب کے پاس آگئی ہوں۔ بہت اچھی عورتیں تھیں۔ بڑی محبت سے پیش آئیں مجھ سے اور جب یہ دن گزر گیا تو دوسری رات میری لئے انتہائی سکون بخش تھی۔ مجھے کم از کم یہ احساس ہوگیا تھا کہ میں ایک اچھی پناہ گاہ میں آگئی ہوں اور خدا کے گھر سے بہتر پناہ گاہ اور کون سی ہوسکتی ہے۔ نیاز اللہ کی مہربانیاں مجھ پر بے پناہ تھیں۔ بلاشبہ انہوں نے مجھے بیٹی ہی کا درجہ دیا تھا اور اب جب کہ زندگی کے کچھ دوسرے امور بھی مجھ پر کھلے تو میں نے اپنی کیفیت کو محسوس کیا۔ آہ کس قدر پسماندہ تھی میں' کتنی حقیر تھی ان گھریلو عورتوں کے سامنے جو اپنے اپنے گھروں میں بہتر اور پاکیزہ زندگی گزارتی ہیں۔ کیا کیا غلاظتیں نہ لتھڑی ہوئی تھیں مجھ میں۔ میں ان غلاظتوں کے تصور سے کانپ جاتی تھی۔ مجھے اپنے بدن سے تعفن اٹھتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور میں زندگی کو بہت ہی عجیب انداز میں محسوس کرتی تھی۔ حجرے کی ان چھوٹی چھوٹی دیواروں میں مجھے اپنی بے کسی تڑپتی ہوئی نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میں ایک مقدس جگہ آگئی ہوں۔ جبکہ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ بہت عرصہ گزر گیا۔ بہت سی شناسا خواتین میرے پاس آنے لگیں۔ وہ مجھے پسند کرتی تھی۔ میری نیکیوں کی قائل تھیں۔ میری فطرت سے محبت کرنے لگی تھیں۔ لیکن آہ وہ میرے اندر کی گہرائیوں کو نہیں جانتی تھیں۔ میرے دل میں جو کچھ تڑپ رہا تھا وہ اس سے ناواقف تھیں۔ نیاز اللہ ایک دن میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے کہنے لگے۔

"بیٹی تمہارا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے میرا مطلب ہے اللہ کے سوا؟...."

"ہاں نیاز چچا میرا اب کوئی بھی نہیں ہے اس دنیا میں ...."

"نجانے کیوں دل چاہتا ہے کہ تمہارے بارے میں کچھ معلومات حاصل کروں۔ معاف کرنا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ یہ بات تم سے کبھی نہیں پوچھوں گا لیکن کچھ خیالات میرے ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں اور ان کی بنا پر میں تم سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔ تاہم بالکل یہ نہ سمجھنا کہ تم ان کا جواب دینے کی پابند ہو۔ بس یونہی برسبیل تذکرہ میں نے کہہ دیا۔" میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ تو نیاز اللہ بے چین

ہو گئے۔

"بیٹی معاف کر دو۔ خدا کے لئے معاف کر دو۔ میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔"

"نہیں نیاز چچا میں تو خود بے چین ہوں۔ میں تو خود اپنے اس ناپاک وجود کو آپ کے سامنے پیش کر دینا چاہتی ہوں تاکہ آپ میری حقیقت سے واقف ہو جائیں ---"

"نہیں بیٹی میں کبھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گا کہ تم سے کوئی برائی ہوئی ہے۔ بتاؤ کیا کہانی ہے تمہاری زندگی کی۔ کیا کہانی ہے۔ اور میں نے شروع سے لے کر آخر تک نیاز اللہ کو اپنی زندگی کی پوری داستان حیات سنا دی۔

انہیں ساری حقیقتیں بتا دیں۔ وہ سنگین چہرہ لئے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور میں اپنی یہ کہانی سناتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ حقیقت بتا دینے سے میرا دل تو ہلکا ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہو گا وہ سمجھ لینا مشکل کام نہیں ہے۔ مسجد جیسی پاک جگہ پر مجھ جیسے ناپاک وجود کا گزارا ممکن نہیں ہے۔ میں نے دیکھا کہ نیاز اللہ چچا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ انہوں نے میرے سر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خدا گواہ ہے۔ میری ناقص عقل جو کہتی ہے وہ یہ ہے کہ تم بالکل پاکیزہ اور بے گناہ ہو۔ تمہارا اس زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہے جو تم گزار چکی ہو۔ بلکہ صحیح معنوں میں تم میری نگاہوں میں مزید باعزت ہو گئی ہو۔ بیٹی گناہ اپنانا بہت آسان کام ہے لیکن گناہ کے راستوں سے نیکیوں کے پر خطر اور پر خار راستوں تک نکل آنا انتہائی مشکل۔ گناہ میں روشنی ہے چمک ہے آسائشیں ہیں۔ لیکن نیکیوں کی منزل ہمیشہ کانٹوں سے بھری ہوتی ہے اور تم نے اسی منزل کا انتخاب کیا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ تمہاری روح میں پاکیزگی ہے۔ میں ایک پاکیزہ روح کی قدر کرتا ہوں۔ کیا تم مجھے اجازت دو گی بیٹی کہ تمہارے لئے ایک بہتر گھر منتخب کر دوں۔ میں تمہیں وہ منزل دے دوں جو تمہاری آرزو رہی ہے۔ اس قابل تو نہیں ہوں لیکن یہ نیکی کر کے خدا کے حضور سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔"

میں نے آنسو بھرے لہجے میں کہا.....

"نیاز چچا اس کائنات میں اب آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔ میرے لئے جو بہتر

سمجھئے کیجئے گا۔ میں کبھی گردن تک نہیں اٹھاؤں گی۔" لیکن میں نیاز چچا کی بات کو سمجھ نہیں سکی۔ انہوں نے جو کچھ شروع کر دیا تھا وہ میرے لئے ناقابل یقین سی بات تھی۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا اپنے بارے میں کہ جو کچھ میں نے چاہا ہے وہ مجھے مل سکتا ہے۔ دنیا کے جتنے نئے نئے رنگ میرے سامنے آئے تھے وہ اجنبی تھے اور یہ ماحول بالکل اجنبی۔ پھر کچھ خواتین مجھے دیکھنے کے لئے آئیں اور مجھ سے طرح طرح کی باتیں کرنے لگیں میں نے سادگی سے انہیں ان کی باتوں کا جواب دیا اور وہ ہنستی ہوئی وہاں چلی گئیں۔ نیاز اللہ کہنے لگے۔

"بیٹی میں نے تمہارے لئے ایک رشتہ منتخب کیا ہے۔ شاکر علی بہت اچھا آدمی ہے۔ زمین دار کے ہاں منشی کا کام کرتا ہے۔ اسی بستی کا بچہ ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے جوان ہوا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ میں نے اسے تمہاری زندگی کے ساتھی کے طور پر منتخب کیا ہے۔ کیا تم اجازت دو گی کہ میں تمہاری شادی اس کے کر دوں؟" میں بھونچکی رہ گئی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے نیاز اللہ چچا کو دیکھتی رہی پھر میں نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا.....

"اس کے باوجود نیاز چچا کہ آپ' آپ میرے بارے میں سب جانتے ہیں؟"

"ہاں اس کے باوجود - اور اس کے ساتھ ساتھ میں تمہیں ایک تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو بیٹی گناہ بعض اوقات مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔ انسان ان کی آرزو نہیں کرتا۔ لیکن مصلحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اپنے ماضی کو مکمل طور پر نظر انداز کر دو۔ خبردار کسی اور کو یہ نہ بتانا میری عزت رکھنا میری لاج رکھنا اب تمہارے ہاتھ ہے۔ بات آگے بڑھا چکا ہوں۔ خبردار اپنی زبان پر قفل لگا لینا۔ شاکر علی کی اتنی خدمت کرنا کہ وہ یہ سمجھے کہ تم فرشتہ ہو اور یقینی طور تم ایسی ہی ہو۔ جو کچھ گزر چکا ہے۔ اسے ایک کہانی ایک خواب سمجھ کر اپنی نئی زندگی کا آغاز بہتر انداز میں کرو۔" نیاز اللہ چچا کی بات پر میں نے گردن جھکا دی تھی۔ لیکن دل میں بے شمار وسوسے ابھرتے رہتے تھے۔ نیاز اللہ چچا کیا کر رہے ہیں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ بہر طور انہوں نے میرے لئے چند جوڑے کپڑے بنائے اور اس کے بعد ایک چھوٹا سا اہتمام کیا اور مجھے رخصت کر دیا گیا۔ اور میں شاکر علی کے گھر آ گئی۔ اونچی

اونچی دیواریں جس پر پلاسٹک پینٹ تھا۔ چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روشندان جس میں
سے سورج کی ننھی سی کرن اندر آتی تو پلکوں کے پوٹے جاگ اٹھتے۔ ملحقہ باتھ روم جس
سے پانی گرنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہاں احمر ہوتا عدیل ہوتا شاد ہوتا۔ لیکن میں نے
اس باتھ روم کے دروازے کو کیلیں ٹھونک کر بند کردیا۔ روشندان سے سورج کی کسی کرن
کو نیچے آنے کی اجازت نہیں دی۔ پلاسٹک امیلشن دیواروں سے کھرچ کر پھینک دیا۔ میرا
گھر میرے گھر کی دیواریں بہت نیچی تھیں۔ بہت چھوٹی چھوٹی دیواریں تھیں یہ لیکن ان
میں میرے لئے محلوں جیسا سکون تھا۔ اور شاکر علی' شاکر علی کو دیکھ کر میری آنکھوں میں
احمر' عدیل اور شاد زندہ ہوگئے تھے۔ یہ ان کی مکمل تصویر تھا۔ تندرست و توانا' درمیانی
شکل و صورت کا مالک' خاموش طبع و بہت ہی نرم طبیعت کا مالک میرے ساتھ بہت اچھے
انداز میں پیش آتا تھا اور مجھے جو زندگی مل گئی تھی اس کے لئے میں خدا کی شکر گزار تھی۔
یقینی طور پر یہ زندگی میری ان آرزوؤں کا پھل تھی جو میں نے کی تھیں۔ فرشتہ
صفت شاکر علی کی اتنی خدمت کی میں نے جتنی مجھے نیاز اللہ نے بتائی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک
اچھا انسان تھا۔ صبح کو وہ اپنی ملازمت پر جاتا۔ اور شام کو واپس آتا۔ میں پورا دن اس کے
گھر کی صفائی کرتی رہتی۔ اس کی لائی ہوئی ایک ایک چیز کو میں نے اتنا چمکا دیا تھا کہ شاکر علی
اسے دیکھ کر مسکرانے لگتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔۔۔۔

"کمال ہے بھئی شہزادی صاحبہ۔ آپ نجانے کہاں تھیں۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ
اگر آپ اس بستی میں نہ آتیں تو میرا کیا ہوتا۔" میری آنکھیں ممنونیت سے چمک جاتیں۔
ایک فرشتے کے منہ سے یہ باتیں سن کر نجانے میری دلی کیفیت کیا ہوتی' میں نے رفتہ رفتہ
اپنے آپ کو بھلانا شروع کردیا تھا۔ نیاز اللہ چچا کی ہدایت بھی تھی۔ یہ بات اچھی طرح جانتی
تھی کہ میرا ایک لفظ میرے اس گھر کو تباہی و بربادی سے دو چار کردے گا۔ چنانچہ اپنے آپ
کو اس سے باز رکھنا ہی میرے لئے سکون بخش تھا۔ حالانکہ شاکر کی محبت دیکھ کر بارہا میرے
دل میں یہ احساس ابھرا کہ اگر میں اسے اپنی حقیقت بتادوں تو یقیناً اس جیسا فرشتہ صفت
انسان اس پر اعتراض نہیں کرے گا۔ بلکہ مولوی نیاز اللہ کی طرح مجھے بے قصور قرار دے
گا۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ مگر شاکر علی سے میں اپنی زندگی کی کہانی کبھی نہ کہہ سکی۔ وقت گزرتا

چلا گیا۔ چھ مہینے سال بھر ابھی تک ہم اولاد کی دولت سے محروم تھے۔ لیکن یہ احساس کبھی
میرے دل میں ابھرا نہ شاکر علی کے دل میں۔ اس نے تو مجھے آسائشیں فراہم کردی تھیں۔
ہمارے گھر بہت سے ملنے جلنے والے آتے رہتے تھے۔ ان میں ملدار چچا کی بیٹی نوری بھی
تھی۔ نوخیز نوجوان' شوخ' ہنس مکھ' جب بھی کبھی گھر میں آتی شوخیاں ہی کرتی رہتی تھی
مجھے یہ لڑکی بہت پسند تھی۔ شاکر علی کو بھی یہ لڑکی بہت پسند تھی۔ وہ اکثر اسے چھیڑتا رہتا
تھا اور نوری چمک دار آنکھوں سے اسے دیکھ کر نجانے کیا کیا الٹی سیدھی بکواس کرتی رہتی
تھی۔ ہم اس کی معصومیت کو نظر انداز کردیا کرتے تھے۔ زندگی کے یہ دن ہنسی خوشی گزر
رہے تھے اور اس میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ اکثر اب میں محلے میں جانے آنے لگی تھی۔
ہم باعزت تھے اور لوگ ہمیں عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ جہاں کہیں کوئی تقریب
ہوتی مجھے ضرور بلایا جاتا۔ پھر مولوی نیاز اللہ کا انتقال ہوگیا۔ اور میں نے ان کا خوب سوگ
منایا۔ درحقیقت وہ میرے لئے اپنوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر ثابت ہوئے تھے۔ جو کام
میرے باپ نے سرانجام نہیں دیا تھا وہ مولوی نیاز اللہ نے کیا تھا۔ اور عورتیں مجھ سے
تعزیت کرنے آتی رہیں۔ اور میں نے باقاعدہ نیاز اللہ چچا کا سوگ منایا۔ وقت کچھ اور آگے
بڑھ گیا۔ شاکر علی میرے لئے فرشتہ صفت تھا۔ اس کی قربت میں' میں زندگی کی ہر پریشانی
سے دور ہوجاتی تھی۔ وہ میرے لئے نجانے کیا حیثیت رکھتا تھا۔ میں اس کا ہر طرح خیال
رکھتی تھی۔ کھانا وقت پر دینا' لباس وقت پر تیار کرنا۔ اس کے جوتے صاف کرنا۔ زندگی کا
ہر وہ کام جو اس کے لئے ممکن ہوسکتا تھا میں پوری سچائیوں اور خلوص کے ساتھ کرتی
تھی۔ اپنے آپ کو میں اس کے سامنے ہمیشہ احساس کمتری کا شکار پاتی۔ میں جب بھی کبھی
اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتی مجھے ایک خوف محسوس ہونے لگتا۔ شاکر علی کو اگر کبھی میرے
بارے میں پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔ اس کے دل کو کتنی ٹھیس پہنچے گی۔ وہ جو مجھے اتنا چاہتا ہے
اس نے مجھے زندگی کی تمام سہولتیں دے دی ہیں۔ میری ویران دنیا پھر سے آباد کردی
ہے۔ کیا سوچے گا میرے بارے میں۔ خدا نہ کرے کبھی ایسا ہو' خدا نہ کرے' خدا نہ
کرے۔ میں خود بھی اپنے ماضی کو بھول جانا چاہتی تھی۔ اور اپنی ہر کوشش سے شاکر علی
کے لئے وہ ماحول مہیا کردینا چاہتی تھی۔ اپنا کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا تھا۔ اور میں

نے تو اسے بالکل ہی مجبور کرکے رکھ دیا تھا۔ گھر سے چلا جاتا۔ جب دل چاہتا واپس آتا۔
لیکن میں اس کا انتظار کرتی رہتی بھلا کبھی کوئی ایسی رات گزری ہو جب وہ آدمی رات کو
گھر واپس آیا ہو اور میں نے اس سے اس بارے میں کوئی پوچھ گچھ کی ہو۔ یا اس کے
انتظار میں جاگتی نہ رہی ہوں۔ وہ اکثر میری ان باتوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگتا تھا۔

ایک دن اس نے کہا۔

"ایک بات کہوں شہزادی۔"

"کہیے۔" میں نے کہا۔

"تم، تم مجھے بہت عجیب سی لگتی ہو۔ بعض اوقات۔" میں سہم گئی۔ میں نے خوف
زدہ نگاہوں سے شاکر کو دیکھا۔ وہ محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا لیکن مجھے اس کے
الفاظ نے خوفزدہ کردیا تھا۔

کیا ہوا۔ کوئی غلطی ہوگئی مجھ سے۔ کیا بات ہے۔۔" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں
کہا۔

"ارے واہ میری فاختہ۔ سچ مچ فاختہ ہی ہو۔ تم فاختہ کی طرح بات بات پر سہم جاتی
ہو۔ میرا کہنے کا مقصد کچھ اور تھا۔"

"کیا؟" میں نے کسی قدر اطمینان سے سوال کیا۔

"دراصل شہزادی میں تمہارے اندر بعض اوقات کچھ عجیب سی کیفیات محسوس کرتا
ہوں۔ مولوی نیاز اللہ کا میں بے حد احترام کرتا تھا۔ انہوں نے مجھے پڑھایا بھی ہے اور پھر
زندگی اتنی تنہا تھی کہ بارہا میں نے اپنے اس گھر کو بسانے کے بارے میں سوچا۔ لیکن کوئی
سرپرست ہی نہیں تھا جو اس جانب توجہ دیتا۔ مولوی نیاز اللہ نے اپنا فرض اس طرح پورا
کیا کہ کوئی باپ بھی اپنا فرض اس طرح پورا نہیں کرتا۔ اس نے مجھے تم جیسی لڑکی دے کر
میری زندگی بنا دی ہے۔ میں، میں تمہارے اندر جو کچھ محسوس کرتا ہوں۔ اس سے میں
عجیب سے احساسات کا شکار ہوجاتا ہوں۔ ہنسنا نہیں تمہارے اندر ماں کی ممتا بھی ہے، بیوی
کا پیار بھی ہے، کبھی کبھی تم اس طرح مجھے بچوں کی طرح سنبھالتی ہو کہ مجھے اپنی ماں یاد
آجاتی ہے اور بیوی کے حیثیت سے تو بس تمہارا جواب ہی نہیں۔" میں خوشی سے ہنس

پڑی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں شاکر۔ تم، تم عظیم ہو۔ دراصل تمہارے اندر جو نیکیاں چھپی ہوئی ہیں۔ وہ
تمہیں ہر چیز کو اسی انداز سے دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ تم بذات خود نیک انسان ہو میں
تمہارے جیسے انسان کے مل جانے پر خدا کا اتنا شکر ادا کرتی ہوں کہ تم یقین نہیں کرسکتے۔
اس نے مجھے زمین پر ہی ایک فرشتہ دے دیا ہے۔"

"چلو حساب برابر ہوگیا۔ بلکہ برابر کیا ہوگیا تم بڑھ گئیں۔ میں نے تو تمہاری تعریف
کرنی چاہی تھی لیکن تم نے مجھے فرشتہ بنا کر زمین سے بہت اونچا اٹھا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں
کہ تم مجھ سے کوئی فرمائش کرو۔ تم نے آج تک مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ میں تمہیں کچھ
دینا چاہتا ہوں لیکن تمہاری پسند کے مطابق۔"

"کیا دو گے۔ مجھے سب کچھ تو تم نے دیا ہے کسی شے کی ضرورت ہوتی تو یقیناً تم
سے کہتی۔" شاکر علی ہنسنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"ایک شے کی ضرورت تو ہم دونوں ہی کو ہے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے اور یقیناً
تمہارا دل بھی چاہتا ہوگا۔"

"کیا چیز؟"

"ایک ننھا سا، خوبصورت سا، کومل سا بچہ۔ جو ہم دونوں کے درمیان آجائے۔ اور
ہماری ساری محبتوں کا مرکز ہو۔" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور میری آنکھیں
جھک گئیں۔

"شرما گئیں نا۔"

"نہیں شاکر تم سے کیا شرماؤں گی۔"

"تو پھر بتاؤ میں نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے نا۔"

"ہاں ہے تو سچ۔"

"تو پھر تمہاری یہ آرزو نہ ہوئی۔"

"ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر اس کے پورا کرنے کا طریقہ کیا ہوگا جناب عالی۔"

"وقت۔ صرف وقت۔ انتظار۔ صرف انتظار۔"

"واہ۔ کیا بات کہی کتنا انتظار کرنا چاہیے اندازا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ اور شاکر علی ہنسنے لگا۔ ہماری بستی بہت خوبصورت تھی۔ اس کے اطراف میں لہلہاتے کھیت تھے۔ نکھرے ہوئے درخت تھے اور ان کے پس منظر برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں جھانکتی تھیں۔ اگر یہ ماحول ایک مصور کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو اسے انتہائی حسین قرار دیا جاسکتا تھا۔ قدرتی گھاس کے وسیع و عریض میدان بھی دور دور تک بکھرے ہوئے تھے اور کبھی کبھی جب شاکر علی کو فرصت ہوتی تو وہ مجھے اپنے ساتھ ان میدانوں میں لے جاتا اور ہم نجانے کتنا وقت وہاں گزارتے۔ طرح طرح کی باتیں کرتے۔ بستی کا ماحول پرسکون تھا۔ سیدھے سادھے لوگ تھے۔ میں نے شہر کی ہوا کھائی تھی اور شہری زندگی کو بہت زیادہ جانتی تھی۔ اس کی نسبت یہاں کی زندگی بالکل بھیڑوں جیسی تھی۔ شہر میں بھیڑیئے ہوا کرتے تھے جبکہ یہاں ہر طرف بھیڑیں ہی بھیڑیں آباد تھیں۔ اور جب بھی کبھی مجھے ان بھیڑیوں کا تصور آجاتا میرے دل میں عجیب سی دکھن ہونے لگتی تھی۔ کاش میرا باپ' مجھے بھی باعزت زندگی گزارنے کی اجازت دیتا۔ دل پر جو داغ تھے انہیں کیسے مٹاؤں۔ شاکر علی جیسے محبت کرنے والے شوہر سے میں نے اپنی زندگی کا ایک اہم اور بھیانک پہلو پوشیدہ رکھا تھا۔ جب کہ اس نے اپنی ذات کا ایک ایک دریچہ میرے سامنے کھول دیا تھا اور کبھی بھی مجھ سے انحراف نہیں کیا تھا۔ ایسی ہی ایک بادلوں بھری شام ہم اس وسیع و عریض میدان میں بیٹھے ہوئے تھے جو ہماری رہائش گاہ کے پچھلے حصے سے شروع ہو کر دور تک چلا گیا تھا۔ کہ علمدار چچا کی بیٹی نوری ہمارے پاس پہنچ گئی۔ گھاس میں چلتی ہوئی وہ ایک گڑیا کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ شاکر اسے دیکھنے لگا۔

"یہ شرارت کی پڑیا کہاں سے آگئی۔"

"دور سے دیکھ لیا ہوگا ہمیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ادھر آگئی ہوگی۔۔۔۔"

"کچھ زیادہ نہیں آنے جانے لگی یہ۔" شاکر علی نے کہا۔

"تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ جوان لڑکی ہے' میرا خیال ہے علمدار چچا کو اس پر تھوڑی سی پابندیاں لگانی چاہیں۔"

"ارے کون سی جوانی پھٹ پڑی ہے اس پر۔ کتنی عمر ہوگی۔ سولہ سترہ سال۔ اٹھارہ سال کی ہوگی زیادہ سے زیادہ فطرتاً کتنی معصوم ہے یہ نہیں دیکھا تم نے۔؟"

"ہاں ہے تو مگر زمانہ معصوم نہیں ہے۔" شاکر علی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ صرف تمہاری سوچ ہے ہماری بستی کے لوگ بہت اچھے ہیں شاکر علی۔ میں نے تو یہاں ہر نگاہ میں پاکیزگی پائی ہے۔"

"ہاں یہاں کبھی کوئی ایسا واقعہ ہوا نہیں۔ یہ بڑا شکر ہے مگر پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔"

"کہیں علمدار چچا سے کچھ کہہ نہ دینا۔ ورنہ بیچاری پر پابندی لگا دیں گے۔"

"تم سے بہت محبت ہوگئی ہے اسے۔"

"بہت۔ اتنا چاہتی ہے مجھے کہ بیان نہیں کرسکتی۔ اکثر آجاتی ہے اور میرا دل بھی بہل جاتا ہے اس سے۔ گھر کے کام کاج بھی کردیا کرتی ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ میں نے بس ایسی ہی اپنی ذمہ داری سمجھ کر یہ بات کہہ دی تھی۔" شاکر علی نے کہا اور نوری ہمارے پاس پہنچ گئی۔ اس کی آنکھوں میں بدستور شوخی لہرا رہی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہنس کا جوڑا یہاں کیا کر رہا ہے۔؟"

"تم سناؤ کوئل تم یہاں کیسے آگئیں۔" میں نے کہا۔

"ارے واہ میں کوئل ہوں۔ تم سے زیادہ سفید رنگ ہے میرا۔ کوئل تو کالی ہوتی ہے۔" نوری نے بھڑک کر کہا۔

"سفید کوئل بھی پائی جانے لگی ہے آج کل۔"

"چلو پھر تو برا نہیں ہے۔ وہ تو بہت خوبصورت لگتی ہوگی۔ کیوں شاکر آپ بتائیے۔" اس نے شاکر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی سفید کوئل میں نے آج تک دیکھی نہیں۔ اس لئے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

کیا خیال ہے اب اٹھا جائے۔ شہزادی؟" شاکر نے سوال کیا۔

"ارے کیوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تمہارا یہاں سے جانے کا ارادہ نہیں تھا۔"

"نہیں بھئی رات کو کھلیان سنبھالنے ہیں۔ کام کرنا ہے۔ اس لئے تھوڑی دیر گھر جا کر آرام کرلینا چاہتا ہوں۔"

"اچھا اچھا ہاں۔ آج کل تو کھلیان بن رہے ہیں۔ تمہیں وہاں مصروف ہونا پڑ رہا ہے۔"

"ہاں نگرانی کرنی پڑتی ہے' ضروری ہے۔" شاکر علی نے کہا اور اس کے بعد میں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ نوری ہمارے ساتھ ہمارے گھر آگئی تھی میں دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے شاکر علی نوری کے آجانے کی وجہ سے بور ہوگیا ہو اور اس نے سوچا ہوگا کہ اس حسین موسم میں بھلا نوری کی موجودگی میں کیا لطف آئے گا۔ لیکن نوری ساتھ ساتھ ہی نازل ہوگئی تھی۔ شاکر علی آرام کرنے کے لئے جا کر لیٹ گیا اور نوری مجھ سے نجانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہی۔ پھر شاکر علی چلاگیا۔ لیکن نوری دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی تھی۔ اسی طرح زندگی کے شب و روز گزرتے رہے۔ ایک دن مجھے شدید بخار ہوگیا۔ اور میں بخار میں پھنکنے لگی سردی بھی لگی تھی۔ اتفاق کی بات کہ نوری آگئی اور اس نے مجھ پر بہت سی رضائیاں ڈال دیں۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے اپنے گھر گئی اور یہ کہہ کر آگئی کہ وہ میری تیمارداری کرے گی۔ رات بھر میں بخار میں پھنکتی رہی۔ اور نوری میرے نزدیک ہی موجود رہی۔ نجانے رات کے کون سے حصے میں مجھے نیند آگئی تھی۔ لیکن صبح کو جب میں جاگی تو نوری مجھ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک جگہ۔ گٹھری بنی ہوئی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس پر بہت پیار آیا کتنی محبت کرتی ہے وہ مجھ سے۔ شاکر کو آواز دی تو وہ دوسرے کمرے میں موجود تھا میرے پاس آگیا اور مجھ سے میری طبیعت پوچھی۔

"اسے دیکھو ذرا کیسی گٹھری بنی پڑی ہوئی ہے۔ اس کے اوپر کمبل وغیرہ ڈال دو۔"

"جگا کر بھگا کیوں نہ دوں۔ ساری رات یہاں پڑی رہی ہے۔ کہیں ملدار چچا پریشان نہ ہوجائیں۔"

"کہہ کر آئی تھی گھر میں۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ کمبل اوڑھا دو یا لحاف ڈال دو اس

کے اوپر۔ سردی میں سکڑ رہی ہے۔" شاکر علی ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

"سردی تمہیں لگ رہی ہے۔ اسے نہیں۔" اس کے باوجود اس نے نوری کے جسم پر ایک رضائی ڈال دی تھی اور اس نے پاؤں پھیلا لئے تھے۔ بہرطور طبیعت دو چار دن میں ٹھیک ہوگئی۔ لیکن نوری کی اس رات کی تیمارداری نے میرے دل میں اس کے لئے بہت جگہ پیدا کردی تھی اور اب وہ اکثر میرے ساتھ نظر آتی تھی۔ میں جہاں بھی کہیں جاتی وہ میرے ساتھ ہوتی۔ شاکر علی کام پر چلا جاتا تو میں اور نوری سیر کرنے بھی نکل جاتے تھے۔ پھر ایسی ہی ایک شام میری زندگی میں ایک دلدوز واقعے کا ظہور ہوا۔ میں اور نوری ٹہلتے ہوئے گھاس کے سبز میدان سے واپس آرہے تھے کہ ہم نے دور سے ایک شخص کو دیکھا۔ شہری لباس میں ملبوس کاندھے پر بہت سے تھیلے لٹکائے ادھر سے ادھر دیکھتا ہوا آرہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ کوئی نوجوان شہری چھوکرا تھا۔ ہم لوگ بچ کر آگے بڑھے مگر وہ بدمعاش آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھنے لگا۔ میں اور نوری ٹھٹک گئے تھے۔ نوری تو ویسے ہی شوخ شریر تھی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"خبردار زبان سے کوئی لفظ ادا نہ کرنا۔" نوری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنی دیر میں وہ ہمارے سامنے پہنچ گیا اور دفعتاً ہی میرے دل کو شدید دھکا سا لگا۔ یہ صورت میری آشنا تھی۔ میرے اس دور کی یادگار جسے میں بدترین سیاہ دور سمجھتی تھی اور اس کا نام جمال تھا۔ وہی شخص تھا یہ جس نے کہا تھا کہ اگر میں شہزادی ہوں تو میرے لئے محل ہونے چاہئیں۔ اور اس نے مجھ سے بہت سے محلوں کے وعدے بھی کئے تھے۔ لیکن اوباش فطرت عیاش نوجوان ظاہر ہے یہ ساری کہانیاں من گھڑت سناتا رہتا تھا۔ جمال کو میں نے اچھی طرح پہچان لیا۔ اور مجھے خوف سے جھرجھری سی آگئی۔ وہ گہری نگاہوں سے مجھے اور نوری کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہیں مجھ پر گڑھ گئیں اور اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

"شہزادی۔؟" میرا وجود سنسنا رہا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ ہاں یقیناً اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ گویا۔ زندگی کے بدترین لمحات کا آغاز ہوگیا۔ ان لمحات کا جس کے لئے میں نے وہ بھیانک دنیا چھوڑ دی تھی۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اور اس نے پھر کہا۔

"تو تم نے ایک نیا محل یہاں بنایا ہے۔ شہزادی۔ اور یہ واہ چیڑی اور دو دو۔ خوب بہت خوب۔ بہت خوب۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم۔" دفعتاً میرے حواس واپس آگئے۔

"ارے نہیں شہزادی۔ شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ کتنا تلاش کیا میں نے تمہیں لیکن تمہارا کہیں پتا ہی نہ چل سکا۔ کوئی بھی کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں ہوا۔"

"میں کہتی ہوں ہٹ جاؤ راستے سے۔"

"کمال کرتی ہو۔ یعنی ایسی بھی کیا بے مروتی۔ کبھی ہم سے تم بھی تھے آشنا۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔" میں نے راستہ کاٹا اور نوری کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا تھا۔ لیکن اس بستی میں اس کا نکل آنا میرے لئے وبال جان تھا اور مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب یہ یہاں سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ کچھ دور چلنے کے بعد نوری نے پوچھا۔

"کون تھا یہ شہزادی باجی۔؟"

"وہ۔ وہ دراصل۔ دراصل۔"

"آپ کا کوئی جاننے والا تھا۔ مگر وہ تو شہری بابو معلوم ہوتا تھا۔"

"ہاں شہر میں رہتا تھا اس کا نام جمال ہے۔"

"تم سے کیسے جان پہچان ہے۔" نوری کو ہر بات کی ہمیشہ ہی کرید ہو جاتی تھی۔

"بس میرا دور کا رشتہ دار ہے وہ۔ لیکن لیکن ہمارے تعلقات بہت خراب تھے۔ بہت زیادہ خراب۔"

"تم نے اپنے کسی اور رشتے دار کا بھی تذکرہ نہیں کیا۔" نوری بولی۔

"تعلقات ہی نہیں تھے ہمارے ان لوگوں سے بس یونہی۔ ویسے بہت ہی بدتمیز قسم کا آدمی ہے یہ اور میں اسے سخت ناپسند کرتی ہوں۔"

"مگر تھا تو خوبصورت۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ بکواس زیادہ نہ کیا کرو نوری۔ میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے۔"

"ارے تو میں کیا کہہ رہی ہوں۔" نوری نے کہا اور عادت کے مطابق قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ ہم گھر آگئے شاکر علی ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ نوری تو خیر فضول باتیں کرنے کی عادی ہی تھی۔ لیکن مجھ پر جو بیت رہی تھی میں ہی جانتی تھی۔ میں بستر پر جا لیٹی۔ میرے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے۔

نوری اپنی عادت کے مطابق ادھر سے ادھر گھومتی رہی پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ اچھا میں جاتی ہوں۔"

"اچھا نوری۔" میں نے فوراً ہی کہا۔ حالانکہ عام حالات میں' میں اسے روک لیا کرتی تھی۔ نوری چلی گئی اور میں آنکھیں بند کر کے لیٹی سوچتی رہی۔ اب کیا ہوگا۔ کہیں' کہیں وہ میرے گھر تک نہ پہنچ جائے۔ وہ کہانی جسے میں نے آج تک شاکر علی سے محفوظ رکھا تھا اب مجھے بر سر عام نظر آرہی تھی کیا ہوگا۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ شاکر علی کو جب میری حقیقت معلوم ہوگی۔ تو وہ نفرت سے مجھ پر تھوک دے گا۔ بلاشبہ ایسا ہی ہوگا۔ آہ کیا کروں۔ اب کیا کروں۔ لیکن کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ شام گزر گئی شاکر علی واپس آگیا اور معمول کے مطابق میرے ساتھ رہا پھر اس نے مجھ سے کہا۔

"کھلیانوں میں کام ہے کچھ میں ذرا ادھر ہی جا رہا ہوں۔ واپسی دیر سے ہوگی۔"

"میں نے خاموشی سے گردن ہلادی۔ شاکر علی کا معمول تھا۔ زمین دار کا ملازم تھا اور زمین دار جی صرف اس سے منشی گیری کا کام ہی نہیں لیتے تھے بلکہ اپنے کھیتوں اور کھلیانوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی اس کے سپرد تھی۔ اور اسے وہاں کے سارے حساب کتاب رکھنا ہوتے تھے۔ اکثر دیر سے گھر واپس آتا تھا۔ میں سہمی ہوئی جاگتی رہی۔ شاکر علی رات کو تقریباً ایک بجے آیا تھا اور میں معمول کے مطابق اس کے کام سرانجام دینے لگی۔ تھکا تھکا شاکر علی بستر پر لیٹا اور سو گیا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جمال کمبخت اب کیا کرے گا۔ کیسی شیطانیت تھی اس کی آنکھوں میں۔ نوری کو دیکھ کر بھی اس نے پھبتی کسی تھی۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر وہ میرے گھر تک پہنچ گیا تو۔۔! اور میرا سوچا بالکل درست ہی ثابت ہوا۔ تقریباً گیارہ بجے تھے جب وہ ہمارے گھر

آگیا۔ دروازہ بجا تو میں نے اسے اندر آنے کے لئے کہا۔ میں سمجھی کہ نوری ہے۔ وہ مسکراتا ہوا اندر آگیا اور میں اس دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

تم۔ تم یہاں کیوں آمرے۔؟"

بھئی شہزادی ہمارا رشتہ اتنا کچا تو نہیں ہے کہ آسانی سے ٹوٹ جائے۔ بڑی معلومات حاصل کرتے رہے ہیں تمہارے بارے میں۔ مولوی نیاز اللہ کی بھتیجی ہونا۔ تم خوب' خوب لیکن یہ بات ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجید خان کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اور نہ ہی مولوی نیاز اللہ کی کوئی بھتیجی تھی۔ کیا سمجھیں۔؟"

"تمہارا دماغ خراب ہوا ہے جمل۔ آخر' آخر تم کیا چاہتے ہو۔ یہاں کیوں آئے تم۔"

"یقین کرو یہ معلوم نہیں تھا کہ تقدیر اس طرح کھل جائے گی۔ مصوری کا شوق ہے ہمیں اور اکثر اچھی اچھی خوبصورت بستیوں میں اچھے مناظر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اسی چکر میں یہاں آئے تھے مگر کیا' معلوم تھا کہ تقدیر یہاں ہمارے لئے اپنے دروازے کھولے کھڑی ہے۔"

"دیکھو میری شادی ہو چکی ہے۔ میرا شوہر شاکر علی بہت نیک اور فرشتہ صفت انسان ہے۔ میں' میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے میری اپنی اس نئی زندگی میں گزر بسر کرنے دو۔ وہ دور میری زندگی کا بدترین دور تھا۔ جب' جب تم مجھ تک پہنچے تھے۔ لیکن اب' لیکن اب۔"

"ہوں۔ ہوں۔ تو ہم کون سا تمہیں پریشان کر رہے ہیں ڈیر اور پھر تم تو ہماری اچھی طرح شناسا ہو۔ تم سے اگر ہمارا کوئی واسطہ نہ بھی رہے تو ہمیں اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ جو تمہارے ساتھ تھی کتنی خوبصورت تھی اور یقینی طور پر وہ تمہاری دوست ہوگی۔ ہماری دوستی بھی اس سے کرادو نا۔" میرے چہرہ پر خون اتر آیا۔ میں نے اس سے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نوری بہت معصوم لڑکی ہے اور بستی کے ایک باعزت انسان کی بیٹی ہے۔ سمجھ لو اگر میں نے زبان کھول دی تو تمہاری بوٹیاں کٹ جائیں گی یہاں پر۔"

"یقیناً ایسا ہوگا۔ مگر تم زبان کھولو گی کیوں۔ کیوں کہ تم جانتی ہو کہ اگر تم نے زبان کھولی تو پھر ہم بھی زبان کھول دیں گے۔ اور ہماری زبان کھولنے کے بعد جو کچھ ہوگا اس کا تمہیں اندازہ ہے۔ چنانچہ سودا کرلو ڈارلنگ۔ میرے خیال میں یہ سودا برا نہیں رہے گا۔"

"تم کمینے ہو۔ ذلیل ہو۔"

"کسے انکار ہے۔ اگر کمینے اور ذلیل نہ ہوتے تو تم جیسی کمینی ذلیل فاحشہ تک پہنچتے۔ بھئی دیکھ لو ایک ہی سطح کے لوگ ہیں ہم دونوں۔ اب تم نے اپنے آپ پر خول چڑھالیا ہے تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ہم نے اپنے آپ پر کوئی خول نہیں چڑھایا اور تم سے صاف الفاظ میں باتیں کر رہے ہیں۔ اور سنو یہاں آتے رہیں گے تم چاہو تو ہمیں اپنا کزن بتا سکتی ہو۔ اور اگر تم نے یہ سب کچھ نہ کیا شہزادی تو پھر یہ سمجھ لو کہ شاکر علی ہی نہیں بستی کے ایک ایک فرد کو تمہارے بارے میں تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔ اور ہم درجنوں گواہ اپنے ساتھ یہاں لے آئیں گے۔" مجھے چکر آگیا تھا گرنے سے بچنے کے لئے میں نے ایک دیوار کا سہارا لیا اور اس سے بولی۔

"چلے جاؤ۔ دیکھو تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"اب اچھا ہو یا برا۔ آگئے ہیں تو آ ہی گئے ہیں۔ تمہارے شوہر شاکر علی سے بھی ملاقات کرلیں گے۔ اچھا تو پھر میری بات کا خیال رکھنا۔ ایک بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ میری زبان کبھی نہیں کھلے گی۔ اس وقت تک نہیں جب تک کہ تم مجھے بالکل مجبور نہ کرو۔" وہ چلا گیا۔ اور میرے بدن کا لہو خشک ہوگیا۔ کمبخت کتنا شاطر کتنا کمینہ تھا۔ اور اس کی کمینگی کا مزید مظاہرہ اس وقت ہوا جب شام کو وہ شاکر علی کے ساتھ گھر واپس آیا۔ شاکر علی نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"شہزادی یہ تمہارا تایا زاد بھائی ہے۔" جمل مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا مجھے ہاں کرنی پڑی۔

"مجھ سے ملے تھے یہ حضرت اور انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے گھرانے اور ان کے گھرانے کے تعلقات بہتر نہیں ہیں اور بہت عرصے پہلے ان کی تم سے کنارہ کشی ہو چکی ہے۔ یہ بھی بتایا تھا انہوں نے کہ اتفاق سے یہ یہاں مصوری کرنے آئے تھے تو تم انہیں

نظر آگئیں۔ لیکن تمہارے دل سے رنجش آج تک دور نہ ہوئی۔" میں خاموشی سے گردن
جھکائے رہی تو شاکر علی ۔نے کہا۔

"بھئی بہت عرصے تک دل میں برائی رکھنا بری بات ہے۔ اب یہ سالے صاحب
ہماری بستی میں آئے ہیں تو ظاہر ہے ہم انہیں نظرانداز نہیں کرسکتے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے
کہ سالے صاحب ہمارے ساتھ رہیں گے۔"

"نہیں شاکر یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

"کیوں بھئی' کیسی باتیں کرتی ہو۔ آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔ رشتے کوئی حیثیت
رکھتے ہیں۔ تعلقات خراب ہوں گے بزرگوں میں خراب ہوں گے۔ تم دونوں کے درمیان
تو تعلقات خراب نہیں ہیں۔"

"بالکل نہیں۔ دولہا بھائی۔ بالکل نہیں۔" جمال نے بے حیائی سے کہا۔

"تو پھر بھلا اس بات کے کیا امکانات ہیں جناب جمال صاحب کہ آپ یہاں آئیں
اور ہماری گھر سے دور رہیں۔ نہیں شہزادی میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی بات نہیں
سنوں گا۔ ان کے لئے اچھے سے اچھا بندوبست کرو۔ ویسے تو ہم ہیں ہی کس قابل۔ یہ شہر
کے رہنے والے تو بڑی خوبصورت زندگی کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن سالے صاحب بہنوئی
کا گھر سمجھ کر رہنا۔ کوئی تکلف نہیں کرنا۔ جو کچھ بھی یہاں ہے تمہارے لئے حاضر ہے۔"

شاکر علی نے جس انداز میں فیصلہ کن بات کہی تھی میرے لئے اس میں ترمیم کی گنجائش
نہیں تھی اور پھر وہ کمبخت جمال' شاکر علی تک پہنچ چکا تھا۔ زبان کھول دی تو میری دنیا
مٹ سکتی تھی اور میں اپنی اس زندگی کو مٹانا نہیں چاہتی تھی۔ جس میں میرے لئے
خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ صبر کرکے خاموش ہوگئی اور اس کی بعد مجھے اس کے لئے
انتظامات کرنا ہی پڑے۔ شاکر علی مزاج کا اتنا اچھا انسان تھا اور طبیعت کا جتنا پاکیزہ تھا مجھے
اس کا اندازہ تھا۔ اس کے بھولے بھالے معصوم دل میں کبھی کسی گندگی کا خیال بھی نہیں
آسکتا تھا۔ چنانچہ وہ کیا سوچتا کہ جمال کون ہے۔ مجھے جمال کو برداشت کرنا پڑا۔ جمال رات
گئے تک شاکر علی سے باتیں کرتا رہا تھا۔ جمال نے اسے بتایا تھا کہ وہ بھی اپنا کام کرنے
تھوڑی دیر کے بعد نکل جائے گا۔ لیکن جب شاکر علی چلاگیا تو جمال نے مسکراتے ہوئے

کہا۔

"اس تعاون کا شکریہ جان من۔ ویسے تم نے اچھی زندگی اپنائی ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ
کہ وہاں کی خوبصورت زندگی چھوڑ کر تم نے اس زندگی کو کیسے اپنالیا۔؟"

"دیکھو جمال حد سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول
جاؤ۔ وہ میرا بدترین ماضی تھا اور یہ میرا خوشگوار حال ہے۔ براہ کرم مجھے میرے حال میں تباہ
نہ کرو۔"

"کون کتا یہ بات چاہتا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں تم زندگی کی تمام خوشیاں لوٹو۔ ایک
چھوٹی سی بات ہے جو تمہیں میرے لئے کرنی پڑی گی اور نتیجے میں سکھ' چین' آرام اس
کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا میں تم سے۔ اگر تم ایک شوہرپرست بیوی بن چکی ہو تو میں
بھی تمہاری اس بات کا احترام کروں گا۔ لیکن وہ لڑکی واقعی بہت خوبصورت ہے۔"

میں نے اسے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ اس قدر الڑ اور معصوم ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ بالکل بچی ہے وہ۔ بہت
ہی معصوم فطرت کی مالک۔ خدا کے لئے اس کی تباہی کے بارے میں نہ سوچو۔"

"کمال کرتی ہو تم بھی شہزادی۔ بھلا اس میں تباہی کا کیا امکان ہے اور تم کون سی تباہ
ہوگئیں۔ اچھی خاصی نظر آرہی ہو۔ اب بھی بہترین صحت ہوگئی ہے۔ بلکہ پہلے سے کہیں
زیادہ حسین ہوگئی ہو۔ بھئی سوچ لو ہمارا حق تو تم پر بھی ہے اور ہم تم سے کسی بھی لمحے اپنا
حق مانگ سکتے ہیں۔ لیکن سودا برا نہیں ہے جی چاہے تو کرلو۔ ورنہ اس کے بعد جو کچھ ہم
کرسکتے ہیں وہ ہم کرلیں گے۔"

"میں اسے تمہارے لئے نہیں ورغلا سکتی۔"

"ہوں۔ ورغلانے کو کون کہہ رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بس کوئی ایسا موقع فراہم
کردو کہ ۔۔۔ اچھا خیر ایک اور بات بھی ہوسکتی ہے اگر تم پسند کرو۔"

"میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا؟"

"ہم خود اس پر کوشش کئے لیتے ہیں اگر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگئے تو
ٹھیک ہے ورنہ چلے جائیں گے یہاں سے۔ اور تم سے کچھ نہیں کہیں گے۔" میں نے

آنکھیں بند کرلیں۔ اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی تھی۔ نوری کو سمجھا سکتی تھی البتہ اور اسے
بتا سکتی تھی کہ جمل اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس کے قریب جانے کی کوشش نہ کرے۔
تھوڑی دیر کے بعد جمل اپنی مصوری کا سامان اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اور میں غور کرتی رہی۔
نوری اس دن دوپہر تک نہیں آئی تھی۔ البتہ تین ساڑھے تین بجے کے قریب وہ میرے
پاس پہنچی۔ وہی شوخی وہی انداز۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"کہاں غائب تھی صبح سے۔؟"

بس ایسے ہی کچھ کام کررہی تھی۔" اس نے ناک سے جواب دیا۔

"ہوں۔ اور کوئی خاص بات۔"

"نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارا تایا زاد تمہارے پاس آکر
رہنے لگا ہے۔"

میں نے مشتبہ نگاہوں سے نوری کو گھورتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا۔"

"بھئی کمال کرتی ہو۔ کیا ہم اتنی سی بات بھی نہیں معلوم کرسکتے۔ بس ایسے ہی کسی
سے سنا تھا۔ کہ شاکر علی کے ہاں کوئی آیا ہے۔ شہر کا رہنے والا ہے اور تصویریں بناتا ہے۔
ویسے شہزادی باجی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میری ایک تصویر بنا دی
جائے۔ کیا تم اس سے میری ایک تصویر بنانے کے لئے کہہ سکتی ہو۔؟"

"دیکھو نوری ہمارے اور اس کے درمیان تعلقات صرف اس لئے خراب تھے کہ
اس کا خاندان بہت برا خاندان ہے۔ اور اس خاندان کا آدمی بھی بہت برا ہے وہ۔ کیا
سمجھیں تم۔ اس سے بالکل ربط و ضبط نہ بڑھاؤ وہ بہت گندہ انسان ہے۔"

"میں تو کچھ یوں محسوس کرتی ہوں جیسے تم بلاوجہ اس سے نفرت کرتی ہو۔ خاندانی
رنجشیں بالآخر ختم ہوجاتی ہیں۔ کتنے عرصے پہلے تمہارے اس کے خاندان میں رنجش ہوئی
تھی۔ شہزادی باجی۔؟"

بیکار باتیں مت کرو نوری۔ میں نے جو کچھ تمہیں سمجھایا ہے اس پر عمل کرو۔ ورنہ
اپنے سارے عمل کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔"

"کون کس کا ذمہ دار ہوتا ہے بہرحال چھوڑیں۔ وہ ہمارے درمیان جھگڑا کیوں

بنے۔" نوری نے کہا۔ اور اس کے بعد پھر اس نے یہ موضوع ترک کردیا۔ لیکن میں یہ
محسوس کررہی تھی کہ نوری خود اس کی جانب راغب ہورہی ہے۔ برباد ہوجائے گی کمبخت
اپنے آپ کو تباہ برباد کرے گی اور اس کے بعد حالات کچھ ایسے ہی نظر آنے لگے۔ نوری
اب اکثر میرے پاس سے غائب رہتی تھی۔ کبھی کبھی ہاتھ لگ جاتی تو میں اس سے شکایت
کرتی اور وہ ہنس کر خاموش ہوجاتی۔

"آج کل دن میں کہاں ہوتی ہو نوری؟"

"گھر میں"

"گھر میں رہنا کیوں شروع کردیا؟"

"بس ایسے ہی۔"

"میں نہیں مانتی۔ جمل بھی یہاں سے چلا جاتا ہے اور تم بھی غائب ہوتی ہو۔"

"ارے نہیں شہزادی باجی۔ میری تو اس سے کبھی بات چیت بھی نہیں ہوتی۔ بس
اکثر کبھی کبھی نظر آجاتا ہے۔ تو راستہ روک لیتا ہے میرا۔ مگر مجھے ڈر لگتا ہے اس سے کوئی
بات کرتے ہوئے۔ اس کی آنکھیں بڑی عجیب ہیں۔"

"میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا نوری۔ ایسا نہیں کرنا۔"

"تو کون کر رہا ہے۔ بھئی۔" نوری نے جواب دیا۔ شاکر علی اتفاق سے اس دن
جلدی آگیا تھا۔ جب نوری یہاں آئی تھی۔ شاکر علی نے نوری کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے
کہا۔"

"کہو نوری۔ کہاں غائب ہو آج کل۔؟"

"بس گھر کے کام کاج میں پھنسی رہتی ہوں۔"

"سنا ہے تم مصور سے تصویر بنوا رہی ہو۔؟" شاکر علی نے کہا اور نوری چور نگاہوں
سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"ہاں۔ اس نے مجھ سے خود ہی کہا تھا۔" میں سرد نگاہوں سے نوری کو دیکھنے لگی۔
پھر نوری کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

"میں کوئی کام اپنی مرضی سے بھی کرسکتی ہوں اور ہر بات میں کسی کی مداخلت تو

برداشت نہیں کی جاسکتی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میری تصویر بنا دے اور وہ خوشی سے تیار ہو گیا۔ اتنی اچھی تصویر بنا رہا ہے وہ میری کہ بتا نہیں سکتا باجی۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور میں سرد نگاہوں سے اسے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ نجانے کیوں شاکر علی کے چہرے پر بھی کچھ ناخوشگواری کے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ پھر جب نوری چلی گئی تو شاکر علی نے مجھ سے کہا۔

"جمل کس قسم کا لڑکا ہے؟ شہزادی۔" میں نے وحشت بھری نگاہوں سے شاکر علی کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"میرا اپنا بھی یہی اندازہ ہے۔ نوری آج کل اس کے زیادہ قریب دیکھی جانے لگی ہے۔"

"ہاں میں بھی تم سے یہ کہنے والی تھی۔"

"مگر میں نوری سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم اسے سمجھانے کی کوشش کرنا۔"

"وہ سرکش لڑکی ہے میری بات نہیں مانتی۔"

"کچھ عرصے پہلے تو وہ تمہاری ہر بات مانتی تھی۔"

"ہاں آخر جمل سے میرے تعلقات کی خرابی کی کوئی نہ کوئی بنیاد تو ہو گی۔ شاکر علی۔ تم نے ضد کر کے اسے یہاں بلالیا۔ دو چار دن یہاں رہتا اور اس کے بعد واپس چلا جاتا۔ لیکن اب اسے ایک ٹھکانہ مل چکا ہے۔"

"خیر بھئی وہ ہمارا سالا ہے۔ جیسا بھی ہو۔ بس میرا مطلب یہ تھا کہ ذرا سی احتیاط رکھو۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔" شاکر علی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ میں بھلا کیا احتیاط کر سکتی تھی۔ نوری کو سمجھاتی تھی۔ ایک دن نوری بگڑ گئی۔

"نجانے تم مجھے کیا سمجھتی ہو شہزادی۔ میں تو تمہاری اتنی عزت کرتی ہوں۔ باجی باجی کہتی ہوں تمہیں اور، اتنی محبت سے یہاں آتی ہوں مگر، تم، تم مجھے۔ مجھے۔"

"نہیں نوری میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ تو بہت اچھی ہے لیکن زمانہ بہت خراب ہے۔"

"تم نے کبھی اور کچھ نہیں کہا مجھ سے۔ اتنے عرصے سے آتی ہوں تمہارے پاس۔"

"وہ تو ٹھیک ہے کہنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ لیکن میں تجھے بتا رہی ہوں جمل بہت برا آدمی ہے۔"

"میرا اس سے واسطہ کوئی نہیں ہے۔ میں تو آپ سے کہہ چکی ہوں بس میں نے اس سے تصویر بنانے کے لئے کہا تھا اس نے میری تصویر بنا دی اور اب، اب میں اس سے ملتی بھی نہیں ہوں۔ اس کی بات کون مانتا ہے وہ وہ ویسے اتنا برا آدمی نہیں ہے۔" بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن نوری کچھ بگڑی سی گئی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں اس کا آنا جانا ضرورت سے زیادہ ہی کم ہو گیا تھا۔ میں پھنکتی رہی۔ پھر جمل ایک دن مجھے تنہائی میں ملا تو میں نے اس سے کہا۔

"تم کب تک یہاں رہو گے۔؟"

"جب تک مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ لڑکی بہت چالاک ہے۔ بہت زیادہ چالاک۔ تم تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہو۔"

"بکواس کرتے ہو۔ وہ بے حد معصوم ہے۔"

"ہاں جتنی معصوم ہے وہ مجھے اندازہ ہے لیکن ایک بات میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ تم سے زیادہ باخبر ہے۔ دنیا کو تم سے کہیں زیادہ جانتی ہے۔ بہر طور ہم بھی پرانے کھلاڑی ہیں۔ ایک نہ ایک دن اسے ہمارے چنگل میں پھنسنا پڑے گا۔" جمل نے کہا اور میں اسے بے یقینی کے انداز میں دیکھنے لگی۔ کیا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ سچ ہے کیا نوری درحقیقت اس کے فریب میں نہیں آئی۔ اگر ایسا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ میں اس لڑکی کا برا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اگر دونوں مجھ سے جھوٹ بول رہے ہیں تو، تو یہ بہت ہی افسوس ناک بات ہوگی۔ اور اس کی زد براہ راست ہم پر پڑے گی۔ طلدار چچا بہت اچھے انسان تھے۔ اور نوری ان کی الھڑ اور نوجوان بیٹی۔ ان کی عزت۔ بات نجانے کہاں سے کہاں

تک پہنچے جمال کہنے لگا۔

"ویسے ایک بات تم سے کہنا چاہتا تھا شہزادی۔" میں نے نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تو بے حیائی سے مسکراتا ہوا بولا۔

"وہ میرے قریب آنے سے گریز کر رہی ہے۔ اور تم' تم میری زبردستی کی بہن بن بیٹھی ہو۔ کیا ضروری ہے کہ یہ رشتہ تنہائی میں بھی قائم رہے۔ میرا مطلب تم سمجھ رہی ہوگی اچھی طرح اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے ناواقف تو نہیں ہیں۔" جمال کا مطلب میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور نفرت بھرے انداز میں قریب رکھی ہوئی ایک چھری اٹھالی۔

"میں تمہارے اتنے ٹکڑے کروں گی جمال کہ گننے بھی نہیں پائے گا۔ بعد میں جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ سمجھے تم میں تمہیں جان سے مار دوں گی تمہاری یہ جرات کیسے ہوئی؟"

"ارے چھوڑو چھوڑو شہزادی۔ تم جیسی پاکباز عورتیں بہت دیکھی ہیں۔ جرات کیسے ہوئی تم جانتی ہو۔ میری یہ جرات کیسی ہوئی۔"

"میں' میں بس تم سے کہے دیتی ہوں نکل جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ۔ ورنہ - ورنہ - میں اپنے ہاتھوں سے سب کچھ ختم کردوں گی۔"

"چھوڑو تم تو بلاوجہ برا مان گئیں ایسے ہی۔ مگر میرا خیال ہے مجھے اب اپنا کام کرلینا ہی ہوگا۔" اس نے کہا اور اس کے بعد وہ باہر نکل گیا۔ لیکن میرے لئے سوچنے کو بہت کچھ چھوڑ گیا تھا۔ اس نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا وہ میرے لئے انتہائی ہولناک تھا۔ اگر نوری واقعی اس کے قبضے میں نہیں آئی تو پھر وہ میری جانب راغب ہوجائے گا۔ اور' اور ایک بار پھر مجھے اسی گناہ کی دلدل میں جانا پڑے گا۔ اس کی زبان بند کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیے مجھے کیا کرنا چاہیے اور دل کے گوشوں میں ایک عجیب سا خیال ابھرنے لگا۔ اگر اسے زندگی سے محروم کردوں تو۔ اس کی زبان اسی طرح بند رہ سکتی ہے ہاں اپنا مستقبل بچانے کے لئے مجھے یہ ہولناک کام سرانجام دینا ہوگا۔ آہ میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ لیکن لیکن اپنا گھر اپنی جنت کو بچانے کے لئے مجھے اس شیطان کو فنا کرنا پڑے گا اور یہ بات میرے ذہن میں جم

گئی۔ میں یہ سوچنے لگی کہ کسی وقت موقع پاکر میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں تو کیسا رہے گا۔ مگر اس کوشش میں' میں کامیاب ہو بھی سکوں گی یا نہیں' کس طرح میں اسے ہلاک کروں گی۔ چھری سے لیکن میرے ہاتھ اتنے مضبوط نہیں' وہ باآسانی مجھے قابو میں کرلے گا۔ اور جب ایک بار میرا ہاتھ اس پر اٹھ جائے گا تو وہ یہ بات سوچنے پر مجبور ہوجائے گا کہ میں اس کی زندگی کی دشمن بن گئی ہوں اور پھر وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔ نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ میرا ذہن سوچوں میں گم رہا اور میں نے اس کا پیچھا کرنا شروع کردیا۔ میں نے یہ دیکھنا شروع کردیا کہ وہ کہاں کہاں تصویر کشی کرتا ہے کہاں کہاں جاتا ہے۔ دن میں اور پھر رات میں۔ رات کی تنہائیوں میں۔ ایک بار میں نے اسے کھلیانوں کی جانب دیکھا۔ ملما کے کھلیان ذرا دور کے فاصلے پر تھے۔ اور اس طرح پیچ در پیچ بنائے گئے تھے کہ ان میں بالکل اندر داخل ہونا کافی مشکل کام تھا۔ لیکن میں نے اسے ان کھلیانوں میں جاتے ہوئے دیکھا اور میرے دل میں ایک عجیب سا احساس ابھر آیا۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنایا کھلیانوں کی نگرانی میں نے باقاعدہ شروع کردی تھی۔ وہ اکثر ان کھلیانوں کی جانب جاتا رہتا تھا۔ اور پھر ایک دن میں نے نوری کو بھی کھلیانوں کی جانب جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ بدبخت لڑکی پھنس گئی تھی اس کے جال میں۔ پھنس گئی تھی۔ یقینی طور پر وہ اس کے جال میں پھنس گئی تھی۔ لیکن لیکن کچھ بھی ہوجائے مجھے چاہے ساری دنیا کو فنا کرنا پڑے میں شاکر علی جیسے فرشتہ صفت انسان کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں اپنی حیات میں انگارے نہیں بھرنا چاہتی تھی۔ اور اس کے لئے میں نے بالآخر ایک فیصلہ کرلیا۔ یہ انگارے سلگ کر شعلے بن چکے تھے اور میں ان شعلوں میں بھسم ہوئی جارہی تھی۔ اس سے پہلے کہ آگ میرے گھر میں لگے میں' میں کچھ کر ڈالنا چاہتی تھی۔ اور میں نے اس کے لئے انتظار کرنا شروع کردیا۔ کھلیانوں کا میں نے اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا اور کئی بار میں نے نوری کو ان کھلیانوں کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جمال کو بھی وہاں دیکھا جاچکا تھا۔ پھر ایک رات ایک رات میں نے اپنے کام کے لئے آخری فیصلہ کرلیا۔ میں نے یہ سوچا کہ اگر آج کام بن جائے تو آج سہی ورنہ جس دن بھی ایسا ہوگا میں یہ کام سرانجام دے لوں گی۔ میں رات کو اس وقت جب شاکر علی گھر میں موجود نہیں تھا۔ مٹی کے تیل کی بڑی

بوتل اور ماچس لے کر کھلیانوں کی جانب بڑھ گئی۔ کھلیان بارود کے ڈھیر تھے اور ذرا سی
آگ انہیں شعلہ بنا سکتی تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور پھر میری مراد پوری ہو گئی۔
میں نے نوری کو چوروں کی طرح کھلیانوں کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا اور میرے ہونٹ
نفرت سے سکڑ گئے۔ تیری بھی موت آگئی ہے نوری۔ تیری بھی موت آگئی ہے۔ افسوس اس
وقت میں تیرا تحفظ نہیں کر سکتی۔ میں اپنی جنت کو بچانے کی فکر میں سرگرداں ہوں۔ ٹھیک
ہے نوری مجھے معاف کر دینا۔ لیکن لیکن میرے لئے یہ بے حد ضروری ہے۔ نوری
کھلیانوں میں اندر چلی گئی اور میں دبے قدموں آہستہ آہستہ وہاں پہنچ گئی۔ کھلیان کے
پچھواڑے پہنچ کر میں نے اندر کی سرگوشیاں سننے کی کوشش کی اور مجھے کچھ آوازیں سنائی
دیں۔ گو یہ کھلیانوں سے باہر نہیں آ رہی تھیں اور ان کا مفہوم سمجھنا مشکل تھا لیکن یہ
اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ دونوں اندر موجود ہیں۔ میں نے گہری سانس لی اور اس کے بعد اپنے
کام کا آغاز کر دیا۔ مٹی کا تیل کھلیانوں پر چھڑک دیا اور اس طرح چھڑکا کہ سامنے کا راستہ
بند ہو جائے۔ میں اس کام کو مکمل طریقے سے سرانجام دینا چاہتی تھی۔ اور پھر ماچس کی تیلی
میں نے کھلیانوں پر اچھال دی۔ کھلیانوں نے ایسی آگ پکڑی کہ میں خود بھی اس کی توقع
نہیں رکھتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ پھر کچھ فاصلے سے ان
شعلوں کو دیکھ لیا گیا۔ اور لوگوں کو آتے ہوئے دیکھ میں وہاں سے کھسک گئی۔ ہانپتے ہوئے
سینے اور اور کانپتے ہوئے دل کے ساتھ میں جو اندر داخل ہوئی اور میں نے وہ تمام چیزیں
چھپا دیں جو اس آگ کی نشاندہی کر سکتی تھیں۔ میرا وجود بری طرح لرز رہا تھا۔ اچانک
میری نگاہ اس کمرے کی طرف اٹھ گئی جہاں جمال سوتا تھا۔ اس کمرے میں مدھم سی روشنی
پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے حیرانی سے سوچا اور آہستہ آہستہ کمرے کے قریب پہنچ گئی۔ میں
نے اندر جھانک کر دیکھا تو جمال بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔
میں دہشت سے کانپ گئی میرا سر اتنی زور سے گھوما کہ وہیں گرتے گرتے بچی۔ تاہم میں
نے خود کو سنبھالا اور لرزتے قدموں سے واپس چل پڑی۔ میری زبان خشک ہو رہی تھی۔
اگر کھلیانوں میں جمال نہیں تھا تو پھر کون تھا؟ پھر کون تھا۔ نوری کے ساتھ؟ میں نے دو
آدمیوں کی آوازیں سنی تھیں۔ میرے خدا۔ میرے خدا یہ سب کیا ہو گیا۔ اس کا مطلب

ہے کہ نوری کے کسی اور سے بھی تعلقات تھے۔ مگر کس سے' کس سے؟ میں دونوں
ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھی رہی۔ اندر کی جو کیفیت تھی اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔
رات کافی ہو گئی تھی وہاں کیا ہو رہا تھا مجھے اس بارے میں معلوم نہیں تھا۔ پھر دفعتاً ہی میرا
دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا گیا اور میں بری طرح اچھل پڑی۔ کانپتے ہوئے قدموں سے
میں دروازے کے قریب پہنچی۔ شاکر علی اتنی زور سے تو دروازہ نہیں دھڑدھڑاتا تھا۔ لیکن
باہر چند افراد کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"شہزادی کچھ معلوم ہے تجھے کیا ہو گیا ہے۔؟"

"کک کیا ہو گیا۔"

"شاکر علی' شاکر علی اور نوری دونوں بدکار تھے کھلیانوں میں رنگ رلیاں منا رہے
تھے کہ کسی طرح کھلیانوں میں آگ لگ گئی۔ دونوں میں سے ایک بھی نہیں بچ سکا۔"

"یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس کا وجود زمین کی طرف
آ رہا تھا۔"

درندہ

آج کی ڈاک میں یوں تو میرے نام ذاتی خطوط کی بھرمار بالکل اسی انداز میں تھی جیسے عموماً رہتی تھی مگر ایک خط.....

میں نے جلدی سے اس خط کو اٹھا لیا۔ سرنامہ پر مختصر الفاظ میں رام ناتھ لکھا ہوا تھا۔ یہ نام میرے حافظے سے ابھی محو نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ یہ خط اس شخص کی طرف سے میرے نام آیا جس نے بارہ سال میں یہ دوسرا خط لکھا تھا۔

"مجھے خوب یاد ہے کہ رام ناتھ نے چار سال قبل مجھے اپنی شادی کا خط بھیجا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ___ ایک لمبا خط آیا تھا۔ جس میں وہی باتیں تھیں جو عموماً کلاس فیلو اپنی شادی کے موقع پر دوستوں کو لکھتے ہیں۔

رام ناتھ سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب ہم دونوں فرسٹ ایئر میں پڑھتے تھے۔ مجھے یہ سنجیدہ اور متین سا لڑکا پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا اور جب ہماری چند سرسری ملاقاتیں کالج کے علاوہ بھی ہوئیں تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا۔ اور پھر دوستی فروغ پانے لگی اگرچہ ہمارے درمیان مذہب و سماج کا بعد موجود تھا۔ مگر طبع کی یکسانیت امتیازات ختم کر دیتی ہے یہی حال ہمارا تھا۔ ہم آپس میں بے حد خلوص رکھتے تھے۔

بی اے کے بعد رام ناتھ اپنے خاندانی پیشے یعنی تجارت میں لگ گیا لیکن مجھے چونکہ اوائل عمر سے جاسوس بننے کا شوق یعنی خبط سوار تھا اس لئے ایم ایس سی کے بعد میں بیرون ملک چلا گیا۔

اب میں چند سال سے ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔ لوگ کہتے ہیں میں اپنے پیشے میں بہت کامیاب ہوں۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی میں سراغ رسانی کی ابجد سے بھی نابلد ہوں۔ شاید آپ اسے منکسر المزاجی پر محمول کریں۔

رام ناتھ کا خط اتنے دن بعد آیا تھا اس لئے اولیت اسی کو دی گئی مختصراً مگر پر اثر تحریر تھی۔

اس نے لکھا

"پیارے منصور"

"اس خط کو دیکھتے ہی لکھنؤ آجاؤ تمہاری بھابھی کل سے غائب ہے"

میں نے کئی بار اس مختصر تحریر کو پڑھا پھر اپنے پرانے دوست کی مدد کے لئے دل کو مجبور پا کر میں نے اسی وقت ایئرپورٹ فون کیا۔ معلوم ہوا دوپہر کی فلائیٹ سے سیٹ مل سکتی ہے۔

میں نے روانگی سے پہلے سیکرٹری کو خاص ہدایت دیں اور دو بجے کی پرواز سے لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

رام ناتھ مجھے ایئرپورٹ پر نہیں ملا، ملتا بھی کیونکر میں بس یوں ہی چل دیا۔ جب ٹیکسی ڈالی گنج میں ایک عالی شان مکان کے سامنے رکی تو کچھ دیر کے لئے میں اپنے دوست کی ترقی پر حیران رہ گیا۔

پھاٹک پر بوڑھا چوکیدار موجود تھا۔ وہ میرا کارڈ اندر لے گیا اور پھر دو منٹ کے بعد میں نے دیکھا رام ناتھ ننگے پاؤں بھاگا ہوا باہر کی طرف آیا تھا۔

ہم دونوں کافی عرصے بعد ملے تھے مگر خلوص میں اب تک کمی نہیں آئی تھی ہماری ملاقات اس وقت کافی جذباتی ہو گئی تھی۔ دیر تک ہم بغل گیر رہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ آنسو میری آمد کی مسرت کا اظہار تھے۔ یا پاروتی کی گمشدگی کے غم کا ناسور تھا جو ابھی رس رہا تھا۔

جب ہم رسمی گفتگو کر چکے تو جلد ہی میں نے رام ناتھ سے اس کی بیوی پاروتی کے بارے میں پوچھا۔

ایک لمحے کو رام ناتھ خاموش ہو گیا پھر رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولا:

"منصور ....اس وقت تمہیں دیکھ کر میرا سارا دکھ دور ہو گیا ہے اور اب خدا سے امید ہے کہ تم پاروتی کو بھی ضرور ڈھونڈ نکالو گے"

"مگر رام ناتھ" میں نے ٹوکا "تمہیں مجھے شروع سے بتانا ہو گا اس وقت سے جب سے کہ تمہاری شادی پاروتی سے ہوئی تھی"

رام ناتھ نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"چار سال پہلے میری شادی پاروتی سے ہوئی تھی میں نے پاروتی کو خود ہی پسند کیا ہے۔ چونکہ ہمارے شہر میں دسہرے کے موقع پر دور دور سے لوگ آتے ہیں اور بہت سے رشتے اسی زمانے میں طے پا جاتے ہیں۔ اس دن جب ڈولے نکل رہے تھے ایک جلوس میں پہلی بار میں نے پاروتی کو دیکھا۔ پندرہ برس کی وہ ایک درمیانی قسم کی لڑکی تھی نہ بہت زیادہ حسین تھی نہ بدصورت، جسمانی اعتبار سے بھی اسے پسندیدہ کہا جا سکتا تھا لیکن مجھے وہ کیوں پسند آئی جانتے ہو ہلکے نیلے رنگ کا بلاؤز اور سفید ساڑھی باندھے تھی۔ اس نے بالوں کو یوں ہی سمیٹ کر ربن سے باندھ رکھا تھا میرے تصورات میں ایک ایسی ہی لڑکی کا نقشہ تھا۔"

پاروتی میرا آئیڈیل تھی۔

میں نے کوشش کر کے اس کا نام پتہ دریافت کر لیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ کہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ اسی رات میں نے ماتا جی کو ساری بات بتا دی۔ وہ میرے بیاہ کے لئے بڑی بے کل تھیں میرے منہ سے اس بات کو سن کر ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ اس رات پتا جی کو انہوں نے ہموار کر لیا۔ دوسرے دن علی الصبح ماتا پتا اسی ہوٹل میں جا دھمکے جہاں پاروتی اپنے والدین کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔

الغرض سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ لوگ جاتے وقت رشتہ طے کر گئے اور پھر اسی سال ہماری شادی ہو گئی۔

"تمہیں یاد ہو گا منصور میں نے تمہیں اپنی شادی میں بلایا تھا مگر تم نہیں آئے یہ شکایت بہرحال تم پر ڈیو ہے"

پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "شادی کے بعد پاروتی سے مجھے عشق ہو گیا چونکہ اب تک میں نے اس سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں۔ پاروتی ان سے کہیں بہتر ثابت ہوئی تھی وہ ایک مکمل عورت ہے میرے دوست کل سے پہلے میری زندگی قابل رشک انداز میں گزر رہی تھی ہم صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے رفیق تھے۔ مگر کل جب میں سو کر اٹھا تھا تو......

"ہوں" ایک طویل سانس لے کر میں نے کہا "تو پرسوں رات کسی وقت پاروتی کو اغوا کیا گیا ہے؟"

"ہاں منصور۔ اور میری وفادار بیوی آسانی سے ان کے ہاتھ میں نہیں آئے گی۔ بہت ممکن ہے ظالموں نے اس کے احتجاج سے تنگ آ کر اس کا کام تمام کر دیا ہو۔ رام ناتھ پھر سے رونے لگا۔ میں نے اس کی توجہ ہٹائی۔

"رام ناتھ یہ سچ ہے کہ واقعہ بڑا ہی بھیانک اور تکلیف دہ ہے مگر صبر سے کام لو گے تو کوئی راستہ نکل سکے گا اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم ضرور کسی نتیجے پر پہنچیں گے۔" پھر میں نے ایک سوال کر ڈالا۔

"تم یہ کیوں کر کہہ سکتے ہو رام ناتھ کہ پاروتی کے ساتھ اغوا کے وقت زبردستی یا دوسرے لفظوں میں تشدد کیا گیا ہے"

میری بات کا جواب اس نے فوراً ہی نہیں دیا۔ رام ناتھ ایک منٹ کے لئے اندر گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک زیور تھا۔

یہ ایک ٹاپس تھا صرف ایک اور کئی جگہ سے خم کھایا ہوا ٹاپس میرے ہاتھ پر رکھ کر رام ناتھ نے کہا۔

"منصور! صبح کو یہ ٹاپس پاروتی کے بستر پر ملا تھا۔

اس کے علاوہ بستر کی شکنیں ٹوٹے ہوئے بال وغیرہ میری بات کا ثبوت ہیں"

"غالباً آپ لوگ ایک ہی جگہ سوتے تھے؟"

"ایک کمرے میں ہی مگر اس کمرے میں دو مسہریاں ہیں اور چونکہ ہم لوگ قدامت پسند گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے بظاہر میاں بیوی بھی ایک دوسرے سے کافی

لاتعلق سے رہا کرتے تھے' ہماری مسہریوں کے درمیان چار فٹ کا فاصلہ رہتا تھا۔

چونکہ اب موقعہ واردات دیکھنا بھی ضروری تھا' میں رام ناتھ کے ساتھ اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا تو پتا چلا کہ تمام سامان جوں کا توں رکھا تھا' کافی سمجھدار ہو۔ میرے بارے میں کیا تمہیں یقین تھا کہ میں جلد ہی آ جاؤں گا؟"

"کیوں نہ یقین ہوتا جبکہ میں کالج میں تمہاری عادات و اطوار کا بغور مطالعہ کر چکا ہوں"

میں نے اندر داخل ہو کر گہری نظر سے چاروں طرف دیکھا پھر ہنس کر بولا۔

"رام ناتھ ہم کافی دنوں سے الگ ہیں پھر تمہیں کیسے علم تھا کہ میں تمہاری مدد کو اتنی جلدی پہنچوں گا؟"

پھر میں یہ فرض کر کے کہ پاروتی کو اغوا کیا گیا ہے رام ناتھ سے ضروری سوالات کرنے لگا۔ رام ناتھ نے میرے سوالوں کے تسلی بخش جوابات دیئے پھر میں نے چند ایسے سوال بھی کئے جو یقیناً ایک شوہر کی حیثیت سے رام ناتھ کو پسند نہیں آئے ہوں گے اب وہ میری مجبوریوں کو سمجھ رہا تھا میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے اسی طرح کوئی راہ نکال سکتا تھا۔

"مجرم اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ جاتا ہے"

"یہ ایک مقولہ ہے یقین جانئے ہم لوگوں کو ایسے ہی مجرموں سے عموماً واسطہ پڑتا ہے جو اس مقولے کو غلط ثابت کرتے ہیں پاروتی کے اغوا کرنے والے بڑے چالاک قسم کے مجرم ہیں کمرے میں ایسی کوئی چیز نہ تھی جس سے کسی قسم کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ مجرموں نے نشانات مٹا کر ہوش مندی کا ثبوت دیا تھا۔

رام ناتھ سے گفتگو ختم کر کے میں چلنے لگا تو اس نے اصرار کیا میں اس کے گھر پر ہی ٹھہروں۔ مگر یہ بات چونکہ میرے پیشے اور اس وقوعہ کے مفاد میں نہیں تھی۔ اس لئے میں نے اسے خوبصورتی سے ٹال دیا باتوں کے دوران مجھے رام ناتھ نے بتایا کہ پولیس میں بھی رپورٹ درج کرائی جا چکی ہے۔

علاقے کا تھانیدار موقعے کا معائنہ بھی کر گیا تھا لیکن سب کو یقین تھا کہ وہ لوگ کچھ

بھی نہ کر سکیں گے تاہم ایک قانونی فریضہ ادا کر دیا گیا تھا۔

لکھنؤ کے ایک خوبصورت ہوٹل فراز میں ٹھہرنے کے بعد میں نے اسی دن سے کام کی ابتدا کر دی۔

اب میرا رخ کوتوالی کی طرف تھا۔

کوتوال انور حسین نے تعارف کے بعد پورا تعاون کیا مجھے دس نمبر والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ چونکہ پاروتی کی گمشدگی ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی اس لئے پولیس کو کسی حد تک رام ناتھ کے بیان پر بھی شک تھا۔ ان لوگوں کو خیال تھا کہ پاروتی اپنے کسی عاشق کے ساتھ رات کے وقت فرار ہوئی ہے اور چند ایسی چیزیں چھوڑ گئی تھی جس سے لوگ یہی سمجھیں گے کہ اسے اغوا کیا گیا ہے یقیناً اس طرح وہ کافی دور نکل گئی ہو گی۔

میرا اب تک اس کیس کے سلسلے میں اپنا کوئی خیال نہیں تھا۔ میں اس وقت تک رائے قائم کرنے سے گریز کرتا ہوں جب تک کیس کی بنیادی حیثیت مخفیہ راز سے باہر نہ آ جائے۔ اور اب تک میرے خیال سے یہ نکتہ حل نہیں ہوا تھا۔

لکھنؤ میں اغوا کا یہ واقعہ کافی مشہور ہو گیا تھا۔ اب تک یہاں ایک عرصے سے ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی پھر رام ناتھ چونکہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس کی بیوی کا غائب ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی میں نے محسوس کیا پولیس اپنے طور پر اس کیس میں کافی دلچسپی لے رہی ہے۔ مگر مجرم نہایت عیار تھے اب تک پولیس والوں کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔

پولیس کے رجسٹر میں اتفاق سے جتنے ہسٹری شیٹر اور بدنام لوگوں کے بارے میں ذکر تھا ان میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا جس نے ماضی میں اس قسم کی حرکت کی ہو۔ اصل میں ان دنوں لوٹ لینا اور قتل کر دینا معمولی بات سہی مگر اغوا غیر معمولی بات تھی۔ شاید ان مجرموں کا اپنا کوئی اصول ہوا کرتا تھا وہ اصول جس کی رو سے خواتین کی آبرو پر ہاتھ ڈالنا ان جیسے لوگوں کی نظر میں بھی گناہ کی بات تھی۔

کوتوال میرے ساتھ پورا تعاون کرنا چاہتا تھا لیکن خطرناک مجرم کو پھانسنے کے لئے

اس وقت پولیس کی مدد سے زیادہ عقل کے ناخنوں کی ضرورت تھی۔

اس رات ہوٹل فراز کے کمرے میں کافی دیر تک میں اسی ادھیڑبن میں لگا رہا۔

دوسری صبح میرے لئے عجیب و غریب تھی۔

ساڑھے چھ بجے کوتوالی سے فون آیا تھا۔ میں فوراً ہی کوتوالی پہنچ گیا اتنی صبح ہونے کے باوجود تھانے کے سامنے لوگوں کی خاصی تعداد اکٹھی تھی۔

یہ تو مجھے معلوم ہو ہی چکا تھا کہ پاروتی کی لاش رات کو کسی وقت تھانے میں آئی تھی۔

کوتوال انور حسین نے بتایا وہ مجھے رات کے دو بجے جگایا تھا چونکہ پاروتی کی لاش ایک کسان نے اپنے کھیتوں میں دیکھی تھی اس نے گاؤں کے چوکیدار کو مطلع کیا جس نے فوراً ہی تھانے میں اطلاع کی اور یہاں سے ایک گارڈ اسی وقت روانہ ہو گیا۔"

غالباً تھانے سے رام ناتھ کو بھی مطلع کر دیا گیا تھا مجھے آئے ہوئے بمشکل پانچ منٹ ہوئے تھے۔ رام ناتھ اپنے بھائی اور ماموں کے ساتھ تھانے پہنچ گیا اس وقت وہ بہت گھبرایا ہوا اور پریشان نظر آ رہا تھا شاید اس نے مجھے بھی نہیں دیکھا یہ لوگ اس چبوترے کی طرف گئے تھے جہاں پاروتی کی لاش رکھی ہوئی تھی تھانے کے عین وسط میں نیم کے پیڑ کے نیچے یہ چبوترہ کافی کشادہ تھا۔

میں انور حسین سے مصروف گفتگو تھا کہ اچانک ہم نے رام ناتھ کی چیخ سنی۔

"شاید اس نے پاروتی کو پہچان لیا ہے!" انور حسین نے میری طرف دیکھ کر افسردہ لہجے میں کہا۔

"تھانیدار صاحب رام ناتھ نے اس کے ساتھ چند بہترین سال گزارے ہیں۔ اس لئے جس قدر بھی غم کرے بے جا نہ ہو گا" میں نے قدرے پرسکون لہجے میں کہا "یوں بھی اس عالم میں اپنے پرائے سب ہی کو دکھ ہوتا ہے"

تھانیدار نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

"اب آپ نے کیا سوچا ہے منصور صاحب"

"ظاہر ہے جب تک پوسٹ مارٹم نہ ہو جائے میں کیا سوچ سکتا ہوں" میں نے کہا۔

میری بات سن کر نجانے کیوں انور حسین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لکیری

کھنچ گئی۔ اس وقت مجھے اس مسکراہٹ میں طنز کا احساس ہو رہا تھا۔ بالآخر انور حسین نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ وہ دبی زبان میں بولا:

"نئے ڈاکٹرز' نزلے کے علاج سے پہلے فرماتے ہیں چونکہ اس بیماری کا براہ راست تعلق سینے سے ہے اس لئے پہلے سینے کا ایکسرے کرا کے آؤ جب علاج کیا جائے گا اور نئے سراغرساں حضرات کہتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ جائے تب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اس رپورٹ میں مجرم کا کوئی حوالہ نہیں ہو گا"

غالباً انور نے اپنی دانست میں بہت اونچی بات کہہ دی تھی مگر میں اس بچکانہ اور احمقانہ گفتگو کا کیا جواب دیتا۔

رام ناتھ اور اس کے عزیزوں نے ہر چند چاہا کہ پاروتی کی لاش پوسٹ مارٹم کو نہ جا سکے ـــــ ان لوگوں نے ایک موٹی سی رقم بھی اس سلسلے میں بطور رشوت انور حسین کو دینی چاہی مگر ایک جاسوس کی موجودگی میں ظاہر ہے پولیس والے ایسی حرکت کیسے کر سکتے تھے۔ یقیناً اس وقت اس نعمت غیر مترقبہ کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم انور کو شدید ہوا ہو گا۔ اور ممکن ہے وہ دل ہی دل میں مجھے گالیاں بھی دے رہا ہو مگر بظاہر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ اور دس بجے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں جب تک لاش اٹھ نہیں گئی' میں تھانے میں ہی موجود رہا۔

میں نے اپنی آمد کے سلسلے میں بڑی رازداری سے کام لیا تھا۔ یہ بات رام ناتھ کو میں نے آتے ہی سمجھا دی تھی اس کے علاوہ پولیس والوں کو بھی متنبہ کر دیا گیا۔

تیسرے دن رپورٹ کی خاص باتیں مجھے پوسٹ مارٹم کے آفس سے مل گئیں۔ میرا اندازہ اس سلسلے میں کسی حد تک درست ثابت ہوا تھا۔

لاش کے گلے میں پڑا ہوا طلائی لاکٹ اور ایک کان میں ویسا ہی ٹاپس جو مجھے رام ناتھ نے دکھایا تھا اس بات کی مبین دلیل تھی کہ یہ کام جنسی درندے کا ہی ہو سکتا ہے رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مرنے سے چند گھنٹے قبل مقتولہ کے ساتھ منہ کالا کیا گیا تھا اس کے علاوہ ایک اور خاص بات تھی مقتولہ کے ساتھ بدفعلی کے علاوہ انتہائی تشدد بھی کیا گیا تھا۔ مقتولہ کے جسم پر بے جا ایسے نشانات واضح طور پر تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ

کسی ٹھوس چیز سے ضربیں لگا کر اسے اذیت دی گئی ہے۔ ایکسپرٹ کا خیال تھا کہ ضربات کسی آہنی آلے سے لگائی گئی ہیں اور یہ بات میں نے بطور خاص نوٹ کی تھی۔

اب مجھے ایک لائن آف ایکشن مل گئی تھی۔ اس لئے ذہن میں مختلف خیالات منتشر ہو رہے تھے۔ خیالات کے ہجوم کے باوجود میرے سامنے ایک کلیو ضرور تھا۔ بالآخر میں نے اپنے طور پر ان لوگوں سے خفیہ معلومات کیں جو آہنی آلات کی تجارت کرتے تھے اور لوہاروں سے بھی ملا جو لوہے کے مختلف چیزیں بناتے تھے۔

لکھنؤ خاصا بڑا شہر تھا لیکن میں مجرم کو زیادہ ڈھیل دینے کا عادی نہیں۔

میرا خیال ہے مجرم اور قانون میں گاہک اور دکاندار جیسا مقابلہ ہوتا ہے۔ دونوں طرف یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کی اہمیت اور برتری کو تسلیم کیا جائے۔ میں بہرحال قانون کی برتری اور انسانیت کے تقدم کی خاطر کام کر رہا تھا اس لئے میری اسپرٹ مجرم سے کہیں زیادہ تیز ہوگی۔ پھر یہ کہ میں اس کام میں قلبی طمانیت کا احساس پا رہا تھا جب کہ مجرم کے سامنے اس کے برعکس معاملہ ہوگا۔ غالباً وہ کسی رات چین سے سو بھی نہ پاتا ہو گا۔ یہ ایک فطری اور قانون یزدانی بھی ہے ورنہ بدی کو نیکی پر فوقیت حاصل ہو جائے۔

تمام شہر چھان مارا مگر صرف ایک دکاندار سے اتنا معلوم ہو سکا کہ چند دن پہلے ایک شخص نے لوہے کی ایک مخصوص قسم کی سریا خریدی تھی یہ سریا جو صرف تین فٹ کی تھی کافی ہلکی پھلکی تھی چونکہ وہ سادھو قسم کا آدمی تھا۔ اس لئے دکاندار کا یہ خیال تھا کہ اس نے سریا سے چمٹا بنوایا ہو گا۔ میرے لئے اس اطلاع میں بظاہر کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن جو لوگ اس کام سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارے کام میں رموز و اسرار کا بھی ایک مقام ہوتا ہے۔ پھر ہم بات سے بات پیدا ہونے کے بھی قائل ہوتے ہیں۔

اب مجھے اس سادھو کی تلاش تھی جو سیاہی مائل گندمی رنگ اور مضبوط قویٰ کا مالک تھا اور جسم پر صرف ایک دھوتی لپیٹے رہتا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس سادھو کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی دکاندار نے بتایا تھا کہ وہ ان آنکھوں سے ڈر گیا تھا۔ جب ایک بار سادھو نے پیسوں کے سلسلے میں اسے اپنی سرخی مائل آنکھوں سے گھورا تو دکان دار مسحور ہو کر رہ گیا تھا جب اسے ہوش آیا تو سادھو لوہے کی چھڑی لے کر جا چکا تھا۔

دکاندار کی اس اطلاع پر جو میرے لئے بڑی پرکشش تھی اب میں بھی ایک سادھو کے بھیس میں تھا اور لکھنؤ کے مندروں میں درشن کرتا پھر رہا تھا۔ چونکہ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اس لئے کسی قسم کی دشواری بھی نہیں ہوئی۔

سادھو کی تلاش کا تیسرا دن تھا۔ اور ابھی تک اس سادھو کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا کہ اس دن دوپہر کو پھر ایک لاش۔ تھانے میں لائی گئی۔

یہ بھی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ کافی خوبصورت اور تندرست میں نے تھانے میں جب اس لاش کا معائنہ کیا تو مجھے اس میں پاروتی والے کیس سے سرمو کوئی فرق نظر نہ آیا۔ حالانکہ اس لاش کا تعلق لکھنؤ سے نہیں تھا۔ مگر ایک جوان لڑکی کو اس حالت میں دیکھ کر سب ہی افسوس اور حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ مقتولہ لباس سے دیہاتن معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کے لباس کی نفاست اور وضع سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کافی خوش مذاق لڑکی رہی ہوگی۔

انور حسین کافی پریشان تھا اس کی پریشانی بھی بے جا نہ تھی۔ یہ اس کا علاقہ تھا اور اس کی ذمہ داری بھی تھی کہ ان عناصر پر کنٹرول کیا جائے جو سماج میں گندے انڈوں کی طرح تعفن پیدا کر رہے تھے۔

یہ پولیس کے علاوہ میرے لئے بھی ایک تازیانہ تھا۔

مجرم کی ذہانت اور ہماری بے بسی کا ایک کھلا ثبوت۔

بات اتنی آگے جا چکی تھی کہ محض مفروضوں اور اتفاقی حادثات کا بہانہ نہیں کیا جا سکتا تھا پھر اس پر مستزاد یہ کہ پاروتی کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ جیسے ہی شو کی گئی اخبارات والے اس شاندار خبر کو لے اڑے وہ تو اس موقعہ کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ آج کے اخبارات میں پاروتی کے بارے میں ایک خاص خبر شہ سرخی کے ساتھ اخبارات میں چھپی تھی اور میں چند دن بعد پھر ایسا ہی دھماکہ خیز ایک اور خبر کی شہہ سرخیاں دیکھ رہا تھا۔

اس دن انور حسین مجھ سے کافی مرعوب نظر آ رہا تھا اب وہ مجھ سے کام نکالنا چاہتا تھا۔ اس نے غالباً مصنوعی خوشامد کا مظاہرہ کیا۔

"منصور صاحب خدا کے لئے اس کم بخت کو جلد از جلد بیڑیاں پہنائیے۔ ورنہ وہ

دن بھی جلدی آنے والا ہے جب آئی جی میرا کورٹ مارشل کردے گا۔"

"میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں کوتوال صاحب" میں نے کہا۔

"یقیناً آپ کی طرح گوشت پوست کا ایک حقیر سا آدمی ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس مصیبت سے کبھی چھٹکارا نہ پاسکیں گے لیکن کوئی معجزہ ہو جائے گا۔ کم از کم مجھے اس کی توقع نہیں ہے"

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس مقتولہ کے بارے میں بھی وہی تھی جو پاروتی کے لئے۔ مجھے تو خیر پہلے ہی اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس دن سے میری سرگرمیاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں یوں اب تک میں تقریباً تمام غنڈوں کے بارے میں معلومات حاصل کر چکا تھا انہیں چیک بھی کر چکا تھا۔ مگر شہر کا کوئی بدنام شخص اس قسم کی حرکت سے متعلق بظاہر نظر نہ آتا تھا۔

تین چار دن گزر گئے اور میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ مگر ایک دن پھر ایک بار مجھے ایک لاش کے معائنے کے لئے تھانے جانا پڑا۔ اس دن انور حسین کی حالت دیدنی تھی وہ سخت پریشان تھا۔ اس نے ڈپٹی صاحب کا آرڈر میرے سامنے کرتے ہوئے کہا:

"منصور صاحب اب تو بوریا بستر بندھنے ہی والا ہے"

"ہر انسان ایک مسافر ہے کوتوال صاحب! اور ہم پھر مسلمان ہیں" اس نے قطع کلام کر کے کہا۔

"یہ مذاق پھر کبھی سہی۔ میں بہت سنجیدہ ہوں براہ کرم کچھ کرو"

اس دن انور نے شہر اور بیرون شہر پولیس کے حفاظتی عملے میں خاصا ردو بدل کیا۔ اس نے مجھ سے مشورہ کر لیا۔ لیکن مجھے اطمینان نہیں تھا کہ اس طرح کچھ تدارک ہو سکے گا۔ جب تک وہ بدمعاش سادھو نہ مل جائے۔

اور جب میں تھانے سے نکل کر یوں ہی شہر کے معروف علاقے کی طرف جا رہا تھا میں نے ایک سادھو کو دیکھا اور میں بری طرح چونک پڑا۔ بالکل وہی تھا جس کے بارے میں اب تک میں نے نہ معلوم کتنے خیالی قلعے تعمیر کر رکھے تھے۔

وہ مناسب رفتار سے چل رہا تھا اور دنیا سے لاتعلقی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ سادھو کے

چوڑے چکلے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی اور پنڈتوں کے انداز میں گلے میں جینو (مالا) ڈالے ہوئے تھا۔ اس مالا کے نچلے حصے میں خلال کرنے والی تیلی تیلی لٹکی ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں۔ ان پھلیوں کے ساتھ چند چابیاں بھی تھیں۔

ایک سادھو جو تارک الدنیا لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے اس کی مالا میں ان چیزوں کا پایا جانا بذات خود ایک چونکا دینے والی چیز ہے میرا اس طرف متوجہ ہو جانا بالکل فطری سی بات ہے۔

عام خیال میں یوں لگتا تھا جیسے میں نے اس عفریت پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔ جو اب تک صرف اسی علاقے میں تین جواں عورتوں کے ساتھ درندگی کا مظاہرہ کر چکا تھا اور خود اب تک نہایت اطمینان کے ساتھ جیل کی سلاخوں سے بچ کر مزے سے گھوم رہا تھا۔

میں نے سادھو کا تعاقب اس انداز میں جاری رکھا تھا وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ حضرت گنج کے اس مصروف علاقے میں وہ یوں بھی میری طرف سے مشکوک نہیں ہو سکتا تھا ہم آگے پیچھے چلتے رہے یہاں تک وہ چار باغ والی سڑک پر نکل آیا۔ اس طرف یوں تو ٹریفک کا خاصا زور رہتا ہے مگر پیدل چلنے والوں کی کمی پائی جاتی ہے۔

میرا اندازہ کسی حد تک درست ہو سکتا تھا۔

سادھو اب اسی طرف جا رہا تھا۔ جہاں بیرون شہر کے لئے سڑکیں ملتی تھیں۔ مگر کچھ دیر بعد میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ آج کسی نئے شکار کی تلاش میں ہے۔

سادھو کی بھٹکتی ہوئی چور نگاہیں مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ وہ اچانک مینا بازار والی سڑک پر ہو لیا۔ پھر ادھر سے اس کا رخ لکھنؤ کے عالی شان ریلوے اسٹیشن چار باغ کی جانب ہو گیا تھا۔

سادھو کافی دیر تک اسٹیشن کے مختلف حصوں میں بے مقصد گھومتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اس شخص کو یہاں کسی سے ملنا تھا مگر یہ خیال بس خیال ہی رہا۔

سادھو پلیٹ فارم سے نکل کر اعلیٰ قسم کے ویٹنگ روم میں چلا گیا مجھے دور ہی سے اس کی حرکات کا محاسبہ کرنا تھا۔ اس لئے ایک پر سکون مگر محفوظ مقام پر رک گیا۔

سادھو یکے بعد دیگرے کئی انتظار گاہوں کا سرسری معائنہ کر کے ریلوے کی پٹڑیوں

کی طرف نکل گیا۔

اب تعاقب کا مسئلہ بڑا گھمبیر ہو گیا تھا مگر بہر حال اب بھی وہ نظر آ رہا تھا۔ اس لئے میں نے تعاقب جاری رکھا۔

اسٹیشن سے کافی دور نکل آنے کے بعد اسی جگہ تک جہاں ریلوے ورکشاپ کی بڑی عمارتیں ہیں تعاقب میں آسانی رہی مگر بعد میں اس بات کے امکانات بہت واضح تھے کہ سادھو تعاقب کا راز پا جاتا۔

ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ سادھو نے پھر سے راستہ بدل دیا۔ ورکشاپ کی عمارت کے قریب سے ہی وہ گومتی روڈ کی جانب مڑ گیا۔ اس طرف مندر اور ہندو آبادی کا گنجان علاقہ قریب ہی میں واقع تھا۔ اب مجھے یہ سوچنا تھا کہ کیا یہ وہی شخص ہے ہو سکتا ہے یہ کوئی محض بھکاری ہو۔ اور اتفاق سے میں اسے اپنا شکار سمجھ بیٹھا ہوں لیکن اتنی محنت کے بعد اسے ہاتھ سے کھو دینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں اس کے گلے میں پڑی ہوئی مالا اور مختصر سی جھولی کا راز جاننا چاہتا تھا جسے سادھو سنتوں کی زبان میں کنی کہا جاتا ہے۔

گومتی روڈ پر سادھو صرف ایک مندر میں گیا۔ اور یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ وہ مندر قطعی ویران تھا جب سادھو دروازے سے نکل کر کافی آگے بڑھا تو میں نے ایک نگاہ میں سمجھ لیا کہ مندر ویران ہے اور اس میں صرف ایک بت ہے' کالی دیوی کا بھیانک چہرہ میرے سامنے تھا اور اب میرے شک کو مزید تقویت پہنچ رہی تھی۔

—O—

گومتی روڈ میں کافی چہل پہل تھی۔ وہ سادھو سب سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن سڑک پر چل رہا تھا۔ اس کی نگاہیں عموماً مکانات کے کھلے دروازوں اور بالا خانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

پھر میں نے اسے ایک مختصر پارک میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ شواجی پارک تھا۔

شواجی پارک میں اس وقت زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی عموماً شام کو یہاں قرب و جوار کے لوگ آتے ہوں گے اس وقت ہجوم ہو جاتا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے۔ لیکن موسم میں ہلکی سی خنکی اور گرمی کا امتزاج موجود تھا۔ اس موسم بہار سے لطف اٹھانے کے

لئے پارک میں بچے کافی تعداد میں جمع تھے۔

پارک کے کنارے پر کیاری کی اونچی باڑھیں موجود تھیں۔ ان روشوں کی وجہ سے اندر کے لوگوں کا پردہ ہو گیا تھا۔ مگر میں نے روش کے قریب سے اندر جھانکا سادھو مجھے ایک بنچ پر بیٹھا ملا وہ کسی طرف بغور دیکھ رہا تھا میں نے جب اس طرف نگاہ کی تو یہ سڑک کے پار والی رو میں مکانات کے ایک بالائی حصے کا چھجہ تھا جہاں ایک خوبصورت سی نوجوان لڑکی دھلے ہوئے کپڑوں کو سکھانے کے لئے رسی کی الگنی پر کلپوں کی مدد سے لٹکا رہی تھی۔

اب شک و شبے کی کوئی بات نہیں تھی۔ مگر میں اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔

یوں تو وہ بہت ہی آسان بات ہوتی اگر میں تھوڑی دور پر موجود ایک کانسٹیبل کو ارجنٹ پیغام کے ساتھ کوتوالی کو روانہ کر دیتا جہاں انور حسین میرے ایک اشارے کا بے چینی سے منتظر ملتا۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی بھی غور سے ادھر دیکھنے لگی۔

"وہ کسے دیکھ رہی ہے" میں نے خود سے سوال کیا اور پھر مجھے جواب بھی مل گیا۔

لڑکی ایک ٹک سے سادھو کو دیکھے جا رہی تھی۔

ذرا دیر بعد جب سادھو پارک سے چلنے لگا تو میں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر خود کو ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں سے میں سادھو پر نظر رکھ سکتا تھا۔ یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ اب تک اس شیطان کو میری طرف سے کوئی شک نہیں ہوا تھا۔ اور ہوتا بھی کیونکر جب کہ میں بالکل سادا سا آدمی تھا اور اب تک کامیابی سے خود کو اس کی خونخوار نظروں کی زد سے بچاتا چلا آیا تھا۔

پھر سے تعاقب کا سلسلہ شروع ہوا تو ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ سادھو گومتی کے کنارے کالی کے مندر میں چلا گیا۔ اور اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا تھا۔

اس طرف اشنان کے گھاٹ اور شمشان ہی تھے مگر اس وقت بھی کافی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔

مندر کے قریب رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لئے میں اس اشنان گھاٹ کی طرف چلا آیا۔ جو کالی کے ویران مندر سے نزدیک ہی تھا۔ یہاں اشنان کرنے والوں کے

علاوہ نہاتی عورتوں کے اجسام کا جائزہ لینے والوں کی بھی ایک مختصر سی تعداد موجود تھی۔

کہتے ہیں جب کام بننے والا ہوتا ہے تو قدرت اسباب پیدا کر دیتی ہے اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے کچھ دیر بعد دو سپاہیوں کو دیکھا۔ ان سے بات کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ میں ان کے قریب پہنچا اور ایک سپاہی سے علیک سلیک کی۔ تو وہ فوراً ہی متوجہ ہو گیا۔ اس نے سوچا ہو گا ضرور اس شخص سے کچھ کام بن سکے گا۔ مگر جب میں نے اس کے ہاتھ میں ایک مختصر سا پرچہ دیا اور کہا کہ اسی وقت کوتوال صاحب کو دینا ہے تو وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگا۔ مگر بالآخر اسے مجبور ہونا پڑا۔ جلد ہی وہ مجھ سے متاثر نظر آنے لگا تھا۔

دوسرے سپاہی سے اس نے میرے بارے میں کچھ سرگوشی کی اور روانہ ہو گیا۔
اس کے بعد میں بے تعلق ہو گیا اور گومتی میں نہانے والوں کی منظر کشی کرنے لگا۔ اس وقت میں خود کو فلم کا ایک منجھا ہوا ڈائریکٹر سمجھ رہا تھا اور جب ڈائریکٹر کے سامنے اس قدر فطری لوکیشن ہو تو پھر وہ شاٹ پر شاٹ لئے چلا جاتا ہے۔

نصف گھنٹہ گزر گیا۔ میں اس وقت چونکا جب انور حسین نے میرے شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔

انور اس وقت سادہ کپڑوں میں تھا میں نے اسے لکھا بھی یہی تھا۔

ہم دونوں کچھ ہٹ کر ایک نسبتاً پرسکون گوشے میں چلے گئے گوشہ میں نے غلط کہا۔ یہ کنارے اور اوپری سطح کا درمیانی حصہ تھا مگر اس طرف اشنان کرنے والے نہیں تھے۔

"کوئی اچھی خبر سناؤ منصور! یقیناً تم نے ـــ پھر انور میرا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے" میں نے کہا "تم اس خبر پر اچھل پڑو گے اگر میں یہ کہوں کہ ملزم اس وقت میری مٹھی میں ہے" میں نے اپنی مٹھی اس کے آگے کر دی۔

انور شاید اسے میرا مذاق سمجھا۔ مگر اس نے میری مٹھی کھولنے کی کوشش نہیں کی۔

مختصر الفاظ میں انور حسین کو میں نے چند خاص باتیں بتائیں اور رات کو اس علاقے میں زبردست پہرے کی تاکید کی۔ ساتھ ہی اپنے ساتھ کے لئے چند کانسٹیبلوں کی فرمائش کر ڈالی۔ انور اتنا بے صبر تھا کہ وہ خود ہی میرے ساتھ رہنے پر بضد ہو گیا۔

وہ شام کے بعد آنے کا وعدہ کر کے بقیہ انتظامات کی تکمیل کے لئے کوتوالی روانہ ہو گیا۔

دھیرے دھیرے شام ہو گئی مگر سادھو مندر سے باہر نہیں نکلا مجھے ہلکی سی حیرت ضرور تھی مگر یقین بھی تھا وہ ضرور برآمد ہو گا مندر سے نکل کر وہ واحد راستہ تھا جہاں ایک یادگاری مٹھ میں بیٹھ کر میں مندر کی نگرانی کر رہا تھا۔

یہ مٹھ اتنا کشادہ تھا کہ میں اس میں بخوبی سما گیا اور اندھیرا پھیل جانے کی وجہ سے اب سب کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

سادھو ٹھیک بارہ بجے مندر سے نکلا۔ وہ چوڑا بھوت معلوم ہو رہا تھا۔

چونکہ اندھیرا اتنا نہیں تھا کہ وہ نگاہوں سے روپوش ہو جاتا۔ اس لئے میں اسے ٹھیک اسی راستے پر آتا ہوا دیکھ رہا تھا جو شواجی پارک جانے کا واحد ذریعہ تھا۔

جب وہ کافی دور نکل گیا تو مجھے بھی اس پناہ گاہ کو خیرباد کہہ دینا پڑا۔ تعاقب پھر شروع ہو گیا میرا خیال درست ہی نکلا۔ سادھو پارک کے دروازے پر کھڑا تھا اس بار بھی اس کی نگاہیں اسی چھجے کی طرف تھیں جہاں دن کے وقت میں ایک لڑکی کو اس کی طرف متوجہ دیکھ چکا تھا۔

چند منٹ کے بعد ہی سادھو سڑک پار کرنے لگا اس کے عین سامنے والی اندھیری گلی سے میں بخوبی سادھو کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ دور سے میں نے ایک سایہ لرزتا ہوا دیکھا۔ یہ سایہ سیڑھیوں سے اتر کر سڑک پر آ گیا اور غور سے دیکھنے پر معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی لڑکی ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے بکھرے ہوئے بال ہلکی تاریکی میں گھٹاؤں کی طرح لہرا رہے تھے۔ لڑکی ایک لمحے کو سادھو کے قریب آ کر رکی اور پھر وہ دونوں اسی طرف آنے لگے جہاں میں کھڑا تھا۔

قرب و جوار میں مکمل تاریکی تھی۔ شاید اس رات علاقے میں بجلی فیل ہو گئی تھی۔
میں گلی میں آگے چل کر دوسری ملحق سڑک پر آ کر دیوار سے لگ گیا اب دونوں سائے قدم بقدم میری طرف ہی آ رہے تھے۔ جب فاصلہ بتدریج کم رہ گیا تو میں تیزی سے اس ذیلی سڑک پر کافی آگے نکل کر ایک مکان کے سائبان میں خود کو چھپانے میں کامیاب ہو

گیا۔

دونوں سائے بڑھتے رہے۔ وہ لوگ کالی کے اسی مندر میں میرے سامنے ہی داخل ہوئے اور پھر سے دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔ میں بعجلت تمام مندر کے قریب پہنچ گیا۔ بے آواز چلتے ہوئے میں نے چند سیڑھیاں طے کیں اور پھر کواڑوں کی درز میں آنکھ لگا کر اندر جھانکنے لگا۔ اندر موم شمع کی روشنی میں سادھو اور وہ لڑکی صاف نظر آ رہے تھے۔

میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی کافی خوفزدہ تھی حیرت سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ سادھو اس طرف گھورے جا رہا تھا۔ اور یہ خوف شاید اس کے مسلسل گھورنے کی وجہ سے ہی لڑکی کے چہرے پر ہویدا ہوا تھا۔

اچانک سادھو نے کالی مائی کی جے کا نعرہ لگایا۔ آواز گھٹی گھٹی سی تھی مگر دبنگ تھی اس نے جھک کر وہ جھولی اٹھائی جو گلے سے اتار کر وہ زمین پر رکھ چکا تھا۔

دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ سادھو کے ہاتھ میں ایک درانتی چمک رہی تھی جی ہاں اس درانتی کی دھار اتنی تیز تھی کہ شمع کی روشنی میں بھی چمک اٹھی تھی۔ یہ ایسی ہی درانتی تھی کہ جسے کسان لوگ فصل کاٹنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

خلاف توقع درانتی سادھو کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ لڑکی نے جوں ہی چمک دار ہتھیار کو دیکھا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ مگر سادھو نے اس پر حملہ کرنے کی بجائے اپنے ہاتھ کی ایک جنبش سے درانتی کو اپنی گردن پر چلا دیا۔ اور میرے سامنے اس کا گلا کھیرے ککڑی یا صابن کی ٹکیہ کی مانند کٹتا چلا گیا۔

سر جسم سے علیحدہ ہو کر پہلے تو فضا میں معلق ہو گیا اور پھر دیوی کے قدموں میں لڑھکنے لگا۔

خوفزدہ لڑکی برابر چیخ رہی تھی مگر اس کی چیخیں صرف میں ہی سن رہا تھا قرب و جوار میں دور دور تک کوئی نہیں تھا میں چونکہ سادھو کو شروع ہی سے شعبدہ باز سمجھ رہا تھا اس لئے میرے جسم میں خوف کی لہریں اپنا پورا کام نہیں کر رہی تھیں۔

سادھو کی کٹی ہوئی گردن سے جیتا جاگتا خون بہہ رہا تھا۔ اور گردن کٹ جانے کے باوجود دارنتی اب تک اس کے ہاتھ میں تھی وہ یوں ہی لڑکی کے سامنے آ کھڑا تھا۔ حالانکہ

جسم کو سہارا دینے کے لئے اس طرف کوئی چیز بھی نہیں تھی۔

کئی منٹ بعد سادھو نے لڑکی کی طرف بڑھتا ہوا اپنا دایاں بازو دیوی کی طرف کیا اور اسی وقت اس کی جدا کی ہوئی کھوپڑی جو دیوی کے چرنوں میں اب تک پڑی تھی منتر جاپ کرنے لگی۔ میں اس کی آواز سن رہا تھا یقیناً میرے لئے دنیا کا آٹھواں عجوبہ تھا۔

چند منٹ بعد ہی چرنوں سے کھوپڑی بلند ہو کر کئی بار دیوی کے اوپر منڈلائی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ دیوی کے بھیانک چہرے پر محبت کی نرمی آ گئی تھی۔

کھوپڑی ہوا میں معلق ہو کر دھیرے دھیرے سادھو کے جسم کی طرف بڑھتی رہی یہاں تک کہ وہ کٹی ہوئی گردن پر آ کر اٹک گئی۔ اب یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کبھی یہ گردن کٹی نہ ہو۔ سادھو بھلا چنگا اپنی خونخوار نظروں سے اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"دیکھا مورکھ۔ میری شکتی۔! میں دیوی ماتا کا مہان بھکشو ہوں اب تو دیوی کی بلی کے لئے تیار ہو جا"

یہ کہہ کر سادھو نے اپنی جھولی میں سے لوہے کی ایک گز بھر کی سریا نکالی اور پھر وہ بے دردی سے اس متوحش لڑکی پر ضربیں لگانے لگا۔ ہر ضرب پر لڑکی بے اختیار ہو کر تڑپ اٹھتی تھی زیادہ چیخنے سے اب اس کی آواز زیادہ بھرانے لگی تھی۔ میں اس ظلم کے خلاف اپنی جگہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ لیکن میں اس ڈرامے کو آخری مراحل تک دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے خاموشی سے ضبط کئے رہا۔

اس وقت میں نے اپنے قریب چند سائے دیکھے یہ انور حسین اور اس کے ماتحتوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

سادھو جب زدو کوب کرتے کرتے تھک گیا اور لڑکی نڈھال ہو کر بے سدھ سی ہو گئی اس وقت وہ درندہ اسے روندنے کے لئے تیار ہو گیا۔

وہ اپنی اکلوتی دھوتی کی گرہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے ایک زوردار لات مار کر اس بوسیدہ دروازے کو توڑ دیا۔ ہم سب بھرا مار کر مندر میں داخل ہو گئے۔ میں نے جاتے ہی درانتی پر اور انور نے سادھو پر ہاتھ ڈال دیا۔

انور حسین نے جب اس بدکار کا چالان کر کے عدالت روانہ کیا تو پورے شہر میں

دھوم مچ گئی۔

ہزاروں لوگ اس کی صورت دیکھنا چاہتے تھے مگر عدالتی کارروائی سے پہلے لوگوں کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

عدالت میں اس شخص نے ایک سنسنی خیز بیان دیتے ہوئے کہا۔

"میں ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ ماں بچپن میں فوت ہو گئی تھی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اسی دن سے میری زندگی کا سیاہ باب شروع ہوا مجھے لڑکپن میں یہ احساس دلایا گیا کہ ہر شخص مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ ماں کے طرز عمل کا باپ نے کبھی محاسبہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ الٹا مجھ سے ناخوش رہنے لگا اسی طرح میں جوان ہو گیا۔ میری تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ اچھی ملازمت کیونکر ملتی ایک شراب کے ٹھیکے پر نیلم بوائے ہو گیا۔ گھر سے قطع تعلق ہو چکا تھا۔

ان دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں نے ایک لڑکی کو دیکھا وہ بڑی من موہنی تھی۔ شیلا سے میری ملاقات بہت جلد محبت میں بدل گئی۔ مگر ایک دن جب اسے معلوم ہوا کہ میں نرا پھکڑ ہوں اور گھر والوں کا معتوب تو اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ میں نے اس کی بے حد خوشامد کی۔ ہر قسم کا اطمینان دلایا۔ مگر اس نے سماج اور ماتا پتا کا بہانہ کر کے مجھ سے کنارہ کشی کر لی۔

اس دن کے بعد میں ہر دروازے پر اپنے جذبات کا کشکول لئے پھرا مگر کسی نے میری طرف بھیک دینا تو درکنار میری طرف نظر بھر کے دیکھنا گوارا نہ کیا۔

تنگ آ کر ایک دن میں نے تارا بائی کے کوٹھے کی راہ لی یہ خوبصورت طوائف بڑی شرافت سے پیش آئی میں اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اس کی نگاہ کرم کے لئے خرچ کرنے لگا۔

مگر ایک روز اس طوائف نے محض اس لئے مجھے محفل سے نکل دیا کہ اس کی ایک موٹی آسامی سے میری تو تو میں میں ہو گئی تھی حالانکہ میں اس کا پرانا شیدائی تھا۔

ان دنوں جب میں خودکشی کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو میری ملاقات ایک دیوی ماتا کے بھگت سے ہو گئی۔ میری منو کامنا پوری ہونے کا' سمے آ پہنچا۔ اس بابا نے مجھے ایک منتر جاپ کرنے کا طریقہ بتایا۔

تین ماہ دس دن تک میں نے یہ منتر جاپ کیا۔ اس کے بعد دیوی نے مجھے درشن دیئے اور ایک درانتی اس نے مجھے خود عطا کی۔ یہ اس کی آشیرباد تھی۔ اس کے لئے مجھے بلی دینا بھی ضروری تھا۔ اس لئے میں نے اپنی پیاس بجھانے کا طریقہ سوچ لیا۔

میں دیوی کی شکتی سے   توں کو سحر میں مبتلا کر کے اسی مندر تک لانے لگا ان سے اپنی پیاس بجھا کر انہیں ڈنڈوت کرنے بہت خوش ہوتا تھا اور پھر ان کے خون سے دیوی کی قربانی پوری کر دیتا تھا۔"

کچھ دن بعد اس خطرناک مجرم کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔

اصول کی بات

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں تھا کہ میکشاں جیسی حسین اور تر و تازہ لڑکی' اور شہریار جیسا نوجوان پورے قصبے میں کوئی نہیں تھا۔ میکشاں کی روشن آنکھوں' تر و تازہ ہونٹوں' دلکش مسکراہٹ کی کوئی مثال نہیں تھی تو شہریار کے چوڑے چکلے بدن' چیتے کی طرح پتلی کمر اور وجیہہ چہرے اور نیلی آنکھوں کی پوری بستی میں مثال نہیں ملتی تھی۔

دونوں کے والدین کھاتے پیتے لوگ تھے۔ لیکن جب سے میکشاں کی منگنی شہریار سے ہوئی تھی دونوں ہی فکرمند تھے اکثر دونوں مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔

میکشاں اکثر کہتی تھی:

"شہریار' کیا شادی کے بعد بھی تم اسی بستی میں زندگی بسر کرو گے' کیا ہم دونوں بھی زندگی کے شب و روز اسی انداز میں گزاریں گے جس طرح ہمارے والدین گزارتے رہے ہیں۔ میری خواہشات کچھ اور تھیں شہریار میری سہیلیاں اکثر کہتی تھیں کہ میں جس قدر حسین ہوں اس کو مدنظر رکھتے ہوئے تو مجھے کسی بہت بڑے شخص کی شریک حیات ہونا چاہئے' جس کی رہائش سوئزرلینڈ میں ہو' جس کا کاروبار امریکہ اور پیرس میں ہو' جس نے تبدیلی آب وہوا کے لئے وینس کی کسی آبی شاہراہ کے کنارے ایک خوبصورت کوٹھی بنوا رکھی ہو۔ تمہارے پاس تو یہ سب کچھ نہیں ہے شہریار' تم مجھے کس طرح خوش رکھ سکو گے میرے خواب کیسے پورے کرو گے"؟

"میں بھی تمہارے لئے یہی سب کچھ چاہتا ہوں میکشاں' لیکن بدقسمتی' میرے وسائل محدود ہیں۔ لیکن میری جان کیا میری محبت تمہارے لئے کافی نہیں ہے' کیا تم مجھ

سے پیار نہیں کرتیں؟"

"اگر میں تمہیں نہ چاہتی شہریار' تو تم سے منگنی پر کیسے راضی ہو جاتی' سچ مانو تو یہ تمہاری محبت ہی تھی جس کی وجہ سے میں نے تمہیں جیسے ہو اور جس حال میں ہو قبول کر لیا تھا۔"

"تو پھر فکرمند کیوں ہو میری روح! ہم شادی کرنے کے بعد کچھ وقت باہر گزاریں گے' پرفضا اور پرسکون مقام پر ہنی مون منائیں گے' وہاں ہمارا ذہن آزاد ہو گا' ہمیں سوچنے کے بہتر مواقع میسر ہوں گے اور ہم بہتر طور پر مستقبل کے بارے میں سوچ سکیں گے۔"

"تم مستقبل میں مستقبل بنانے کی باتیں کرتے ہو شہریار' حالانکہ ہمیشہ حال میں مستقبل کے بارے میں سوچا جاتا ہے۔"

"تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟" شہریار جھنجلا کر کہتا۔

"یہی کہ تم جدوجہد کرو' کچھ کرو' کچھ سوچو اور وہ سب کر ڈالو جو میری خواہش ہے۔"

"صرف سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا میکشاں' راستے سامنے ہونے چاہئیں۔"

"تو تم راستے تلاش کرو۔"

"کہاں تلاش کروں' تمہیں معلوم نہیں میں دن رات اسی فکر میں ہی غلطاں رہتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تمہاری ذہنی صلاحیتیں محدود ہیں۔"

"یونہی سمجھ لو۔" شہریار جھنجلا اٹھتا۔

"اوہ معاف کرنا شہریار' تمہاری دل آزاری مقصود نہیں تھی۔"

میکشاں کو ایک دم شہریار کی جھنجلاہٹ کا احساس ہو جاتا اور پھر یہ جھنجلاہٹ میکشاں کے ہونٹوں کا ایک رس بھرا بوسہ ہی دور کرتا تھا۔

تو اس دن وہ دونوں آقائے محمودی کے ہاں دعوت میں شریک تھے۔ صرف وہ دونوں نہیں بلکہ ان کے والدین بھی اس دعوت میں موجود تھے' بلکہ دعوت ہی انہیں دی گئی تھی معہ اہل و عیال' اور اہل و عیال موجود تھے۔ بستی کے تقریباً سارے ہی معززین

جمع تھے۔ آقائے محمودی کی صاحبزادی نے طویل علالت سے نجات پائی تھی اور یہ اس کی رسم صحت تھی۔

چاروں طرف قہقہے پرواز کر رہے تھے۔ گلاس کھنک رہے تھے ویسے بے شمار حسین آنکھیں شہریار کے گرد رقصاں تھیں' بے شمار بھوکی نگاہیں میکشاں کے حسین رخساروں پر پھیل رہی تھیں۔

دونوں قسم کی آنکھوں میں رقابت تھی۔ کچھ شہریار سے برگشتہ تھیں اور کچھ میکشاں سے ایسی بھی تھیں جو اس حسین جوڑے کو تحسین آمیز انداز میں دیکھ رہی تھیں۔ اس کی درازی عمر کی دعا کر رہی تھیں۔ سوچ رہی تھیں کہ بلاشبہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ شہریار نہ ہوتا تو میکشاں کا حسن تنہا ہوتا' اور میکشاں نہ ہوتی تو شہریار کی وجاہت بیکار تھی۔ یوں یہ جوڑا ہر تقریب میں یکساں مقبولیت رکھتا تھا۔ چونکہ دونوں کی نسبت ہو گئی تھی' اس لئے ان کے یکجا ہونے پر کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔

چنانچہ اس وقت بھی چند لڑکوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں وہ دونوں بھی بیٹھے ہوئے تھے' ہر شخص اپنے طور پر مصروف تھا' تقریباً سارے مہمان آ چکے تھے۔

لیکن نہیں —— بڑے ہال کے دروازے میں ایک اور آنے والا نظر آیا۔ اور یقیناً وہ ایسی ہی شخصیت تھی کہ ایک لمحے کے لئے ہال میں آوازوں کی گنگناہٹ ختم ہو گئی۔ سب آنے والے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ ایک تومند اور کسرتی جسم کا مالک شخص تھا۔ جسم پر بھورے رنگ کی جیکٹ تھی۔ اور اسی رنگ کی چست پتلون پہنے ہوئے تھا۔ جیکٹ کے کھلے ہوئے بٹن کی وجہ سے اس کے سینے کا اوپری حصہ نظر آ رہا تھا جو آگے سے کافی ابھرا ہوا تھا۔ اس کے سڈول بازو اور موٹی پنڈلیاں بھی نمایاں تھیں۔ مجموعی حیثیت سے اس کا حلیہ امریکن گوالوں کا سا تھا۔ جس کی رہی سہی کسر اس کا عجیب ساخت کا ہیٹ اور کمر سے لٹکا ہوا قدیم طرز کا لمبی نال والا پستول پوری کر دیتا تھا۔

"آخاہ —— ہشام بعدی' میرے آنے والوں میں تمہارا نام سرفہرست ہے۔ اس لئے ہمیں تمہارے اس وقت پہنچنے سے حیرت نہیں ہوئی ہے۔" آقائے محمودی نے اس

کے استقبال کے لئے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میرے اصول آقائے محمودی' کیا مہمانوں کا آخری آدمی آ گیا۔"؟

"ہاں' اور وہ تم ہی ہو۔"

"اوہ۔ بہرحال آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی آقائے محمودی' کہ میں نے دیر کے یہ لمحات بھی فلاح کے کام پر صرف کئے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں تم بااصول انسان ہو۔" آقائے محمودی نے کہا اور وہ ان کے ساتھ چلتا ہوا دوسرے لوگوں کے پاس پہنچا۔ ان کے قریب پہنچ کر وہ جھکا' اور پھر ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔

"کسے تلاش کر رہے ہو ہشام؟" آقائے محمودی نے پوچھا۔

"ہسابینا کو' جس کی صحت پر میں اسے مبارک باد دوں گا۔"

"اوہ —— وہ سامنے موجود ہے۔" آقائے محمودی نے لڑکے اور لڑکیوں کے ایک جھرمٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ہشام بعدی اس طرف بڑھ گیا۔

لڑکے اور لڑکیاں سنبھل کر بیٹھ گئے' بہرحال وہ ایک بڑے آدمی سے ہمکلام ہونے جا رہے تھے۔

"گو بیماری جسمانی اعضاء کی اوورہالنگ کا کام دیتی ہے' ایک بار بیمار ہونے سے بہت سے اجزا جو زنگ خوردہ ہو گئے ہوتے ہیں' پھر سے نکھر آتے ہیں' تاہم اسے برا سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کو تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے' چنانچہ اس تکلیف سے نجات پانے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کرو ہسابینا۔"

"شکریہ ہشام۔" ہسابینا نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے لئے ایک سیٹ مہیا کر دی۔

"نہیں شکریہ' میں اپنے ہم عمروں میں بیٹھوں گا۔"

"لیکن تمہاری باتیں ہمارے لئے بھی دلچسپ ہوتی ہیں ہم تمہارے ساتھ کمپنی چاہتے تھے۔"

"ان لوگوں کے پاس کچھ وقت گزارنے کے بعد۔" ہشام بعدی بولا۔

"اوہ۔ ہم انتظار کریں گے۔"

"میں وعدہ ایفا کروں گا۔" ہشام جھکا اور پھر ان لوگوں کی طرف واپس چلا گیا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور پھر جب وہ آقائے محمودی کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو نوجوان فریدوں نے کہا۔

"یہ شخص بھی درحقیقت بے حد پراسرار شخصیت کا انسان ہے۔"

"اور دلکش بھی۔" ایک لڑکی نے تبصرہ کیا۔

"لیکن نہ جانے کیوں اس نے خود پر بزرگی مسلط کر لی ہے۔ میرے خیال میں اس کی عمر چالیس سال سے کسی طرح زیادہ نہیں ہے۔"

"اس سے زیادہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اور پھر ابھی کنوارہ بھی ہے۔"

"ہاں لیکن وہ خود کو نوجوانوں کی عمر سے دور کا سمجھتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس کے جسم میں کوئی بوڑھی روح حلول کر گئی ہے۔" ایک نوجوان نے ہشام کے تذکرے سے بیزار ہو کر کہا۔

"بوڑھی روح کسی طور نہیں کہی جا سکتی' اس کے عزائم نوجوانوں سے زیادہ بلند ہیں۔" ایک لڑکی نے اس کی طرفداری کی۔

"اور اس نے بلاشبہ عام نوجوانوں سے کہیں زیادہ جوانمردی کا ثبوت دیا ہے' اس کی داستان حیات نوجوانوں کے لئے سبق ہے۔"

دوسری لڑکی نے کہا۔

"بیشک ——— بیشک ———" بہت سی آوازوں نے تائید کی۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ بستی کی دوسری مقبول ترین شخصیت ہے' میرا مطلب ہے مردوں میں۔"

"بلکہ ایک لحاظ سے پہلی۔"

"وہ کس طرح؟"

"پہلی شخصیت تمہارے خیال میں شہریار ہو گی۔"

"یقیناً ——— اس سے کسے انکار۔"

"بلاشبہ شہریار ایک خوبصورت نوجوان ہے' لیکن وہ اعلیٰ صفات کا مالک نہیں ہے' قدرت نے اسے حسن بخش دیا ہے۔ اس میں اس کا کوئی کمال نہیں ہے' دوسرے معاملات میں وہ صفر ہے۔ جبکہ ہشام بعدی مردانہ جدوجہد کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے۔" لڑکیوں نے تائید کی۔

اور بلاشبہ اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ ہشام بعدی عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا باپ نعمان بعدی ایک بہت بڑا سیاح تھا۔ اس نے تقریباً ساری دنیا چھان ماری تھی۔ ایک رات وہ ایسے وقت اس بستی میں داخل ہوا تھا جب سخت برفباری ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی بیمار بیوی اور ننھا سا بچہ تھا۔ اس کے ساتھ خچر بھی تھے جن پر نہ جانے کیا سامان لدا ہوا تھا۔ لیکن بعد میں وہ سامان اس کے ساتھ نہیں دیکھا گیا۔ البتہ دوسری صبح اس نے بستی والوں سے ملاقات کی تھی۔

بستی میں اسے ایک مکان فراہم کر دیا گیا' جس کی قیمت اس نے خالص سونے سے ادا کی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے لوگوں کو دوست بنانے کے لئے انہیں سونا پیش کیا تھا جس سے اندازہ لگایا گیا کہ وہ بے حد مالدار شخص ہے' لیکن وہ اپنی بیوی کی علالت سے سخت پریشان تھا۔ نہ جانے کیوں وہ شہر جا کر اس کا علاج کرانا پسند نہیں کرتا تھا۔

بہرحال کچھ ہفتوں کے بعد اس کی بیوی مر گئی اور غمزدہ نعمان بعدی نیم پاگل سا ہو گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے دس سال اسی کیفیت میں گزارے اور پھر خاموشی سے مر گیا۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آیا' کہاں رہتا تھا۔ لیکن بستی والوں پر اب اس کے بچے کی پرورش کا بوجھ آ پڑا تھا۔ ہشام بعدی بے حد ذہین اور ہونہار تھا۔ بہت جلد اس نے تعلیم حاصل کی' بچہ تھا' لیکن بے حد خوددار۔ اس نے گھر کی ایک ایک چیز فروخت کر کے اپنا خرچ چلایا۔ اور کسی سے کچھ لینے دینے کے معاملے میں وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ بزرگ تک اسے بزرگی کے رعب میں لے کر اس پر کوئی احسان کرنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ نعمان بعدی کی حقیقت کھلی اسکے بارے میں پتہ چلا کہ وہ ایک عظیم مہم جو تھا۔ خزانوں کی تلاش اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ اور انتہائی باوثوق ذرائع سے

معلوم ہوا کہ اس نے ایک عظیم خزانہ حاصل کر لیا تھا' اور اسے لے کر ہی اس بستی میں آیا تھا' لیکن خزانہ کہاں گیا؟ اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

ہشام بعدی بہت چھوٹا تھا۔ چند لوگوں نے اس سے خزانے کے بارے میں معلومات بھی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اس سے ناواقفیت کا اظہار کر دیا' وقت گزرتا رہا۔ ہشام بعدی نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح کاشت شروع کر دی' وہ بھی سبزی اور ترکاری کا تاجر بن گیا' اور وہ کافی محنتی تھا' لوگ اس کی عزت کرنے لگے۔

اس وقت ہشام بعدی کی عمر تقریباً انتیس سال تھی جب بستی زلزلے کا شکار ہوئی۔ بیشار لوگ مر گئے' بیشار زخمی ہوئے۔ بہت سے بے گھر ہو گئے۔ ہشام نے جو کچھ تھا دوسروں کو دے دیا لیکن قیامت خیز زلزلے نے صرف اسی بستی کو متاثر نہیں کیا تھا' بلکہ بے شمار گاؤں اور بے شمار شہر اس کا شکار ہوئے تھے۔ حکومت حتی الامکان اپنے وسائل سے کام لے رہی تھی' لیکن وہ کہاں تک پورا کرتی' تب اس نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ اپنی مدد آپ کریں۔

اس بستی کے بے گھر لوگوں کے لئے گھر کی ضرورت تھی۔ بیماروں کے لئے ہسپتال کی ضرورت تھی۔ بستی کے مخیر حضرات نے حسب توفیق دیا لیکن وہ اتنا بھی نہ تھا کہ چند مکان تعمیر ہو جاتے۔

تب ایک شام ہشام بعدی بستی کے سب سے معمر شخص سے ملا' اور اس نے ایک انوکھی بات کہی۔

"محترم بزرگ میں بستی کی تعمیر کے لئے ایک بڑا سرمایہ دینے کو تیار ہوں۔"

"تم ہشام بعدی تم لیکن تمہارے پاس کیا ہے۔؟"

"آپ کو علم ہو گا کہ میرے باپ کے نام سے ایک خزانہ منسوب ہے۔" ہشام نے کہا۔

"خزانہ۔ ہاں وہ کہانی میں نے بھی سنی تھی۔"

"وہ کہانی نہیں' حقیقت ہے۔"

"کیا مطلب۔"؟

"ایک عظیم خزانہ میرے علم میں ہے جو میرے باپ کی ملکیت تھا اور اب میری ملکیت ہے' میں اس خزانے میں سے کچھ' آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہوں' تاکہ بستی تعمیر ہو سکے' ہسپتال بن سکے' میرے خیال میں خزانے کے ایک معمولی حصے کا وہ جائز استعمال ہو گا۔

"لیکن ہشام بیٹے' کیا وہ خزانہ اتفاقیہ طور پر تمہارے علم میں آیا ہے"؟

"نہیں مرتے وقت میرے باپ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ لوگوں نے مجھ سے طرح طرح سے اس کے بارے میں پوچھا لیکن میں لاعلمی ظاہر کرتا رہا کہ وہی میرے لئے بہتر تھی' کیونکہ میں کمزور تھا۔ کم عقل تھا' اگر میں خزانے کا اعتراف کر لیتا تو لوگ اسے حاصل کرنے میں کوشاں ہو جاتے' اب میں مضبوط ہوں' اس کی حفاظت کر سکتا ہوں اس لئے اب اس کی تشہیر سے بھی مجھے خوف نہیں ہے۔"

"لیکن۔ لیکن کیا تم درست کہہ رہے ہو؟" بوڑھے نے حیرت سے کہا۔

"آپ جانتے ہیں' میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"تو پھر تم نے اب تک اس خزانے کو استعمال کیوں نہیں کیا؟"

"میرا ایک نظریہ ہے' اس کے بارے میں پھر کبھی بتا دوں گا۔"

"لیکن بیٹے۔ جب تم خزانے کا وہ حصہ لے آؤ گے' تب میں لوگوں کو اس کے بارے میں بتاؤں گا۔ ممکن ہے خود میرا مذاق بن کر رہ جائے۔"

اور جب ہشام بعدی نے چمڑے کی لاتعداد تھیلیاں جو تمام اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیں' بوڑھے کے سامنے رکھیں تو وہ بیہوش ہوتے ہوتے بچا' اس کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

"آہ۔ اس سے تو ایک حسین بستی تعمیر ہو جائے گی۔" اس نے کہا۔

"کیا یہ پورا خزانہ ہے۔"

"اس عظیم خزانے کا ایک حصہ جس سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔" ہشام بعدی نے کہا اور بوڑھا خوشی سے ناچنے لگا۔

تب نیک دل بوڑھے نے ایک ایک پائی بستی کی تعمیر پر خرچ کر دی۔ اور بلاشبہ نئی

تعمیر ہونے والی بستی پرانی بستی سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہشام بعدی لوگوں کی نگاہوں میں ایک پراسرار شخصیت بن گیا۔

لوگوں نے طرح طرح سے اس کے قریب آنے کی کوشش کی' اسے طرح طرح سے پھسلانے کی کوشش کی' اس سے خزانے کے بارے میں معلوم کیا' لیکن اب ہشام بعدی کے پاس ایک لمبا اور پرانی ساخت کا پستول نظر آنے لگا تھا اور اس نے لوگوں سے کہا۔

"ہاں خزانے کے بارے میں ساری اطلاعات درست ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ کہاں ہے' میں نے اس میں سے صرف وہ لیا تھا جو بستی کی تعمیر میں کام آیا' اور اس خزانے سے اپنے لئے میں نے یہ پستول حاصل کیا ہے تاکہ یہ خزانے کی حفاظت کے سلسلہ میں استعمال ہو سکے اس کے علاوہ وہ سارے کا سارا خزانہ جوں کا توں محفوظ ہے۔"

بہرحال اس کے بعد کی زندگی بھی ہنگاموں سے پر تھی۔ شام کو اغواء کرنے کی کوشش کی گئی' لیکن بے حد توانا اور نڈر انسان تھا۔ اس کے دشمن زخمی ہو کر بھاگ نکلے' اور ہشام بعدی کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ ہشام بعدی مضبوط ہونے کے بعد خزانہ نکالے گا اور پھر نہ صرف بستی میں بلکہ دور دور تک علاقوں میں اس سے زیادہ مالدار شخص نہ ہو گا۔

لیکن طویل عرصہ گزر گیا' ایسا نہ ہوا' ہشام بعدی بدستور کام کرتا رہا۔ ہاں اس کے بعد حالات بدل گئے' نزدیک کے علاقے میں تیل نکل آیا۔ بستی کے بہت سے نوجوان تیل کے چشموں پر کام کرنے لگے اور ہشام بعدی بھی وہیں ملازم ہو گیا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ہشام بعدی کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ اب وہ تیل تلاش کرنے والے ماہرین کی جماعت میں شامل تھا اور دور دور کے دورے کرنے لگا تھا۔ اسے انتہائی معقول تنخواہ ملتی تھی جس سے بستی میں اس نے عمدہ سا مکان تعمیر کرا لیا تھا۔

لوگ جانتے تھے کہ ہشام بعدی قصبہ کا امیر ترین آدمی ہے سب کی حیثیت اس کے سامنے ہیچ ہے۔ لیکن ہشام اسی طرح خوش اخلاق اور ملنسار تھا' اس نے اپنی امارت کا رعب کبھی نہیں گانٹھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صرف اپنی حلال کی کمائی ہی خرچ کرتا تھا۔

لیکن یہ بھی اتنی تھی کہ وہ مالدار لوگوں کے انداز میں زندگی بسر کرتا تھا۔

اس تقریب میں شہریار نے ہشام بعدی پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت بھی وہ نزدیک بیٹھی میکشاں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے تشویش تھی کہ میکشاں کے خواب وہ کیسے پورے کر سکے گا۔

اور ہشام بعدی پر نگاہ ڈالنے کے بعد ایک خیال اس کے ذہن میں آیا تھا' اور اس خیال سے شہریار کا دل دھک سے اڑ گیا تھا۔ اس نے بے چین نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا' کوئی اس کے خیالات کو پڑھ تو نہیں رہا ہے۔

لیکن خیالات کون پڑھ سکتا ہے' میکشاں بھی نہیں۔ اور میکشاں تو اس وقت دوسری طرف جھکی ہوئی اپنی کچھ دوستوں سے گفتگو کر رہی تھی۔

تب شہریار کو اس انوکھے خیال پر سوچنے کا موقع مل گیا۔ اس نے اس بھری محفل میں خود کو تنہا محسوس کر کے سوچنا شروع کر دیا' وہ اپنے پروگرام پر خوب غور کرتا رہا۔ اتفاق سے اس دوران اسے کسی نے ٹوکا بھی نہیں۔

کون ہے جو میکشاں کے حسن سے متاثر نہیں ہے۔ بڑے بڑے معززین اس کے قرب کے خواہاں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ سب کے سب یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ شہریار کے سامنے کسی کی دال نہیں گل سکتی۔ کیونکہ شہریار خود میکشاں کی پسند ہے' لیکن اگر خود میکشاں کسی سے اظہار عشق کرے تو —— تو کیا وہ بھٹک نہ جائے گا۔

یقیناً بھٹک جائے گا۔

اور وہ بھٹکنے والا ہشام بعدی بھی ہو سکتا ہے۔ یقیناً وہ ہشام بعدی بھی ہو سکتا ہے۔ یقیناً وہ ہشام بعدی بھی ہو سکتا ہے۔ یقیناً وہ ہشام بعدی ....

اس کا ذہن ایک ہی گردان کئے جا رہا تھا۔ اس کا دماغ گھومنے لگا۔ اس کی آنکھیں ہشام بعدی پر جمی ہوئی تھیں' اور ذہن خلاؤں میں بھٹک رہا تھا۔

آقائے محمودی کے یہاں ہونے والی اس تقریب میں شہریار نے ایک انوکھا پروگرام بنایا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ وہ اس پروگرام پر عمل کرنے کے لئے سنجیدہ تھا۔ گویا پروگرام اس کے ذہن میں مضبوط ہو گیا تھا۔ اب صرف اس کے دوسرے تانے بانے درست کرنے

کی ضرورت تھی۔

اور پھر میکشاں نے ہی اس کے خیالات کا تسلسل توڑا۔

"شہریار——!

"ہوں"—— وہ چونک پڑا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں میکشاں۔"

"انوکھے شخص کو دیکھا۔"

"ہشام بعدی۔" شہریار کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ اسی کی بات کر رہی ہوں۔"

"بے شک وہ انوکھا ہے۔"

"انوکھا اور پراسرار، نہ جانے اس شخص میں کیا کشش ہے شاید یہ اس کی شخصیت سے منسوب روایات کا نتیجہ ہے کہ لڑکیاں اس کی جانب زیادہ متوجہ ہوتی ہیں۔"

"ہاں اس نے بہرحال اپنے بدن پر سونے کا رنگ خوب چڑھایا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ملمع سمجھتی ہو نا۔ سفید اور بھدی چیز کو سونے کی مانند چمکا دیتا ہے۔"

"اوہ تو تمہارا خیال ہے شہریار کہ وہ خزانے کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے۔"

"عقل یہی دلیل دیتی ہے میکشاں، ورنہ ایک اتنا دولت مند انسان اس طرح ملازمت کیوں کرتا پھرے گا۔ تم خود غور کرو۔ اس کی شخصیت میں کیا کشش ہے، بیکار سا بے ڈھنگا سا، میرا خیال ہے عام حالات میں کوئی اس کے نزدیک چند لمحات بھی گزارنا پسند نہیں کرے گا اور یقیناً میکشاں، اسے اپنی اس کمی کا احساس تھا، تب اس نے اس بارے میں سوچا ہو گا۔ ہاں وہ ذہین ہے، اس نے اپنی ذہانت سے ایسا پروگرام مرتب کیا کہ بہرحال وہ نگاہوں میں ایک مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"مجھے تمہاری رائے سے اختلاف ہے شہریار۔"

"کیوں۔؟"

"تم بھول رہے ہو، اس نے بستی کی تعمیر کے لئے اتنا بڑا سرمایہ دیا تھا کہ پوری بستی پھر سے آباد ہو گئی، ورنہ لوگ برے حال میں ہوتے۔"

"وہ واقعہ آج تک میرے لئے حیرت انگیز ہے۔ لیکن تم انسان کی نفسیات کو نہیں سمجھتیں میکشاں، انسان بڑی عجیب چیز ہے۔ مجھے تو صرف یہ حیرت ہے کہ اس اتنی بڑی چوری کا آج تک کوئی تذکرہ نہیں ہوا۔"

"چوری"—— میکشاں شدید حیرت سے بولی۔

"میں انسانی نفسیات کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ کیا یہ بات ناممکنات میں سے ہے میکشاں کہ اس نے بستی میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے کوئی بڑا ڈاکہ ڈالا ہو، اور"

"شہریار۔ تمہاری سوچ اتنی گھٹیا نہیں ہونی چاہئے تم بچوں کے سے انداز میں ہوائی قلعے بنا رہے ہو۔ وہ چوری ہرگز نہیں تھی۔ حکومت اتنی احمق تو نہیں ہے۔ اس کی خدمات کا بہرحال اعتراف کیا گیا ہے۔"

شہریار ایک لمحے کے لئے چڑھ گیا، پھر اسے اپنے پروگرام کا خیال آیا۔ پھر اس نے سوچا کہ اسے براہ راست ہشام بعدی کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے، ہاں اس گفتگو میں ہی کوئی کام کی بات نکل آئے تو زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ وہ ہنس پڑا۔

"ہاں۔ میں ابھی بچہ ہوں میکشاں، بعض اوقات میرا دل چاہتا ہے کہ معصومانہ گفتگو کروں۔"

"میں جانتی تھی کہ تم شرارت کر رہے ہو۔ آؤ اس سے گفتگو کریں۔" میکشاں نے کہا اور شہریار جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ یہ موقع عمدہ تھا ممکن ہے اس کے پروگرام کا پہلا مرحلہ یہاں مکمل ہو جائے۔"

چنانچہ وہ دونوں اٹھ کر ہشام بعدی کی طرف چل پڑے جہاں وہ حسب معمول نوجوانوں کے جھرمٹ میں بیٹھا دلچسپ گفتگو کر رہا تھا۔ یوں بھی وہ عمدہ گفتگو کرنے والوں میں شمار ہوتا تھا۔

"آخاہ۔ آ گئے، جن کے آنے سے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ جو ذہنوں میں انتشار

برپا کرتے ہیں۔ آؤ حسین لوگو' آؤ۔ میں تمہیں تمہارے حسن کے دائم رہنے کی قیمتی دعا دیتا ہوں۔"

"شکریہ ہشام بعدی۔" دونوں نے بیک وقت کہا اور پھر کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"کیا موضوع ہے؟" شہریار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بات تیل کے کنوؤں کی ہو رہی تھی۔ لیکن میں اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں حسین چہروں پر بیزاری کے آثار۔ دیکھ رہا تھا ظاہر ہے ان حسین لڑکیوں کو تیل کی کھدائی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔" ہشام نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یقیناً موضوع بدل دیا جائے۔" شہریار نے کہا۔

"اور نیا موضوع شہریار ہو گا۔" ہشام بعدی نے کہا۔

"میرا خیال ہے میرے موضوع میں کوئی نئی بات نہیں ہو گی' میرے بارے میں ساری باتیں کی جا چکی ہیں۔"

"لیکن تمہاری شخصیت اتنی پرکشش ہے کہ اس کے بارے میں جتنی بار گفتگو کر لی جائے' بیزاری نہیں ہوتی۔"

"میرے بارے میں ضرور گفتگو کرو ہشام' لیکن ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا۔"؟

"اس کے بعد تمہارے بارے میں گفتگو ہو گی۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے دوستو' اجازت ہے۔ شرط منظور ہے۔"

"تو گفتگو کا آغاز ہو جائے۔" شہریار نے کہا۔

"میرا پہلا سوال۔" ہشام نے مسکراتے ہوئے کہا۔" مس میکشاں آپ دونوں کو الگ نہیں تصور کیا جا سکتا۔ اس لئے اگر ذکر شہریار ہو۔ تو ذکر میکشاں اس میں شامل ہوتا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" میکشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پہلا سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے' آپ دونوں نے اپنی پسند اپنی چاہت کا کوئی

اوزان مقرر کیا۔ کیا کبھی اس انداز میں سوچا گیا کہ شہریار میکشاں کو زیادہ چاہتا ہے یا میکشاں شہریار کو۔"

"واہ"——— دوسرے لوگوں نے بے ساختہ داد دی۔ اور پھر ایک شخص شہریار سے بولا۔

"تمہارا دعویٰ تھا شہریار کہ تمہارے بارے میں کوئی نئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن کیا تم ہشام کے اس سوال کو پرانا کہہ سکتے ہو؟"

"نہیں۔ یہ نیا اور انوکھا سوال ہے۔ شہریار نے اعتراف کیا۔

"شکریہ شہریار۔ اس کا جواب آپ دونوں میں سے کوئی دے سکتا ہے؟"

"میں جواب دوں گی۔" میکشاں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شہریار میرے منگیتر ہیں۔ میں انہیں چاہتی ہوں' یہ مجھے چاہتے ہیں۔ ہم نے چاہت کا ایک معیار کیا۔ اور اپنے طور پر دوسرے کو اس پر پرکھا' تو پتہ چلا کہ ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہیں کسی کا جھکاؤ کسی سمت نہیں ہے۔ چنانچہ جب محبت کا اوزان درست نکلا تو ہم مطمئن ہو گئے۔ اس کے بعد کسی کی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوتی جس سے دوسرے کو اپنی چاہت کا وزن کرنا پڑتا۔ گویا یہ موضوع ہی ختم ہو گیا' کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت سے مطمئن ہیں۔"

"میں اس جواب کی داد دوں گا' بے شک بڑی ذہانت سے بہت بڑے مسئلے کو بے اثر بنا دیا گیا۔ دوسرا سوال خالص شہریار سے ہے۔ کیا شہریار جواب دیں گے؟"

"ضرور——" شہریار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میکشاں بے حد حسین ہے' حسن عبادت چاہتا ہے' حسن حفاظت چاہتا ہے۔ حسن کی پیشانی کی ایک لکیر ایک بڑا الزام بن سکتی ہے۔ شہریار کیا تم خود کو مکمل انسان سمجھتے ہو' کیا تم میکشاں کی بھرپور حفاظت کر سکتے ہو۔ کیا تم اس کی پیشانی پر کسی لکیر کے جرم کے مرتکب نہ ہو گے؟"

بڑا بھیانک سوال تھا' شہریار چکرا گیا' سمجھ گیا تھا کہ ہشام بعدی نے زبردست وار کیا ہے' اس کا مناسب جواب ضروری ہے۔ چند لمحات الجھا رہا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے

ہوئے کہا۔

"میکشاں میرے اوپر بھروسہ کرتی ہے۔"

"جواب نامکمل ہے' کیا تم بھی خود پر بھروسہ کرتے ہو؟"

"ہاں میکشاں کو خوش رکھنے کے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

"سب کچھ؟"

"ہاں سب کچھ۔"

"جواب گو نامکمل ہے' تاہم مذاق میں کوئی حادثہ نہ ہو جائے' چنانچہ میں میکشاں سے ایک سوال کر کے اپنے سوالات ختم کرتا ہوں۔" ہشام نے کہا اور میکشاں مسکرانے لگی۔

"میکشاں! کیا تمہیں شہریار پر بھروسہ ہے ـــــ مکمل بھروسہ' کیا تم اس کی بیوی کی حیثیت سے مطمئن رہو گی؟"

"شہریار ایک اولوالعزم انسان ہے' میں جانتی ہوں یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔" میکشاں نے جواب دیا۔

شہریار جو ہشام کے سوال سے الجھ گیا تھا۔ خود کو اس بھنور سے نکالنے میں کوشاں تھا' تاکہ ہشام سے اپنے سوالات کر سکے۔ اس نے میکشاں کے جواب پر بھی غور نہیں کیا تھا' لوگ ہنسنے اور مسکرانے لگے۔

"اب تمہاری باری ہے۔" ہشام نے کہا۔

"ہاں" ـــــ شہریار خود کو یکسو کرتے ہوئے بولا۔ "تو مسٹر ہشام بعدی آپ کے بارے میں سب سے دلکش سوال جو ہے وہ یہی ہے' میرا خیال ہے' میرے دوست سمجھ گئے ہوں گے۔"

"لیکن سوال دلچسپ ہونا ضروری ہے۔" ایک نوجوان نے کہا اور دوسروں نے اس کی تائید کی۔

"ہشام' تمہاری عمر کیا ہے؟"

"میری بستی کے بزرگوں کے حساب سے اڑتیس سال۔"

"اور تمہارے حساب سے؟"

"مجھے بزرگوں پر بھروسہ ہے۔"

"کیا یہ جوانی کی عمر کہلاتی ہے؟"

"نہیں ـــــ اس میں سے تیس سال نکال دو' باقی آٹھ سال تجربات کے سال ہیں' مجھے اس دنیا کا آٹھ سالہ تجربہ ہے' گویا بڑھاپے کی ابتداء کو آٹھ سال گزر چکے ہیں۔" ہشام نے کہا۔

"کیا ان آٹھ سالہ تجربات میں کوئی خاص بات شامل ہے؟"

"بہت سی خاص باتیں۔"

"ہمیں معلوم ہو سکیں گی؟"

"یہ باتیں کسی کو بتائی نہیں جاتیں' اس سلسلہ میں سب کے ذاتی تجربات ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' لیکن مسٹر ہشام' جوانی کی عمر اور تجربات کی عمر میں' کیا کبھی آپ نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کیا؟"

"مستقبل ـــــ ایک سنہری دھوکہ ہے' اس کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ انسان بڑی ناپائیدار شے ہے' وہ مستقبل پر بھروسہ کر کے بڑی حماقت کرتا ہے۔ جو کچھ ہے' حال ہے' صرف حال۔"

"میرا مطلب کچھ اور ہے۔"

"یا تو تم بیان نہیں کر پا رہے' یا تکلف کر رہے ہو۔"

"ہاں' ایسی ہی بات ہے' میری مراد کسی لڑکی سے تھی۔"

"لڑکی؟ ـــــ"

"ہاں' وہ لڑکی جو تمہارے دل کے دروازوں پر دستک دیتی' جو تمہیں اپنے بارے میں غور کرنے پر مجبور کر دیتی۔"

"عورت آدم کی ضرورت تھی' میری ضرورت ہے میں اس ضرورت سے منکر نہیں ہوں۔ لیکن میری فطرت مجھے تلاش پر آمادہ نہیں کرتی۔ ہاں اگر کوئی عورت میری زندگی میں داخل ہوئی' میں نے اس کی صفات قبول کر لیں تو میں اسے اپنا لوں گا۔"

"گویا کوئی عورت تمہیں متاثر نہیں کر سکی' کوئی تمہارے معیار پر پوری نہیں اتری۔"

"تمہارا تجزیہ غلط ہے شہریار' میں بتا چکا ہوں کہ عورت میری جستجو نہیں رہی۔ اور کسی عورت نے میرے قریب آنے کی کوشش نہیں کی' مجھے انتظار ہے' انتظار رہے گا۔ ممکن ہے آخری سانس تک۔"

"حالانکہ تم عورت کے لئے بہت دلکش ہو۔"

"اگر یہ میرا مذاق ہے' تب بھی میں برا نہیں مانوں گا۔"

"میں تمہارے خزانے کی بات کر رہا ہوں۔"

"سونے کی چمک سے محبت کرنے والے شاید مجھے پسند نہ آئیں۔"

"لیکن اگر کوئی عورت تمہیں پسند آ جائے' اور تم محسوس کر لو کہ وہ تمہارے خزانے کے بجائے صرف تمہیں چاہتی ہے' تو زندگی کے کسی موڑ پر تم اپنا خزانہ دے سکتے ہو؟"

"خزانہ میری نگاہوں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔"

"لیکن اگر تمہاری پسندیدہ عورت اسے طلب کرے؟"

"اگر وہ اس کی ضرورت مند ہوئی تو میں گریز نہ کروں گا۔ ہاں اس کی خواہشات اگر خود میں پوری کر سکا تو اس سے معذرت کر لوں گا۔"

"آخر تم اس خزانے کا کرو گے کیا؟"

"کچھ نہیں' وہ میرے لئے بیکار شے ہے۔"

"کیوں؟"

"میرا باپ اسے نہ جانے کہاں سے لایا تھا۔ اس خزانے نے میرے باپ کو کیا دیا۔ وہ مر گیا' اور خزانہ میرے لئے چھوڑ گیا۔ میں بھی مر جاؤں گا اور خزانہ کسی اور کے لئے چھوڑ جاؤں گا۔"

"اوہ ——— وہ کوئی اور' کیا تمہاری اولاد ہو گی۔"

"ممکن ہے۔"

"ہوں" ——— شہریار خاموش ہو گیا۔ سوالات میں اس کے دل کی سیاہی نمایاں تھی' لیکن اس کا راز ابھی اس کے سینے میں تھا۔ اس سے کوئی بھی واقف نہیں تھا' اس لئے کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکا۔ یوں اس محفل کی دلچسپ گفتگو جاری رہی' اور پھر رات گئے لوگوں نے آقائے محمودی سے اجازت طلب کی اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

شہریار کئی دن تک اپنے پروگرام پر غور کرتا رہا۔ وہ اس کے ایک ایک پہلو کا جائزہ لے رہا تھا۔ بات صرف میکشاں کی تھی۔ یہ شوخ اور اکھڑ لڑکی اس سنجیدگی سے پورا کام کر سکے گی' جس کی ضرورت تھی' اور آیا وہ شہریار سے اتفاق بھی کرے گی یا نہیں۔"

اور ——— اگر اس نے شہریار کی بات کو پسند نہ کیا تو بڑی خرابی کی بات ہے۔ خواہ مخواہ شہریار اس کی نگاہوں میں ذلیل ہو جائے گا۔ لیکن بہرحال اس خطرے کے پیش نگاہ اتنے عمدہ پروگرام کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ اس نے ایک روز اس سلسلہ میں گفتگو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میکشاں ہر شام پانچ بجے ایک پرفضا مقام پر اس سے ملاقات کرنے آتی تھی' وہ اس کا منگیتر تھا۔ ان کی ملاقات پر کوئی پابندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

چنانچہ اس شام بھی میکشاں آئی' اور شہریار نے حسب معمول ایک پرجوش بوسے سے اس کا استقبال کیا۔ پھر اس نے پھولوں کے کنج میں میکشاں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

"تمہاری واپسی کے فوراً بعد سے میں تمہارا انتظار شروع کر دیتا ہوں میکشاں۔"

"کوتاہی تمہاری ہے شہریار۔"

"کیوں۔؟"

"یہ انتظار ختم کیوں نہیں کر دیتے۔"

"اوہ۔ میکشاں۔ مجھے خدشہ ہے کہ کسی دن اس روح کو اذیت دینے والے تصور سے میں جان نہ کھو بیٹھوں۔"

"کیا تصور شہریار۔؟"

"یہی کہ ——— یہی کہ ممکن ہے' تم میرے ساتھ خوش نہ رہ سکو۔"

"ایسی باتیں کیوں سوچتے ہو شہریار۔"

"میں اس احساس کو دل سے نہیں نکال سکتا میکشاں۔"

"تو اس پر عمل کرنے کے لئے جدوجہد کرو۔"

"میں کیا کروں میکشاں، تم ہی میری مدد کرو۔"

"میں ہر طرح سے تیار ہوں، لیکن سوچنا تمہارا کام ہے۔"

"اگر میں تم سے گری ہوئی بات کروں میکشاں تو تم ناراض ہو جاؤ گی، ممکن ہے تم ہمیشہ کے لئے مجھے نگاہوں سے گرا دو۔ لیکن اتنا سوچ لو میکشاں جو کچھ سوچتا ہوں صرف تمہارے لئے سوچتا ہوں۔

"میں جانتی ہوں شہریار میں تمہارے اوپر بھروسہ کرتی ہوں۔"

"تو میرے ذہن نے ایک پروگرام بنایا ہے میکشاں، اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے بارے میں تم سے ضرور بات کروں گا، خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو، ہو سکتا ہے یہ شام ہماری ملاقات، ہمارے تعلقات کی آخری شام بن جائے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو شہریار؟"

"ہاں میکشاں، ٹوٹے ہوئے دل نے جو کچھ سوچا ہے، اس میں تمہاری مدد اور تمہاری پسند کی ضرورت ہے۔"

"بے خوف و خطر بتاؤ شہریار میں تم سے الگ رہ کر نہیں سوچ سکتی۔" میکشاں نے محبت سے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔

"میکشاں، میں نے ایک ایسی بات سوچی ہے جو شاید تمہیں پسند نہ ہو۔"

"شہریار، کیا میری محبت کا امتحان لے رہے ہو، کیا مجھے آزمانا چاہتے ہو، مجھے ہر وہ بات پسند ہے، جو تمہیں پسند ہے۔"

"اچھا میکشاں، تم نے مجھے اس قدر ہمت دلا دی ہے، کہ میں بتا رہا ہوں، سنو میں چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ کہ ——— ہشام بعدی کا وہ خزانہ حاصل کر لوں جو بے مقصد پڑا ہوا ہے، وہ نیم پاگل انسان اس خزانے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ وہ اسے ضائع کر دے گا۔ تم دیکھ لینا، بالآخر کوئی گروہ کوئی فرد اسے اغوا کر لے گا۔ اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دے گا۔ اس سے خزانے کا راز معلوم کر لے گا اور کسی کو ہشام کی کہانی

معلوم نہ ہو سکے گی، کوئی نہیں جان سکے گا کہ خزانے کا راز کیا تھا۔ لوگ ہشام کو بھول جائیں گے خزانے کی کہانی بھول جائیں گے۔ تو ایسی صورت میں ہم وہ خزانہ کیوں نہ حاصل کر لیں میکشاں۔"

شہریار خاموش ہو گیا۔

میکشاں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی، وہ سوچ رہی تھی یہ کیسے ممکن ہے۔ ہشام بعدی خزانے کا راز شہریار کو کیوں بتا دے گا۔ شہریار اس سے یہ راز کیسے معلوم کر سکے گا؟

اور شہریار اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ میکشاں پر اس گفتگو کا کیا رد عمل ہوا۔ وہ ناراض تو نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے پر شہریار کی طرف سے نفرت کے آثار تو نہیں نمودار ہوئے۔

اور وہ کسی قدر مسرور ہوا کیونکہ میکشاں کے چہرے پر نہ تو نفرت کے آثار تھے، نہ وہ ناراض معلوم ہوتی تھی۔ البتہ اس کی آنکھوں میں حیرت ضرور تھی۔ تب شہریار نے کہا۔

"یہ خزانہ ہماری قسمت بدل دے گا میکشاں۔ ہم خاموشی سے والدین کی رضا سے شادی کر لیں گے، شادی سے قبل میں یہ خزانہ شہر منتقل کر دوں گا۔ اس کے بعد ہم شہر میں نئی زندگی گزارنے کی اجازت طلب کریں گے اور پھر شہر چلے جائیں گے۔ پہلے ہم کرائے پر ایک خوبصورت سا مکان حاصل کریں گے، اس کے بعد اپنی پسند کی کوٹھی بنوائیں گے۔ پھر میں دنیا کو دکھانے کے لئے کوئی کاروبار کروں گا۔ اور پھر کاروبار پر کچھ منتظم مقرر کر کے ہم دنیا کے سفر پر نکل کھڑے ہوں گے۔ میکشاں ہم پوری دنیا دیکھیں گے پوری دنیا۔"

اور شہریار نے میکشاں کی آنکھوں میں مسرت کے آثار دیکھے۔ اس کی آنکھیں خوابوں میں ڈوب گئی تھیں۔ وہ تصور میں نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کر رہی تھی۔

شہریار کو یقین ہو گیا کہ میکشاں سنہری جال میں گرفتار ہو گئی ہے، اس نے سنجیدگی سے شہریار کی باتوں کو سنا ہے، اور اس پر کوئی غلط رد عمل نہیں ہوا۔ وہ خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔

"کچھ بولو میکشاں، کوئی سوال کرو۔"

"صرف ایک سوال شہریار، صرف ایک سوال۔"

"پوچھو میکشاں، جلدی پوچھو۔"

"کیا یہ سب کچھ اسی طرح ممکن ہے، جس طرح ہم سوچ رہے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اسی طرح ممکن ہے۔"

"بالکل ممکن ہے میکشاں، لیکن اس کے لئے تمہاری مدد درکار ہو گی۔"

"میری مدد؟ ——"

"ہاں، یہ سارا کام تمہیں کرنا ہو گا میکشاں۔"

"مجھے؟ ——" میکشاں گھبرا کر بولی۔

"تمہیں اور صرف تمہیں، میرے لئے میکشاں اپنے شہریار کے لئے۔"

"لیکن میں —— میں؟ ——"

"میں تمہیں بتاؤں گا میکشاں۔ میں تمہاری رہنمائی کروں گا جس طرح میں کہوں۔ کرتی رہو۔ بس وہی ہو گا جو ہم سوچ رہے ہیں یقیناً وہی ہو گا۔

"مگر کس طرح شہریار۔؟

"میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا میری زندگی، میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا بس میرے اوپر بھروسہ کرو۔" اور میکشاں شہریار کی حسین آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ شہریار نے اپنی مضبوط بانہوں میں اسے کھینچ لیا تھا۔

ابتداء ایک اور محفل سے ہوئی تھی۔ بستی کے لوگ ایک دوسرے کے بغیر کچھ نہیں کرتے تھے۔ کسی کے ہاں کوئی تقریب ہو۔ سب شریک ہوتے تھے۔ وہ ایک شادی کی محفل تھی۔ حسب معمول سب موجود تھے۔ اور اسی محفل میں شہریار نے ایک نیا گل کھلایا۔ لڑکیاں تو یوں ہی اس کی دیوانی تھیں۔ عالیہ اشک نے اپنی نظم سنائی اور شہریار سرشار ہو گیا۔

"تمہارا تصور عام لڑکیوں سے اجنبی اور اچھوتا ہے عالیہ۔ تمہارے الفاظ دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیتے ہیں۔" شہریار نے ایک عجیب سی بے خودی سے عالیہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"تمہارے دل کے ہر تار سے تو میکشاں کی آواز ابھرتی ہے۔ شہریار" عالیہ نے حسرت سے کہا۔

"لیکن آج تمہاری حسین آواز، تمہارے خوبصورت الفاظ نے مجھے الجھا دیا ہے عالیہ میں سوچتا ہوں ایسی حسین نظم جس دل سے ابھری ہے وہ دل کتنا حسین ہو گا۔"

"دل کے حسن کی کون قدر کرتا ہے شہریار۔"

"یہ نہ کہو عالیہ —— یہ نہ کہو، مجھے بتاؤ، اپنے دل کی اس کروٹ کو کہاں سلا دوں، میری تو دنیا ہی بدل گئی عالیہ۔"

"شہریار —— عالیہ نے بے خود ہو کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"شہریار، مجھے کیوں حیران کر رہے ہو؟"

"نہیں عالیہ، میں دل سے تمہاری قدر کرتا ہوں۔ عالیہ آج تم نے میرے سینے میں وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو —— شاید کوئی لڑکی کبھی نہ حاصل کر سکے۔"

"شہریار" —— عالیہ اس کے سینے سے آ لگی۔ "شہریار میرا کیا ہو گا؟"

"اگر اگر تم پسند کرو عالیہ تو یہ سینہ ہمیشہ کے لئے تم پر وا ہو جائے۔" شہریار نے کہا۔

"میں مر جاؤں گی شہریار۔"

"میں تمہیں زندگی دوں گا عالیہ، میں —— میں بھی تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا عالیہ۔"

"لیکن تم —— تم تو میکشاں" ——

"میکشاں بے حد حسین ہے عالیہ، لیکن باہر سے، اندر سے وہ تمہارے حسن کے مقابل کہاں؟"

"آہ —— لیکن وہ تمہاری منگیتر ہے۔"

"میں تمہارے لئے سارے جہاں کو چھوڑ سکتا ہوں عالیہ۔" شہریار نے کہا۔ اور اس نے عالیہ کے ہونٹوں پر بوسہ ثبت کر کے اسے اپنی محبت کا یقین دلا دیا —— تب عالیہ ہر شام شہریار سے ملنے لگی۔ میکشاں کی اداسی بھی سب نے دیکھی۔ اور پھر بہت جلد یہ بات ہر کان تک پہنچ گئی کہ شہریار نے میکشاں سے بے وفائی کر کے عالیہ کو اپنا لیا ہے۔ بہت جلد

میکشاں سے منگنی ٹوٹنے اور عالیہ سے رشتہ استوار ہونے کی اطلاع لوگوں کو مل جائے گی۔

کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکیں۔ یہ ہو گیا تھا' ہو رہا تھا۔ ناممکن کوئی بات نہیں ہے' سب کچھ ممکن ہے۔

اور اس شام ایک اور تقریب میں عالیہ اور شہریار یکجا ہوئے تھے۔ جبکہ میکشاں تنہا اور اداس ایک طرف بیٹھی تھی۔ نوجوان اس کے گرد منڈلا رہے تھے لیکن میکشاں نے تھوڑی دیر کے بعد اہل خانہ سے معذرت کر لی۔ وہ وہاں سے نکل آئی۔ جس وقت وہ ایک خوبصورت پگڈنڈی سے گزر کر اپنے گھر جا رہی تھی تو دوسری طرف سے اسے ہشام بعدی آتا نظر آیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا' ہشام بعدی چند ساعت کے بعد اس کے قریب پہنچ گیا۔

"اوہ ـــــ حسین لڑکی کہاں سے آ رہی ہو؟" اس نے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"سرور کے یہاں سے۔"

"کیوں کیا تقریب ختم ہو گئی۔ کیا لوگوں نے واپسی شروع کر دی۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے دیر ہو گئی۔ لیکن وقت تو ابھی زیادہ نہیں گزرا ہے۔"

"سب لوگ وہاں موجود ہیں۔" میکشاں نے اداسی سے جواب دیا۔

"تب پھر تم کیوں جا رہی ہو؟"

"بس ـــــ میرا دل نہیں لگا۔"

"اوہ ـــــ تو کیا شہریار وہاں موجود ہے؟"

"ہے۔"

"ہوں ـــــ حسین لڑکی' مجھے یہ بات پوچھنے کا حق تو نہیں ہے لیکن اجازت دو تو سوال کر لوں ـــــ کیا افسانہ عالیہ درست ہے؟" ہشام نے پوچھا۔

"آپ بھی میرے دل کو دکھانا چاہتے ہیں؟" میکشاں نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ دلوں کو دکھانے سے مجھے نفرت ہے۔ اگر میرے سوال نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے تو میں شرمندہ ہوں' اور اپنا سوال واپس لیتا ہوں۔" ہشام نے کہا۔

میکشاں عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی' دیکھتی رہی' اور پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھرتے ہوئے بولی۔

"کیا میں آپ سے درخواست کر سکتی ہوں ہشام۔"

"ضرور ـــــ ضرور ـــــ"

"کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اس محفل میں شریک نہ ہوں۔"

"ممکن ہے۔" ہشام نے کہا۔

"تو آپ وہاں نہ جائیں۔"

"نہیں جاتا۔"

"آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے یہ درخواست کیوں کی؟"

"اس کی ضرورت نہیں' ظاہر ہے تم نے ایک درخواست کی' اور میں نے قبول کر لی۔"

"آہ ـــــ تم کتنے باظرف انسان ہو ہشام' کتنے عظیم انسان ہو تم۔ میں سخت آزردہ ہوں ہشام میں چاہتی ہوں کسی جگہ بیٹھ کر گفتگو کریں۔"

"آؤ" ـــــ ہشام نے کہا اور وہ چل پڑے۔ انہوں نے پگڈنڈی چھوڑ دی اور پھر وہ کوہ کسلو کے پہلو میں جا بیٹھے۔ ہشام کے چہرے پر ایک انوکھا تاثر تھا' جسے میکشاں محسوس کر رہی تھی۔

میکشاں گردن جھکائے بیٹھی رہی' اور ہشام نے بھی کوئی بات نہ کی تب میکشاں نے ہشام کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں ہشام۔"

"گفتگو کا انتخاب نہیں کر پا رہا میکشاں' میں نہیں جانتا کہ میں کیا بات کروں۔ تمہارے دل کو دکھانا میرے بس سے باہر ہے۔"

"کیا ـــــ کیا عالیہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے ہشام؟"

"بلا مبالغہ ہرگز نہیں۔"

"پھر شہریار —— پھر شہریار اس کی طرف مائل کیوں ہو گیا؟"

"افسوس' اس بات کا جواب میرے لئے ممکن نہیں ہے میکشاں' کیونکہ اس سے میرے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے۔"

"کیا سوال ہے؟"

"تم اسے پسند نہ کرو گی۔"

"میں اسے پسند کروں گی۔"

"کیا —— کیا میکشاں' تم دونوں' کیا صرف تم شہریار پر اس قدر اعتماد کر بیٹھی تھیں کہ محبت کی تمام منازل سے گزر گئیں؟"

میکشاں پہلے تو اس کے سوال کا مقصد نہیں سمجھی' اور سمجھی تو شرم سے سرخ ہو گئی۔ تاہم جواب دینا ضروری تھا' چنانچہ اس نے دھیمی اور شرمائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں اتنی گری ہوئی نہیں ہوں ہشام۔"

"مجھے اس جواب سے بے پناہ مسرت ہوئی۔ تب پھر یہی کہا جا سکتا ہے میکشاں کہ شہریار کو حسن کی تمیز نہیں ہے تم تو ریشم کے قطروں سے ترتیب پایا ہوا ایک گہر ہو' جس کی آب کے سامنے کائنات مات ہے۔ کاش شہریار تمہارے حسن کی توہین نہ کرتا۔"

کیا میں اس سے محبت کی بھیک مانگوں گی ہشام' ہرگز نہیں' میں اب اس ہرجائی سے بے پناہ نفرت کرتی ہوں۔ مجھے اب اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔"

"اصول کی بات ہے۔"

"اس نے میری توہین کی ہے۔"

"یقیناً۔"

"میں اس سے انتقام لینا چاہتی ہوں۔"

"اوہ —— یہ جذبہ ذہن سے نکال دو تو بہتر ہے میکشاں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"اور میں لوگوں کی مسکراہٹوں کا نشانہ بنتی رہوں۔"

"لیکن تم کیا کرنا چاہتی ہو' میکشاں؟" ہشام نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں بھی اپنی منزل کا تعین کرنا چاہتی ہوں ہشام سنو میں عورت ہوں' کمزور' ناتواں' میں کسی مضبوط سہارے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ شہریار نے میری توہین کی ہے۔ ہشام اس نے مجھے ٹھکرایا ہے' کیا میں اتنی ہی گئی گزری ہوں تم جانتے ہو ہشام' میری ایک نگاہ پر بہت سے نوجوان میری طرف متوجہ ہو جائیں گے' لیکن بستی کا کوئی بھی نوجوان اس خصوصیت کا حامل نہیں ہے جو میری توجہ حاصل کر سکے۔ ہشام مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" میکشاں نے کہا۔

"کک —— کیا مطلب میکشاں۔" ہشام ہکا بکا رہ گیا۔

"شہریار صرف ایک خوبصورت نوجوان ہے لیکن اگر اس کی مقابل شخصیت تم بن جاؤ تو بتاؤ اس کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ وہ صرف نوجوان لڑکیوں میں مقبول ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اور کیا شخصیت ہے۔ اس کے برعکس تم —— بستی کا ہر فرد تمہاری عزت کرتا ہے۔ تمہارا دلدادہ ہے۔ اگر تم مجھے اپنا لو ہشام تو میری گری ہوئی حیثیت پھر سے بحال ہو جائے گی۔ اور شہریار کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔"

" میکشاں" —— ہشام شدید حیرت سے بولا۔

"تم نے ایک بار کہا تھا ہشام یاد کرو تم نے ایک بار کہا تھا کہ اگر کوئی لڑکی تمہاری دولت کے بجائے صرف تمہاری شخصیت سے متاثر ہوئی تو تم اسے اپنا لو گے۔"

" میکشاں۔"

"کہو —— کہو ہشام کیا کہنا چاہتے ہو تم بھی کہہ دو میں تمہیں قبول نہیں ہوں۔"

" میکشاں' غور کرو' سوچو میکشاں کیا کہہ رہی ہو"؟ ہشام کے منہ سے عجیب انداز میں نکلا۔

"کیا تم سمجھ رہے ہو کہ میں جذبات میں پاگل ہو رہی ہوں۔ اپنی توہین سے دل برداشتہ ہو کر احمقانہ گفتگو کر رہی ہوں۔ نہیں ہشام ایسی کوئی بات نہیں ہے' میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ ہاں اگر تم نے ہی مجھے ٹھکرا دیا تو پھر میں شاید ہوش و حواس کھو بیٹھوں۔"

"میکشاں ایک بار پھر سوچ لو اگر شہریار کو اپنی حماقت کا احساس ہو جائے' اگر وہ تمہارے قدموں میں آگرے تو —— تو کیا تم اسے معاف نہ کردو گی؟"

"ہرگز نہیں ہشام عورت کا دل نازک شیشہ ہوتا ہے۔ ایک بار بال پڑ جائے تو کبھی نہیں جاتا۔"

"ایک بار پھر غور کرلو میکشاں۔ میں پوری زندگی خوشیوں سے محروم رہا ہوں۔ سنو میکشاں میں عرصہ دراز سے تمہیں چاہتا ہوں۔ لیکن یقین کرو تم دونوں کو یکجا دیکھ کر میں نے ہمیشہ دعائیں دی ہیں میں نے خود کو کبھی اس قابل نہیں سمجھا کہ تمہارے حصول کی تمنا کروں۔"

"ہشام —— مجھے اپنالو ہشام مجھے اپنالو۔" میکشاں اس سے لپٹ گئی۔

"میکشاں ——" ہشام نے اسے اپنے فولادی بازوؤں میں جکڑلیا۔

"اگر کبھی کسی مرحلے پر تم نے مجھے ٹھکرا دیا میکشاں تو یاد رکھو میں خودکشی کرلونگا یا کہیں روپوش ہو جاؤں گا۔ بستی والے پھر میری شکل نہ دیکھ سکیں گے۔ اگر ایسا ہوا میکشاں تو میں یہ نہ سن سکوں گا کہ ہونہہ —— چلے تھے قصبہ کی سب سے حسین لڑکی کے عاشق بن کر۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا ہشام۔"

"میکشاں' لوگ خزانوں کی بات کرتے ہیں' کیا محبت سے بڑھ کر اور کوئی خزانہ ہو سکتا ہے' کوئی میرے دل سے پوچھے۔"

بستی والوں نے بہت مختصر عرصہ میں یہ حیرت کی دوسری خبر سنی ہشام اور میکشاں کے رومان کی خبر۔

خوب دن گزر رہے تھے۔ آج کل بھی بڑی دلچسپ خبریں سننے کو مل رہی تھیں۔

اب ہشام اور میکشاں آزادانہ ہر پارٹی میں شریک ہوتے اور بلاشبہ یہ جوڑا بھی کم سنسنی خیز نہیں تھا۔ لوگوں نے شہریار پر اس کا ردعمل دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن شہریار نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ لوگوں کے سوالات پر اس نے بتایا۔

"مجھے عالیہ مل گئی' ٹھیک ہے میکشاں کو اپنی زندگی پر اختیار ہے۔"

چنانچہ یوں ہشام اور میکشاں کے عشق کی داستانیں عام ہوتی رہیں ہشام بہت خوش نظر آتا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ شہریار اور میکشاں کی منگنی ٹوٹنے کا اعلان ہو تو وہ خود میکشاں سے اپنی منگنی کا اعلان کرے' وقت گزرتا رہا' ہشام اور میکشاں روزانہ ملاقات کرتے رہے۔

اور یہ ایک حسین شام کی بات ہے' آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے کبھی کبھی ننھی ننھی بوندیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتیں اور پھر روپوش ہو جاتیں۔

ہشام میکشاں کی آغوش میں سر رکھے لیٹا تھا۔ اس کے چہرے سے بے پناہ خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میکشاں کی شوخ آنکھیں اس وقت کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

ہشام نے اسے دیکھا اور بولا۔

"کیا سوچ رہی ہو میکشاں"؟

"کوئی خاص بات نہیں ہے"

"پھر بھی —— یہ موسم اور یہ خاموشی۔"

"میں سوچ رہی ہوں ہشام کہ اپنے والدین سے بات کروں وہ اپنی طرف سے منگنی توڑنے کا اعلان کردیں۔ شہریار کو تو پرواہ ہی نہیں ہے۔"

"میکشاں یہ بات بہت دنوں سے میری زبان پر تھی' لیکن میں تم سے نہ کہہ سکا تھا۔"

"میں محسوس کر رہی تھی ہشام۔"

"جلدی کرو میکشاں' اب میں تم سے دور رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔"

"شادی کے بعد تم کیا کرو گے ہشام؟"

"تمہیں لے کر کسی پرفضا مقام پر زندگی گزاروں گا' جہاں رہوں گا تمہیں ساتھ رکھوں گا۔"

"میں جانتی ہوں ہشام' تم کبھی جھوٹ نہیں بولتے' ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھو میری زندگی۔"

"خزانے کی بات درست ہے؟"

"سو فیصدی۔"

"کیا بلاشبہ وہ اتنا بڑا خزانہ ہے کہ ہم دنیا کے امیر ترین انسان کہلائیں گے؟" میکشاں نے پوچھا۔

"اس سے بھی کہیں زیادہ میری جان۔"

"لیکن تم اسے استعمال کیوں نہیں کرتے ہشام۔"

"انسانوں کی قسمیں ہوتی ہیں میکشاں کچھ لوگ گیدڑ صفت ہوتے ہیں ہمیشہ دوسروں کی پھینکی ہوئی ہڈی پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اپنے آپ کو ناکارہ بنا لیتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں ہلا کر کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ کچھ شیر صفت ہوتے ہیں۔ خود شکار کرتے ہیں خود کھاتے ہیں۔ بے شک یہ عظیم خزانہ ہے میکشاں۔ ہم یہ خزانہ نکال لیتے ہیں' رکھ دیتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے اور پوری بستی ڈوب جاتی ہے۔ اگر میرے اندر شیر کی صفت ہے میکشاں تو میں خزانہ چھوڑ کر تمہیں سیلاب سے نکال لے جانے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ میرے بازو میرا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ اور اگر گیدڑ صفت ہوں گا تو خزانہ میرے لئے تم سے زیادہ اہمیت رکھے گا۔ کیونکہ میں سوچوں گا کہ خزانہ مجھے دوبارہ نہیں ملے گا۔

میں خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہیں خوش رکھ سکتا ہوں۔ خزانہ ہو نہ ہو۔ میں جہاں ہوں گا۔ تمہارے لئے خزانہ مہیا کر دوں گا۔ میری پوری زندگی دیکھ لوگی میکشاں اور تم اعتراف کرتی ہو کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ خزانہ میرے باپ نے نہ جانے کہاں سے حاصل کیا تھا۔ وہ چھوڑ گیا' مر گیا۔ میں ابھی جوان ہوں' طاقتور ہوں' بوڑھا ہونے کے بعد ممکن ہے مجھے اس کی ضرورت پڑے' اس وقت دیکھا جائے گا' ورنہ میں بھی اسے اپنے بیٹے کے لئے چھوڑ جاؤں گا۔ ممکن ہے وہ میری طرح شیر صفت نہ ہو۔" آخر میں ہشام بعدی مسکرانے لگا۔

اور میکشاں ——— وہ منہ کھولے بیٹھی تھی۔

کافی دیر تک وہ منہ پھاڑے خاموش بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے اور پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر وہ عجیب سی آواز میں بولی۔

"ہشام ———"!

"جان ہشام ———"!

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"بے پناہ۔"

"میرے اوپر اعتماد کرتے ہو؟"

"خود سے زیادہ۔"

"تو ہشام' کل میں وہ خزانہ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں۔"؟

"بس میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تم نے اس راز کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا ہے' میں یہ راز جاننا چاہتی ہوں۔"

"ہوں" ——— ہشام کی آنکھوں میں گہری سوچ کے آثار تھے۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' ہم کل چلیں گے۔"

"شکریہ ہشام' اب اجازت دو۔"

"چلو ———" ہشام نے کہا اور دونوں واپس چل پڑے۔

بارش موسلا دھار تھی۔ شہریار سوچ رہا تھا کہ کیا اس بارش میں میکشاں آ سکے گی۔ مشکل ہی تھا۔ وقت بھی ہو گیا تھا۔ روزانہ رات کو اسی وقت' دنیا کی نگاہوں سے بچ کر میکشاں اس سے ملاقات کرنے آتی تھی۔ وہ دونوں مل کر ہشام کے بارے میں گفتگو کرتے۔ میکشاں شہریار کو بتاتی کہ آج ہشام نے اس کے کتنے بوسے لئے۔ کیسی کیسی گفتگو کی' اور دونوں مل کر خوب قہقہے لگاتے۔

لیکن آج سرشام ہی بادل چھا گئے تھے' اور پھر بارش شروع ہو گئی تھی اور شہریار سوچ رہا تھا کہ شاید آج میکشاں نہ آ سکے۔

لیکن مقررہ وقت پر اس نے میکشاں کو آتے دیکھا۔ وہ برساتی میں لپٹی چلی آ رہی تھی۔

"اوہ ——— وہ مجھے کس قدر چاہتی ہے' کیسی محبت کرنے والی لڑکی ہے' اب بہت کم وقت رہ گیا ہے' وہ میری ہو گی۔ ہم دولت سے کھیلنے والوں میں شمار کئے جائیں گے' کتنا

خوش نصیب ہوں میں' حسین بیوی اور بے پناہ دولت ایک ساتھ ملیں گی۔"

میکشاں قریب آگئی۔ اور شہریار دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔

"آہ —— میکشاں! میں مایوس ہونے لگا تھا۔"

"بارش بہت تیز ہے شہریار۔"

"ہاں' مجھے احساس ہے اور اپنے پیار پر ناز بھی۔"

"میں فوراً واپس جاؤں گی۔"

"کیوں؟——"

"گھر کے لوگ پریشان ہوں گے۔"

"اوہ۔ ٹھیک ہے۔"

"سنو شہریار —— بالآخر میں اسے خزانہ دکھانے پر تیار کر ہی بیٹھی۔"

"کیا —— کیا مطلب؟"

"کل وہ مجھے خزانہ دکھانے لے جائے گا۔"

"اوہ —— کیا تم ٹھیک کہہ رہی ہو میری روح؟؟"

"ہاں ——"!

"تب —— تب پھر؟ ——"

"تم ہمارا تعاقب کرو گے' لیکن نہایت ہوشیاری سے۔"

"آہ کتنی بڑی خوشخبری تم نے کتنی سادگی سے مجھے سنادی ہے' میں تمہیں کیا انعام دوں میکشاں۔" شہریار میکشاں کو گود میں لے کر ناچنے لگا۔

"لیکن تمہارا کیا پروگرام ہے شہریار' مجھے بتاؤ تمہارا کیا پروگرام ہے۔؟"

"خزانہ دیکھنے کے بعد تم ہشام کے ساتھ واپس چلی آنا۔ میں وہیں پوشیدہ ہو جاؤں گا۔ اور پھر میں کل راتوں رات خزانہ وہاں سے منتقل کر دوں گا بس یہ کام میرے لئے بہت آسان ہو گا۔"

"خوب۔ مناسب پروگرام ہے لیکن کیا تم اس پروگرام میں اپنے دوستوں کو بھی شامل کرو گے؟"

"توبہ کرو میکشاں' ایسے راز دوسروں کو نہیں بتائے جاتے' دوست دشمن بن جاتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو شہریار' بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میکشاں نے تائید کی' اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ شہریار سے رخصت ہو کر چلی گئی۔ لیکن شہریار کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

ہشام منتظر تھا' میکشاں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ وہ والہانہ انداز میں آگے بڑھا۔

"تم آگئیں میری روح۔"

"میں وقت پر آگئی ہوں ہشام۔" میکشاں نے کہا۔ "تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا۔"

"تم سے کیا ہوا وعدہ بھول سکتا ہوں۔" ہشام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہمیں کتنی دور چلنا پڑے گا"؟

"کوہ کسار کے اس سرے پر پُسپا کے غاروں میں۔"

"اوہ بڑی پراسرار جگہ ہے۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں' تمہیں خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" ہشام نے پیار سے کہا۔

"تو پھر آؤ چلیں۔" میکشاں نے کہا اور ہشام اس کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑا۔ پتھریلے راستے عبور کر کے کافی دیر کے بعد وہ بالآخر پسپا کے غاروں کے نزدیک پہنچ گئے۔ میکشاں درحقیقت خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

"ہشام" —— اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے میکشاں' میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"اپنا پستول مجھے دے دو ہشام۔"

"اوہ —— یہ لو۔" ہشام نے سادگی سے اپنا پستول نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ اور پھر وہ غاروں میں سے ایک غار میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد ایک کھلی جگہ آگئی۔

لیکن یہ جگہ ایک کنویں کے مانند تھی۔ اوپر بلندی تک سیدھی اور سپاٹ دیواریں تھیں۔

اور پھر اسی پراسرار جگہ ایک سوراخ کے اندر ہاتھ ڈال کر ہشام نے ایک کڑا گھمایا اور سامنے کی ایک چٹان اپنی جگہ سے سرک گئی۔ اس چٹان کے پیچھے ایک پوشیدہ غار تھا اور اس کی غار میں بہت سے صندوق چنے ہوئے تھے' ہشام نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا اور میکشاں اندر داخل ہو گئی۔ تب ہشام نے اسے صندوق کھول کر دکھانے شروع کر دیئے۔

میکشاں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ ہشام نے اسے ایک ایک صندوق دکھایا۔ اور پھر تمام صندوق دیکھ لینے کے بعد میکشاں نے ایک ٹھنڈی سانس لی' وہ لرزتے قدموں سے باہر نکل آئے۔ لیکن باہر قدم رکھتے ہی میکشاں چونک پڑی۔ شہریار سینہ تانے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا' جس کا رخ ہشام کی طرف تھا۔

ہشام حیران رہ گیا۔

"شہریار ـــــ تم؟ ـــــ"

"ہاں میرے دوست دراصل میرا انداز فکر تم سے کچھ مختلف ہے۔ ہشام بعدی تم نے کچھ احمقانہ اصول تراش رکھے ہیں۔ اور میں ان اصولوں کا مخالف ہوں۔ دولت اس لئے نہیں ہوتی کہ اسے پہاڑوں میں پوشیدہ رکھا جائے۔ وہ انسان کی اہم ضرورت ہے' اسے باہر آنا چاہئے' میں نے سوچا کہ دولت کے اس سانپ کو ہلاک کر دوں اور اسے استعمال میں لے آؤں۔"

"لیکن تم یہاں کیسے پہنچ گئے شہریار؟"

"سب تمہاری طرح احمق نہیں ہوتے۔ ہمیں یعنی مجھے اور میکشاں کو بہتر زندگی گزارنے کے لئے دولت کی ضرورت تھی' اور دولت تمہارے پاس تھی۔ چنانچہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہم نے ایک پروگرام بنایا۔ میں نے عالیہ سے محبت کا کھیل کھیلا تاکہ میکشاں کی مجھ سے علیحدگی کا جواز پیدا ہو سکے' اور پروگرام کے مطابق میکشاں نے تم سے محبت کا کھیل رچایا۔ مقصد صرف اس خزانے کا حصول تھا۔"

"اوہ۔ بلاشبہ تم دونوں کامیاب کھلاڑی ہو شاید میکشاں نے مجھ سے پستول اسی لئے لے لیا تھا۔"

"ہاں۔ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہے۔"

"کیا تم یقین کرو گے میرے دوست خزانے کے جانے کا مجھے کوئی افسوس نہیں ہے' لیکن میکشاں نے میرے اصولوں سے اتفاق نہیں کیا۔ بس اس بات کا غم ہے' خیر اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"بس تم سے تھوڑی گفتگو کریں گے' اس کے بعد تمہیں قتل کر کے اسی غار میں دفن کر دیں گے' خزانہ نکال لئے جائیں گے' شادی کریں گے اور عیش کریں گے۔" شہریار نے مزے سے کہا۔

"لیکن یہ تبدیلی کیوں شہریار' تمہارا پروگرام تو کچھ اور تھا؟" میکشاں نے کہا۔

"اپنے اپنے اصول ہیں میکشاں' میں سانپ کو زخمی کر کے چھوڑنے کا عادی نہیں ہوں' ممکن تھا ہشام کبھی ہمارا سراغ نکال لیتا۔"

"اصول کی بات ہے شہریار تو میرا خیال ہے سب کے کچھ نہ کچھ اصول ہوتے ہیں۔ سنو شہریار ہشام دولت مند ہونے کے باوجود انسانیت پسند ہے اور مجھے اس کی شخصیت بہت مستحکم نظر آتی ہے۔ اگر یہ بات تھی تو تم نے رات ہی مجھے اپنے پروگرام سے آگاہ کیوں نہ کر دیا۔" میکشاں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم عورت ہو میکشاں' شاید میرے پروگرام سے اتفاق نہ کرتیں۔"

"گویا دولت کے لئے تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔"

"میں تم سے معافی مانگ لوں گا۔ لیکن سانپ کا مرجانا ہی ٹھیک ہوتا ہے۔"

"بات اصول کی ہے شہریار' چنانچہ "ـــــ اچانک میکشاں نے پستول کا رخ شہریار کی طرف کر کے اس کا ٹریگر دبا دیا' اور شہریار کی پیشانی میں ایک بڑا سا سوراخ ہو گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن آواز نہ نکل سکی۔

"ہر انسان کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔"

"میکشاں"——ہشام دبی دبی آواز میں چیخا۔

میکشاں نے پستول ہشام کے سامنے پھینک دیا۔ اور پھر وہ سرد لہجے میں بولی:

"اس میں شک نہیں ہے ہشام کہ میں نے شہریار کے ساتھ مل کر یہ سازش کی تھی۔ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے تمہارے اندر چھپا ہوا حقیقی انسان نہیں دیکھا تھا۔ پھر میں تمہارے اصولوں سے متاثر ہو گئی' اور فیصلے کے لئے میں نے اسی جگہ کا انتخاب کیا' بات اصول کی ہے' تمہارے خزانے کے راز سے میں واقف ہو گئی ہوں' عورت ہوں' ممکن ہے کسی سے اس کا تذکرہ کر بیٹھوں۔ چنانچہ مناسب یہ ہے کہ تم مجھے ابھی گولی مار دو' اور خزانے کے اس راز کو راز رہنے دو۔"

ہشام نے آگے بڑھ کر پستول اٹھالیا۔

"ہاں میکشاں بات اصول کی ہے۔" اس نے پستول کی نالی کا رخ میکشاں کی طرف کر دیا۔

"میں بھی اصول پسند ہوں۔" میکشاں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ وہ ابھی سے اپنے پہلو میں چبھن محسوس کر رہی تھی' پھر اس نے دونوں آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا:

"آہ——مجھے پستول سے خوف محسوس ہوتا ہے' جلدی سے گولی چلا دو' تاکہ میں خوف کی اذیت سے نجات حاصل کر لوں۔" اس نے دونوں آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔

لیکن چند ساعت کے بعد اسے اپنے ہونٹوں پر ایک گداز' جانی پہچانی نمی کا احساس ہوا۔ اور اس نے آنکھیں کھول دیں' تب ہشام کے مضبوط ہاتھ اس کی کمر کے گرد لپٹ گئے' طویل بوسے سے فارغ ہو کر ہشام نے کہا:

"بات اصول کی ہے میکشاں۔ تم نے شہریار کو اس کی لا اصولی کی سزا دی ہے' مجھے کیا اعتراض ہے' میری محبت تو اپنی جگہ قائم ہے۔" اور میکشاں کے بازو اس کی گردن میں حمائل ہو گئے۔

"ہم یہ دولت استعمال نہیں کریں گے' بلکہ اسے اپنی اولاد کے لئے چھوڑ دیں گے۔ ممکن ہے وہ شہریار کی طرح گیدڑ صفت ہو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

شعبدہ گر

ہوٹل مُدوے کے خوبصورت ریکریشن ہال میں کافی رونق تھی۔ آرکسٹرا مدھم سروں میں ایک دھن بجا رہا تھا۔ اور نوجوان جوڑے چوبی فرش پر متحرک رہے تھے۔ مُدوے کا ریکریشن ہال سارے شہر کے ہوٹلوں میں سب سے خوبصورت اور جدید ترین تھا اس کے علاوہ ہوٹل مُدوے پورے شہر کا سب سے خوبصورت ہوٹل تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ عام لوگ ادھر آنے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے چنانچہ یہاں آنے والوں کی تعداد امیر ترین لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ایسے ہی لوگ یہاں آتے تھے جو زندگی کی دلچسپیوں پر زیادہ سے زیادہ خرچ کر سکتے تھے۔ ویسے ان اخراجات کا صحیح بدلہ بھی انہیں مل جاتا تھا۔ یعنی ہوٹل کی تفریحات بہت عمدہ تھیں۔ یہاں کے منتظمین اپنے گاہکوں کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کے لئے بہترین پروگرام ترتیب دیا کرتے تھے اور اکثر یہاں مختلف ممالک کے ثقافتی شو اور ایسے ہی دوسرے کلچرل پروگرام بھی ہوا کرتے تھے۔

اس وقت بھی ریکریشن ہال بھرا ہوا تھا۔ ساری ہی میزیں پر ہو چکی تھیں سوائے ان چند مخصوص میزوں کے جن پر ہوٹل میں قیام کرنے والوں میں سے ان افراد کی جو ریکریشن ہال میں اپنی نشست بک کر لیا کرتے تھے چٹیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ ایسی میزیں عموماً خالی تھیں جبکہ بعض جگہ لوگوں کو کھڑا بھی ہونا پڑا تھا۔ ظاہر ہے ریزرو میزوں پر وہ بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ یا اگر کوئی کوشش بھی کرتا تو اس سے معذرت کر لی جاتی۔

نینی کی میز اس ہال میں مخصوص تھی وہ باقاعدگی سے اس کی ادائیگی کیا کرتی تھی اور

اکثر یہاں آنے والوں میں سے تھی۔ البتہ وہ رقص نہیں کرتی تھی۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اسے رقص سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ اسکے ڈیڈی کی جانب سے اسے رقص کرنے کی اجازت نہیں تھی اور معاہدے کے تحت ساری تفریحات میں حصہ لینے کے باوجود جن چیزوں سے اسے منع کیا گیا تھا اس پر عمل کرنا ضروری تھا۔ فیروز صاحب حالانکہ ایک بزنس مین تھے لیکن اولاد پر پوری توجہ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے اور دونوں بیٹیوں کے درمیان ایک بزرگانہ اور دوستانہ رشتہ رکھا تھا اور اس رشتے کے تحت انہوں نے پر محبت انداز میں چند شرائط ان کے لئے مخصوص کردی تھیں اور اس کے لئے انہیں اجازت دی گئی تھی کہ زندگی جس طرح چاہیں گزاریں۔

دونوں بیٹیوں نے معاہدے کے تحت ان شرائط کو تسلیم کر لیا تھا وہ اپنے ڈیڈی کی انصاف پسند طبیعت سے بہت متاثر تھیں البتہ ایک بڑی مشکل چیز یہ تھی کہ انہوں نے دو جڑواں بہنوں کی ایک فطری محبت کی مثال کو غلط ثابت کر دکھایا تھا۔ نینی کی می ان دونوں کو جنم دیتے ہوئے اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں اور فیروز صاحب کو ان دونوں جڑواں بیٹیوں کو ماں بن کر پالنا پڑا۔ دونوں ایک دوسرے سے نفرت تو نہیں کرتی تھیں لیکن دونوں میں شدید رقابت تھی۔ نینی جو لباس پہنتی فرحت اس کا الٹ لباس پہنتی۔ نینی جو چیز کھاتی فرحت ہمیشہ اس سے مختلف چیز کھاتی۔ دونوں اپنی اپنی چیزوں پر پوری طرح قبضہ جمائے رکھنے کی کوشش میں سرگرداں رہتیں۔ ایک دوسرے کی تمام چیزوں سے نفرت کی جاتی تھی اور اکثر دونوں میں بات بات پر جھگڑا ہو جایا کرتا تھا۔ ساری باتیں تھیں لیکن دونوں ہی لڑکیاں اپنے ڈیڈی کے بتائے ہوئے اصولوں کی پابند تھیں اور ان کے سامنے یا پیچھے انحراف نہیں کیا جاتا تھا۔ باقی ساری آزادیاں انہیں حاصل تھیں صرف فیروز صاحب نے کچھ مخصوص چیزیں انہیں بتا دی تھیں کہ ان سے پرہیز کیا جائے اور دونوں لڑکیاں اس پر عمل کرتی تھیں۔

چنانچہ نینی مڈوے ہوٹل میں ہمیشہ آتی تھی اور تنہا آتی تھی لیکن بے شمار نوجوانوں کی کوشش کو اس نے ناکام بنا دیا تھا۔ ہمیشہ اپنی میز پر تنہا ہوتی اور کوئی اس کا ساتھی نہیں ہوتا تھا چند لوگوں سے صرف شناسائی تھی اور یہ وہ تھے جو ہوٹل میں مستقل آنے والے

تھے لیکن شناسائی' شناسائی کی حدود سے آگے نہ بڑھی اور اس نے ان لوگوں کو خود سے قریب ہونے کی مہلت نہیں دی تھی لیکن یہ بات بھی نہیں کہ نینی ان میں سے کسی سے متاثر نہ ہو۔ چند افراد اسے پسند تھے مگر صرف پسند کی حد تک۔ اس پسند کے باوجود اس نے انہیں قریب آنے کا موقع نہیں دیا تھا اور اس وقت بھی وہ ریکریشن ہال میں ہونے والے رقص کو دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اتفاقیہ طور اس کی نگاہ اس نوجوان کی جانب اٹھ گئی جو انتہائی حسین خدوخال کا مالک تھا۔ دودھ جیسے رنگ کے ساتھ نیلی آنکھیں بڑی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ متناسب قدوقامت کے ساتھ پر رعب انداز میں چلتا ہوا وہ ہال میں داخل ہوا اور پھر مسکراتی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا پھر اس نے ہال میں لگی ہوئی روشنیاں دیکھیں۔ ایک لمحے کے لئے اوپر نگاہ کی اور دوسرے لمحے۔ ہال میں تاریکی پھیل گئی۔ چند سریلی چیخیں گونجیں اور اس کے فوراً بعد سریلی چیخیں واپس آ گئی تھیں جوڑے رقص کرتے کرتے رک گئے تھے۔ نوجوان آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھانے لگا اور ہال میں عجیب سی افراتفری پھیل گئی۔ لائٹ بند ہوتی جل جاتی بند ہوتی جل جاتی یوں لگتا تھا جیسے روشنی اس کے پیروں تلے آ کر دب جاتی ہے اور جیسے ہی پاؤں اٹھتا ہو تو واپس آ جاتی ہو۔ چاروں طرف عجیب سی آوازیں گونجنے لگی تھیں تب نوجوان ایک میز کے قریب پہنچ گیا جس پر ریزرویشن چٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ نینی کو نہ جانے کیوں یہ محسوس ہوا تھا کہ روشنی کی اس آنکھ مچولی میں اس آدمی کا ہاتھ ہے۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ یہی بتا رہی تھی جیسے وہ روشنی پر قابض ہو۔ ابھی تک اس نے کسی خاص جانب توجہ نہیں دی تھی۔ بس یوں ہی اڑتی اڑتی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

میز پر بیٹھنے کے بعد روشنی حسب معمول ہو گئی تھی لیکن رقص گاہ میں کھڑے ہوئے جوڑے پریشان تھے نہ جانے وہ کیا محسوس کر رہے تھے تب انتظامیہ کی طرف سے ایک اناؤنسر نے آ کر مہمانوں سے معذرت کی۔

نوجوان اب اطمینان سے بیٹھ گیا تھا۔ چند ساعت وہ مسکراتی نگاہوں سے اس ماحول کو دیکھتا رہا پھر اس نے داہنا ہاتھ میز پر رکھا اور اس کی ایک انگلی اٹھا دی۔ موسیقی ایک دم

رک گئی' روشنی نہیں گئی تھی البتہ موسیقی رک گئی تھی۔ جوڑے چند ساعت تو موسیقی کے بغیر ہی رقصاں رہے اس کے بعد جھنجھلائی ہوئی نگاہوں سے سازندوں کی جانب دیکھنے لگے جو بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے سازوں کو ٹٹول رہے تھے لیکن کسی ساز سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ یہاں تک کہ ڈرم بجانے والا ڈرم پر ضرب لگاتا مگر آواز نہ نکلتی۔ تمام سازندے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر جھک جھک کر اپنے سازوں کو دیکھنے لگے لیکن بظاہر کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی۔ انتظامیہ کے چند افراد پھر وہاں پہنچ گئے۔ ایک شخص نے ڈرم پر ہاتھ مارا اور نوجوان نے اچانک انگلی نیچے کرلی اس کی آواز دھم سے گونجی تھی۔ وہ شخص اچھل پڑا دوسرے لوگوں نے ساز بجانے کی کوشش کی لیکن باقی سارے ساز خاموش تھے۔ پھر ڈرم بجانے والے شخص نے ڈرم پر چوبی ہتھوڑیاں ماریں لیکن آواز نہ نکلی اور دفعتاً" پھر سے ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ سارے ساز خود بخود چیخ پڑے تھے۔ وہاں موجود تمام افراد کی نگاہیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں۔ منیجر دوڑا ہوا قریب پہنچ گیا۔ لوگ اب اس عجیب و غریب واقعہ پر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ صورت حال تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن سب کے سب ہی انتظامیہ کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور ایک دوسرے سے گڑبڑ کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ منیجر نے ایک بار پھر مائیک سنبھال لیا اور شرمندہ لہجے میں بولا۔

"خواتین و حضرات میں سخت شرمندہ ہوں نہ جانے یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے کسی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا آپ خود ہی دیکھ رہے ہوں گے۔ آپ چند ساعت توقف کریں ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ صرف چند ساعت آپ کے اس قیمتی وقت کے ضیاع کا مجھے بیحد افسوس ہے لیکن ابھی سارے انتظامات درست ہوئے جاتے ہیں۔ لوگ چوبی فرش سے اتر کر اپنی میزوں کی جانب آنے لگے اس کے بعد چاروں طرف کی میزیں آباد ہو گئیں۔ منیجر اور انتظامیہ کے دوسرے لوگ بھاگے بھاگے پھر رہے تھے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ سب کیا ہے۔ ساز کبھی بجتے کبھی نہ بجتے حالانکہ ان میں سے کچھ ساز ایسے تھے جن کا الیکٹرک سے کوئی تعلق نہ تھا پھر شاید الیکٹرک کے نظام کو چیک کرنے والوں نے منیجر کو اطلاع دی کہ

الیکٹرک کا سارا نظام درست ہے لیکن یہ ساز جو نہیں بج رہے تھے انہیں کیا ہوا۔ سازندے خود بھی اس بات کو جاننے سے قاصر تھے اور جب خاصی دیر گزر گئی اور انتظامیہ کے چہرے پر سخت پریشانی کے آثار ظاہر ہونے لگے تو یہ نوجوان اپنی جگہ سے اٹھ گیا وہ اسٹیج کی جانب جا رہا تھا۔ اس نے منیجر کے ہاتھ سے مائیک لے لیا تھا جو بار بار لوگوں سے معذرت کر رہا تھا۔

"خواتین و حضرات میرا نام سامری ہے۔ آپ نے کلاسیکی ادب میں میرے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہو گا یعنی وہی سامری جادوگر جس کا بڑے بڑے لوگوں سے مقابلہ ہو چکا ہے خواتین و حضرات آپ کی اس دنیا میں ایک جدید شکل لے کر حاضر ہوا ہوں۔ یعنی اب نہ تو میرے سر پر بڑے بڑے سینگ ہیں نہ میرے کانوں کی لمبائی چھ انچ ہے اور نہ ہی میرے بدن میں دوسری تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ میں آپ ہی جیسا انسان ہوں لیکن میری قوتیں آپ سے مختلف ہیں۔ دراصل میں کسی بھی شہر کسی بھی ملک جانے کے بعد اپنا تعارف اسی انداز میں کراتا ہوں اور اس کے بعد یہ درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنا شو پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ تو خواتین و حضرات ساز اور روشنیوں کا یہ کھیل میرا مرہون منت ہے اور اب میں اس ہوٹل کے منیجر سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ سے گفتگو کریں نوجوان نے مائیک منیجر کے حوالے کر دیا۔ سارے ہال کی نگاہیں دلچسپی سے اس شخص پر ٹکی ہوئی تھیں اور منیجر کے چہرے پر عجیب سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔

"لیکن جناب اگر یہ درست ہے تو آپ کو ہم سے رابطہ قائم کرنا چاہئے تھا۔ آپ نے یہ مناسب حرکت کی ہے۔"

"اس کے لئے معذرت خواہ ہوں منیجر لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ اگر آپ کے مہمان میری اس شعبدہ گری کو پسند کریں تو ممکن ہے آپ مجھے اپنے ہوٹل میں شو کرنے کی اجازت دے دیں۔ یہاں اور کوئی ہوٹل مجھے اس قابل نظر نہیں آیا جس میں اپنے کمالات پیش کروں۔"

"براہ کرم آپ میرے آفس میں تشریف لائیے میں آپ سے بات چیت کروں گا۔" منیجر نے کہا۔

"نہیں منیجر میرا خیال ہے کہ میں پہلے آپ کے مہمانوں سے اس سلسلے میں اجازت لے لوں۔" نوجوان نے کہا اور پھر مائیک دوبارہ ہونٹوں کے سامنے لا کر بولا۔ "معزز مہمانو! آپ لوگوں سے معذرت کے بعد اور آپ لوگوں کے مشغلہ میں مداخلت کے لئے شرمندگی کا احساس لے کر میں آپ سے اپنے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ لوگ اس اسٹیج پر میرے کمالات دیکھنا پسند کریں گے۔"

"ضرور کریں گے ضرور کریں گے۔ چاروں طرف سے آوازیں ابھریں اور پھر ایک آواز آئی۔ "لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ صحیح ہے۔"

"یقیناً یقیناً۔" براہ کرم جن صاحب نے یہ سوال کیا ہے ذرا اپنی جگہ سے کھڑے ہو جائیں۔ نوجوان نے کہا اور ایک اور نوجوان اپنی میز پر سے کھڑا ہو گیا اس کے ساتھ ہی دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ نوجوان کے ہاتھ میں کسی مشروب کا گلاس تھا۔ تب اس نوجوان نے جس نے اپنا نام سامری بتایا تھا اپنا ہاتھ اس انداز میں آگے بڑھایا جیسے نوجوان کے ہاتھ سے اس مشروب کا گلاس لینا چاہتا ہو اور دوسرے لمحے گلاس نوجوان کے ہاتھ سے نکل گیا اور آہستہ آہستہ فضا میں تیرتا ہوا سامری کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

"آپ کی اس مہمان نوازی کا شکریہ۔" اس نے نوجوان کے مشروب کا گلاس ہونٹوں سے لگا کر اسے خالی کرتے ہوئے کہا اور پھر اس نے گلاس آگے بڑھا دیا جو تیرتا ہوا نوجوان کی میز پر واپس پہنچ گیا۔

"جی اب آپ کیا سوال کرنا چاہتے ہیں۔؟" سامری نے پوچھا لیکن نوجوان کو اب سوال کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی اس کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ تھی اور وہاں میں سرلی چیخیں گونج رہی تھیں۔ لوگ مختلف انداز میں ہال میں اس کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے پھر چاروں طرف سے تالیوں کی آوازیں گونج اٹھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہوٹل کے مہمانوں نے سامری کو قبول کر لیا تھا۔

"نوازش آپ لوگوں کی' تو پھر منیجر معاملے کی بات کا کیا ہو گا۔؟"

"براہ کرم آپ میرے آفس میں آئیں۔" منیجر نے کہا اور نوجوان نے گردن جھکا دی۔ لوگ طرح طرح کی آوازیں نکال رہے تھے کوئی اس سے مزید اور شعبدوں کی فرمائش

کر رہا تھا اور کوئی فقرے کس رہا تھا بہرصورت منیجر نوجوان کے ساتھ اپنے آفس کی طرف چلا گیا۔ چند ساعت کے بعد رقص کے لئے پھر موسیقی شروع ہو گئی لیکن ہال میں موجود جوڑے اس نوجوان کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ سب اس سے کافی متاثر معلوم ہوتے تھے اور نینی سوچ رہی تھی کہ اب اسے ہوٹل کے اس ہال میں شو کرنے کی اجازت ضرور مل جائے گی لیکن اس شریر نوجوان نے اپنا تعارف جس انداز میں کرایا تھا وہ واقعی دلچسپ تھا اور کسی قدر جارحانہ بھی۔ منیجر اگر چاہے تو اس مداخلت پر اسے پولیس کے حوالے بھی کر سکتا ہے۔ لیکن نوجوان نینی گردن جھکائے سوچ میں ڈوب گئی۔ اس نوجوان کی خوبصورت شخصیت نے اس پر بڑا اثر کیا تھا۔

منیجر نوجوان کو لے کر اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔ اس نے آفس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

لیکن اس کی اس حرکت سے نوجوان کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں پیدا ہوا تھا وہ لاابالی انداز میں منیجر کے کمرے میں نگاہیں دوڑا رہا تھا۔

"تشریف رکھئے۔" منیجر نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور نوجوان اطمینان سے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ منیجر کی آنکھوں میں ناخوشگوار سے تاثرات نمایاں تھے۔

"کیا آپ کا قیام ہمارے ہوٹل میں ہے۔؟"

"جی ہاں۔ کمرہ نمبر ستائیس میں آج ہی دن میں یہاں آیا ہوں۔"

"آپ کا تعلق کہاں سے ہے۔؟"

"اسی سرزمین سے' میں کسی سیارے کا باشندہ نہیں ہوں۔"

نوجوان نے جواب دیا۔

"کیا آپ کسی دوسرے ملک سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں ملک ملک کی سیاحت میرا محبوب مشغلہ ہے' اس لحاظ سے آپ میرا تعلق کسی ایک ملک سے نہیں کہہ سکتے۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"لیکن جناب ہمارا ملک ابھی اتنا ایڈوانس نہیں ہے کہ اس قسم کی حرکتوں کا متحمل ہو سکے' آپ نے جو کچھ کیا وہ ایک نازیبا انداز تھا۔"

"مجھے علم ہے مینجر کہ آپ نے وہ انداز پسند نہیں کیا ہو گا لیکن دیکھئے ہوٹل میں قیام میرا حق ہے اور اپنی شعبدہ گری کا اظہار بھی میرے لئے اسی انداز میں ممکن ہے' اس طرح میں لوگوں کو متاثر کر کے اپنی ایک قیمت مقرر کر لیتا ہوں' اس ہوٹل میں آ کر میں نے اسے پسند کیا اور یہی سوچا کہ میں یہاں اپنے کمالات کا مظاہرہ کروں اگر میں آپ سے درخواست کرتا تو ممکن ہے آپ میری شعبدہ گری کو زیادہ پسند نہ کرتے اور اس طرح میں اپنی کوشش میں ناکام رہتا لیکن اب آپ کے مہمانوں نے مجھے قبول کر لیا ہے اس لئے آپ کو میری شرائط پر مجھے اپنے ساتھ رکھنا ہو گا' میں آپ سے معاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کیا یہ بلیک میلنگ نہیں ہے۔"؟ مینجر نے پوچھا۔

"آپ اسے بلیک میلنگ کے خانے میں فٹ کر سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے یہ قانونی طور پر بلیک میلنگ نہیں ہے۔" نوجوان نے لاپرواہی سے کہا۔

"میرا خیال ہے اگر میں آپ کو مسترد کر دوں تو بے انصافی نہیں ہو گی' کیونکہ ہر صورت میں اس ہوٹل کا مینجر ہوں اور یہ میری مرضی ہے کہ میں کسی کو یہاں کچھ کرنے کی دعوت دوں یا نہ دوں' آپ کے اس انداز کو میں نے پسند نہیں کیا ہے اس لئے میں آپ کو شو کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا' حالانکہ آپ اپنے طور پر مجھ سے ملنے کی کوشش کرتے اور مجھے اپنے بارے میں بتاتے تو ممکن تھا کہ میں لوگوں کی دلچسپی کے لئے آپ سے کوئی معاہدہ کر لیتا لیکن اب میں اس کے لئے مجبور ہوں۔" مینجر نے ناخوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

"جیسا آپ پسند کریں مینجر۔" نوجوان نے جواب دیا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تو آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ یہ ہوٹل بھی چھوڑ دیں۔"

"میں آپ کی درخواست نامنظور کرتا ہوں مینجر اور اس سلسلے میں آپ کو قانونی چارہ جوئی کی اجازت بھی ہے' باقی رہا مسئلہ میرے معاہدے کا' تو بہرصورت آپ اسے جتنی دیر ملتوی کریں گے میرا معاوضہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔" نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر اس نے اپنے ہاتھ کا ایک پنجہ پھیلا دیا۔ دوسرے لمحے مینجر کی میز پر رکھی ہوئی تمام چیزیں فضا میں معلق ہو گئیں ٹیلیفون' بڑے' ایش ٹرے' پیپر ویٹ' اور سارے کاغذات میز سے

تقریباً کئی فٹ اونچے اڑ گئے تھے' نوجوان دروازے سے باہر نکل گیا۔

مینجر بوکھلائے ہوئے انداز میں اچھل اچھل کر ایک ایک چیز کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار تھے اسی وقت ایک سپروائزر اندر داخل ہوا اور مینجر اچھلتے اچھلتے رک گیا۔ وہ پھاڑ کھانے والی نگاہوں سے سپروائزر کو دیکھنے لگا تھا اور سپروائزر آنکھیں پھاڑے ہوئے فضا میں معلق تمام چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔"؟ مینجر حلق پھاڑ کر چیخا لیکن سپروائزر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میز کے قریب پہنچ کر گردن اٹھائے ان تمام چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا جناب۔"؟ اس نے متحیرانہ لہجے میں پوچھا۔

"میں پوچھتا ہوں تم کیوں آئے ہو۔"؟ مینجر خونخوار لہجے میں بولا۔ اور سپروائزر ایک دم سنبھل گیا۔

"وہ جی جناب کچھ معلوم کرنے کے لئے آیا تھا۔"

"بھاگ جاؤ۔" مینجر نے چیخ کر کہا اور سپروائزر الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ لیکن وہ پلٹ پلٹ کر فضا میں معلق چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ تب مینجر نے آگے بڑھ کر اپنے آفس کے دروازے کو بند کیا اور پھر واپس پلٹ کر میز پر چڑھ گیا۔

میز پر پہنچ جانے کے بعد بھی اس کے ہاتھ ان تمام چیزوں تک نہیں پہنچ رہے تھے' تب اس نے میز پر کرسی رکھی اور پھر کرسی پر چڑھ گیا' سب سے پہلے اس نے ٹیلیفون کو پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے ٹیلیفون ٹیلیفون نہ ہو بلکہ ایک فولادی ستون ہو' مینجر کوشش کے باوجود اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکا تھا پھر وہ ایک ایک چیز کو ٹٹولتا رہا' لیکن ساری چیزیں فضا میں اس طرح جمی ہوئی تھیں کہ مینجر انہیں ہلا بھی نہیں سکتا تھا' چونکہ وہ خود بھی بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا اس لئے کرسی پر چڑھتے ہوئے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا اور پھر وہی ہوا یعنی جب اس نے کرسی سے اترنے کی کوشش کی تو کرسی ڈس بیلنس ہو گئی اور مینجر دھڑام سے زمین پر آ رہا۔

موٹا قالین ہونے کی وجہ سے اسے چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن جس بری طرح سے گرا تھا اس کی وجہ سے چند ساعت اٹھ نہ سکا پھر وہ بہت جھنجلائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو

گیا۔ اس کے چہرے پر شدید ترین حیرانی کے آثار نظر آ رہے تھے اور وہ سارے کمرے میں پاگلوں کی طرح چکراتا پھر رہا تھا۔

"کیا کروں' کیا کروں' میں پولیس کو ٹیلیفون کروں گا' میں اسے گرفتار کرا دوں گا۔" اس نے سوچا اور دروازے کی جانب بڑھا۔ یہاں تو ٹیلیفون تھا نہیں کہ وہ پولیس کو رنگ کر کے بلوائے' اس لئے کہیں باہر سے ٹیلیفون کرنا پڑتا۔

چند ساعت کے بعد وہ ایک دوسرے آفس میں پہنچا اور وہاں اس نے میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا لیا' ریسیور اٹھانے کے بعد اس نے ڈائل پر پولیس کے نمبر گھمانے کی کوشش کی لیکن ڈائل ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا' منیجر نے شدید کوشش کی تو فون کا ڈائل ٹوٹ گیا۔

"اوہ' اوہ یہ بھی اس کی حرکت ہے۔" منیجر نے گھونسہ بناتے ہوئے کہا اور پھر ٹیلیفون کا ریسیور ٹیلیفون پر پٹخ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک وہ اسی طرح پریشان بیٹھا رہا' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے پھر چند ساعت کے بعد ذرا دماغ ٹھنڈا ہوا تو اس نے سوچا کہ خواہ مخواہ کی مصیبتیں مول لینے سے کیا فائدہ اگر کسی طرح خود جا کر پولیس سے رابطہ قائم کیا جائے تو پولیس ہی کون سا بخش دے گی پولیس اس شخص کے خلاف کوئی خاص چارج بھی نہیں لگا سکتی تھی' وہ شعبدہ گر تھا۔ غیر ملکی تھا اور صرف شو کرنے کی اجازت چاہتا تھا' لوگوں نے بھی اسے پسند کیا تھا اگر منیجر کہہ سکتا تھا تو صرف یہی کہہ سکتا تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر پریشان کر کے ملازمت حاصل کرنا چاہتا ہے' اس طرح پولیس اس نوجوان کو اس بات سے روک تو سکتی تھی لیکن کوئی سزا نہیں دے سکتی تھی اور اگر واپس آنے کے بعد وہ پھر وہی حرکتیں شروع کر دے تو منیجر کی اپنی کیا حیثیت رہ جائے گی۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ اس کی بات مان لی جائے۔

حالانکہ منیجر اس میں اپنی سبکی محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس طرح کسی کو ملازمت دینا اس کی شان کے خلاف ہے لیکن بہرصورت وہ زیادہ مضبوط اعصاب کا انسان نہیں تھا اور بلاوجہ الجھنیں ڈالنے کا شوقین بھی نہیں تھا چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد اس نے یہی فیصلہ کیا کہ نوجوان سے ملاقات کرے' اپنے آپ کو پوری طرح پرسکون کرنے کے بعد

پہلے وہ ڈائننگ ہال میں آیا' پھر ریکریشن ہال کا جائزہ لیا تو نوجوان وہاں نہیں تھا اور پھر وہ کمرہ نمبر 27 کی جانب چل پڑا۔

دروازے پر دستک دی تو اندر سے نوجوان کی آواز سنائی دی۔

"آ جاؤ کون ہے"؟

اور منیجر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ نوجوان ایک آرام کرسی میں دراز آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا تھا' منیجر کے قدموں کی چاپ پر اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کے ہونٹوں پر پھر وہی غصہ دلانے والی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اوہ' ڈیئر منیجر آؤ! میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" نوجوان نے مسرت آمیز لہجے میں کہا اور منیجر کو پھر غصہ آنے لگا لیکن اس بار اس نے غصے کو پینے کی کوشش کی تھی اور پھر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارے خیال میں یہ طریقہ جائز ہے۔"؟ اس نے سوال کیا۔

"اصول اصول ہوتے ہیں منیجر میں جائز اور ناجائز کے چکر میں نہیں پھنستا' حالانکہ اگر میں چاہتا تو تم سے رابطہ قائم کر کے ہی کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن اگر میں نے تھوڑی سی شعبدہ گری کے نمونے پیش کر دیئے تو اس میں ایسی کون سی بری بات ہو گئی' تمہیں میرے خیال میں اس قدر چراغ پا نہیں ہونا چاہئے تھا۔"

"کمال کی باتیں کرتے ہو تم یہ ایک معزز ہوٹل ہے' شہر میں نیک نام ہے اور میں خود بھی ایک معزز آدمی ہوں یعنی اس ہوٹل کا منیجر اگر تم شریفانہ انداز میں مجھ سے اس بارے میں بات کرتے تو میں ہوٹل کے لئے یہ دلچسپی حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتا لیکن تم خود سوچو تمہارا یہ انداز بہتر ہے۔" منیجر نے سوال کیا۔

"بہتر تو نہیں ہے منیجر لیکن مجبوری جو کر چکا ہوں وہ تو کر ہی چکا ہوں۔"

"اور جو کچھ کر چکے ہو اس پر شرمندہ نہیں ہو۔"

"شرمندہ تو بالکل نہیں ہوں چونکہ میں نے اپنا فن کا مظاہرہ کیا ہے اگر تمہیں کوئی پریشانی ہوئی ہے میری وجہ سے تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔"

"ہوں۔" منیجر نے بھاری آواز میں کہا اور پھر بولا۔ "بہرصورت میں نے تمہاری

اس حرکت کو پسند نہیں کیا ہے لیکن اس کے باوجود میں نہیں چاہتا کہ میرے ہوٹل میں ہنگامے ہوں اور اس کے بارے میں اخبارات میں خبریں چھپیں۔"

"چاہتا تو میں خود بھی نہیں ہوں مینجر لیکن میرا دوسرا قدم یہی ہوتا ہے، یعنی اگر کہیں میری بات قبول نہ کی جائے تو پھر اخبارات میری پبلسٹی کا ذریعہ بنتے ہیں اور مجھے کہیں نا کہیں شو کرنے کی اجازت مل جاتی ہے۔"

"کھلی بلیک میلنگ ہے یہ کھلی بلیک میلنگ۔" مینجر نے ہتھیلی طور پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا لیکن بہرصورت میں تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں بولو کیا خواہش رکھتے ہو۔"

"کوئی خاص نہیں مینجر ہفتے میں تین بار مجھے شو دیا جائے اور اس کے لئے میں تمہاری کرنسی کے مطابق ہر شو کا معاوضہ پانچ ہزار روپے وصول کروں گا۔"

"پانچ ہزار یعنی ایک ہفتے میں پندرہ ہزار روپے اور ایک مہینے میں ساٹھ ہزار روپے کیوں۔" مینجر نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"ہاں مینجر یہی میرا معاوضہ ہے اس سے کم میں قبول نہیں کر سکتا۔"

"لیکن میں کسی ایک شو کے لئے اتنی بڑی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔ اتنی بڑی قیمت میں تو بہت بڑے بڑے طائفے بھی شو نہیں کرتے۔"

"میں نے کہا نا مینجر میرے اخراجات یہی ہیں اور براہ کرم تم اس سلسلے میں مجھ سے سودے بازی کرنے کی کوشش مت کرو۔"

"دیکھو جب میں پریشان ہو جاؤں گا تو پولیس کو اطلاع ضرور دونگا آخر ہمیں بھی تو جینا ہے، ہم اتنی بڑی رقم ادا نہیں کر سکتے۔"

"معاہدہ مختصر کرلو مینجر اگر تمہیں میرے شو سے کوئی فائدہ ہو تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے بعد میں تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔" نوجوان نے کہا اور مینجر اسے گھورنے لگا۔

جن حالات سے مجبور ہو کر وہ اس نوجوان کے پاس آیا تھا وہی پھر سامنے آ رہے تھے، اگر ایسی ہی صورت حال رہی تو پھر اس الجھن سے نجات کس طرح مل سکے گی، اس نے سوچا اور چند ساعت کے بعد اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم تین ہزار پر سودا طے کرلو۔"

"سودے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مینجر، میں جو کچھ کہتا ہوں ایک بار کہہ دیتا ہوں اور اس کے بعد اس میں ترمیم نہیں پسند کرتا۔"

"بہرصورت میں تم سے خوش نہیں ہوں اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے کسی خوشی کے تحت نہیں ہو رہا میں دیکھوں گا کہ میں تمہارے خلاف کیا کر سکتا ہوں۔""؟

"گویا معاہدہ نہیں ہو رہا ہے مینجر۔" نوجوان نے شرارت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں معاہدہ ہو رہا ہے۔ تم اس ہفتے اپنا شو کرو گے۔" مینجر نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"تب میں شکریہ ادا کرتا ہوں جناب۔" نوجوان نے گردن خم کی اور مینجر جھلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

رات کو نینی نے ایک خواب دیکھا۔ ایک فلمی خواب اس نے دیکھا کہ کہکشاں زمین پر اتر آئی چاروں طرف بکھرے ہوئے ستاروں کے درمیان وہ رقص کر رہی تھی۔ ستاروں کی کرنوں سے پھوٹنے والی روشنی موسیقی بکھیر رہی تھی۔ پھر خلاء میں تیرتا ہوا ایک بڑا ستارا اس کے سامنے آ ٹکا۔ ستارے کا دروازہ خود بخود کھلا اور اس سے ایک سیڑھی نکل کر زمین پر بچھ گئی۔ پھر کھلے ہوئے دروازے سے ایک خوبصورت شہزادہ آہستہ آہستہ پروقار انداز میں نیچے اترا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند تھیں اور اس کے ہونٹوں پر ایک حسین مسکراہٹ سجی ہوئی تھی تب اس نے نینی کی جانب دیکھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کھول دیں۔ ان مٹھیوں سے ننھے ننھے ستارے نکل کر فضا میں بکھر گئے تھے اور جب اس کے ہاتھ سے آخری ستارا بھی گر گیا تو دونوں ہاتھ اسی مانند پھیلائے ہوئے اس کی جانب بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

نینی کی آنکھ کھل گئی لیکن اس کے ذہن میں ستاروں کا سحر ابھی باقی تھا۔ وہ پر خیال انداز میں اپنے کمرے کی دیوار دیکھ رہی تھی جو سورج کی روشنی سے چمک رہی تھی گویا دن نکل آیا تھا۔ پوری رات میں اتنا مختصر خواب۔ اس نے متحیرانہ انداز میں سوچا۔ اس خواب نے اس کے دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی تب اس نے اس ستارے سے نکلنے والے شہزادے کی شکل پر غور کیا۔ اور متعجب رہ گئی۔ یہ تو وہی نوجوان تھا جس نے اپنا نام سامری بتا دیا تھا۔ جس کو اس نے ہوٹل میں شعبدہ گری کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ سامری

وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائی۔ یہ شخص تو میرے حواس پر چھا گیا ہے۔ کیا میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اس نے سوچا اور اس کے ذہن نے جواب دیا کہ ہاں لیکن میں اسے حاصل کرنے کیلئے کیا کروں۔ اس نے جیسے اپنے آپ سے ہی سوال کیا اور اس سوال کا جواب بھی اس کے لئے مشکل نہیں تھا۔ فیروز صاحب نے ایک بات اور بھی کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان کی شادیوں کے سلسلے میں انہیں پوری پوری آزادی دی جائے گی۔ زندگی گزارنے کے لئے وہ فیروز صاحب کے وقار کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر اپنے لئے کسی ساتھی کا انتخاب کر بھی لیں گی تو انہیں اعتراض نہیں ہوگا۔

اب تک دونوں لڑکیاں اپنے ہی غرور میں ڈوبی ہوئی تھیں انہیں اپنی حیثیت کا پورا پورا احساس تھا اس لئے بے شمار لوگوں سے ملاقات کے باوجود کوئی ایسا نوجوان ان کی زندگی میں ابھی تک نہیں آیا تھا جسے وہ اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے بارے میں سوچتیں۔ ان کا بگڑا ہوا ذہن کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ گو بے شمار نوجوانوں نے ان کی زندگی اور دولت سے مرعوب ہو کر ان کی زندگی میں آنے کی کوشش کی تھی۔

فیروز صاحب نے بیٹیوں کا یہ رنگ بھی دیکھا تھا ان کی خودسری اور خودپرستی سے وہ نالاں تھے۔ خودپرستی کا یہ انداز بہرصورت نقصان دہ نہیں تھا اور انہوں نے ہمیشہ اس انداز کو ہوا دی تھی۔ وہ ہمیشہ دونوں لڑکیوں کو ان کی اہمیت کا احساس دلاتے رہتے تھے مقصد یہی تھا کہ وہ بھٹکنے نہ پائیں لیکن ان کے اس رویے نے لڑکیوں کے ذہنوں کو غلط راستوں پر لاڈالا تھا۔

ابھی چند ہی دنوں کی بات تھی کہ ملک صاحب کہیں سے ان کے یہاں آکر ٹھہرے تھے۔ ملک صاحب فیروز صاحب کے دوست کے بیٹے تھے اچھے خاصے تعلیم یافتہ تھے اور مالی حالت بھی بہت عمدہ تھی۔ فیروز صاحب کا خیال تھا کہ اگر دونوں لڑکیوں میں سے کوئی ایک انہیں پسند کرے تو کم از کم وہ ایک لڑکی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ شکل و صورت کے اچھے خاصے تھے یہ ملک صاحب تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تھوڑے سے احمق تھے ان کی باتوں میں ہر پہلو سے یہ اظہار ہوتا تھا کہ وہ دو لڑکیوں کے درمیان ہیں اور جب دونوں لڑکیاں ان کے قریب ہوتیں تو وہ اچھے خاصے چغد نظر آتے تھے لیکن ابھی تک فیروز

صاحب یہ اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ ان میں سے کوئی لڑکی ملک صاحب سے متاثر ہے یا نہیں۔ ملک صاحب سے البتہ ایک مرتبہ انہوں نے یہ بات ضرور کہی تھی کہ یہ دونوں لڑکیاں بڑے ناز و نعم میں پرورش پا چکی ہیں انہیں متاثر کرنے کے لئے خاصی محنت کی ضرورت ہوگی اور ملک صاحب نے سینہ ٹھونک کر یہ بات کہی تھی کہ وہ بالآخر انہیں متاثر کر دیں گے یہ ان کی حماقت کی دلیل تھی کیونکہ بیٹیوں کے باپ سے یہ چیلنج بازی کچھ مناسب تو نہیں تھی۔ بہرصورت ملک صاحب ابھی ان دونوں میں سے کسی کی توجہ حاصل نہیں کر سکے تھے اور اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔

دونوں لڑکیاں اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ ملک صاحب نے کئی بار ان مشاغل میں دخل انداز ہونے کی کوشش کی لیکن انہیں منہ کی کھانی پڑی تھی ویسے دونوں ہی ایک دوسرے کی ضد تھیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں کوشاں رہتی تھیں لیکن ملک صاحب اس کے باوجود کوئی متنازعہ شخصیت نہ بن سکے تھے اور نینی سامری کے خواب دیکھنے لگی۔

"لیکن اب میں کیا کروں۔؟ اس نے سوچا اور پھر بہت سے خیالات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ سامری ایک خوبصورت نوجوان ہے اسمارٹ اور شوخ طبیعت کا مالک کیوں نہ کوشش کی جائے اور اس کوشش کے لئے نینی نے سارا دن بیٹھ کر بے شمار پروگرام بنائے اور پھر شام کو تیاریاں کرنے لگی۔ اگر وہ نوجوان اسے ہوٹل میں نظر آیا تو وہ اس سے ضرور ملاقات کرنے کی کوشش کرے گی۔

وقت مقررہ پر نینی ہوٹل کی جانب چل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی کار ہوٹل کی پارکنگ میں داخل ہو گئی۔ کار کو پارک کرنے کے بعد وہ ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ اس کی میز مخصوص تھی چنانچہ وہ اس پر جا کر بیٹھ گئی اور ویٹر نے میز کے سامنے پہنچ کر ریزرویشن چٹ ہٹا دی تھی پھر اس نے نینی سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا۔

"سنو سنو۔" نینی نے ویٹر کو مخاطب کیا اور ویٹر سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

"جی مادام۔" اس نے جواب دیا۔

"ایک بات بتاؤ ویٹر کل تمہاری ڈیوٹی اس وقت تھی۔"

"جی ہاں مادام تھی کیوں۔"؟ ویٹر نے سوال کیا۔

"کل ایک شخص یہاں آیا تھا اس نے اپنا نام سامری بتایا تھا اور کچھ تفریحی پروگرام بھی پیش کئے تھے۔"؟

"جی ہاں مسٹر سامری۔" ویٹر نے جواب دیا۔

"وہ کہاں ہے کیا آج بھی وہ یہاں نظر آیا تھا۔"؟

"مادام سامری یہیں مقیم ہے کیا آپ نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔ شام کو سامری ہمارے ہال میں ساڑھے آٹھ بجے ایک شو پیش کریگا۔"

"میک شو۔" نینی خوشی سے اچھل پڑی۔

"جی ہاں' اس سے ہمارے ہوٹل کا کانٹیکٹ ہو گیا ہے۔"

"خوب خوب کیا ٹائم بتایا تھا تم نے۔"؟

"جی ساڑھے آٹھ بجے۔" ویٹر نے جواب دیا اور نینی نے گردن ہلا دی۔ پھر گھڑی میں وقت دیکھا پونے آٹھ بج رہے تھے اور پون گھنٹہ انتظار کرنا تھا۔ بہر صورت اس نے بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ بہت کچھ سوچ کر آئی تھی اور وہ دن بھر اس سلسلے میں پروگرام بناتی رہی تھی۔ اپنے لئے ایک مشروب منگا کر وہ اس کی چسکیاں لینے لگی۔ ہال میں بیشمار لوگ ایسے موجود تھے جو روزانہ یہاں آیا کرتے تھے اور اسی کی مانند ان کی میزیں بھی یہاں مخصوص تھیں۔ ان میں سے کئی نوجوانوں نے کئی بار اس کے قریب جانے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی پذیرائی نہ پا کر مایوس ہو گئے تھے اور اب کوئی اس کی میز کی طرف آنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے جو یہاں کے مستقل ممبر تھے۔ میز پر بیٹھنے کی درخواست کی تھی لیکن نینی نے نہایت ترش روئی سے انہیں منع کر دیا تھا۔ ایسے واقعات عموماً ہوتے رہتے تھے نینی کسی کمتر آدمی کو اپنی میز پر جگہ دینے کی قائل نہیں تھی اور اس سلسلے میں کوئی اخلاق کوئی اصول اس کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔

بمشکل تمام ساڑھے آٹھ بجے تک نینی کو شدید انتظار کرنا پڑا تھا۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے اناؤنسر نے اعلان کیا کہ اب عوام کے سامنے صدیوں پرانا جادوگر سامری اپنے

جادوئی کملات پیش کرے گا۔ میوزک کے شور کے ساتھ سامری پچھلے پردے سے برآمد ہوا۔ اس کے جسم پر انتہائی خوبصورت لباس تھا چہرہ تو یوں بھی سرخ سفید تھا اور اس لباس نے اس کی شخصیت میں اور چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس کے پاس کوئی چیز نہیں تھی وہ خالی ہاتھ تھا تب اس نے دونوں خالی ہاتھ سب کے سامنے کئے اور پھر اپنے کملات کا مظاہرہ کرنے لگا۔ نینی بھی اس مظاہرے سے بے حد محظوظ ہو رہی تھی اس کی آنکھوں میں محبت سمٹ آئی تھی اور سامری کے ہر شعبدے پر وہ پورے جوش و خروش سے تالیاں پیٹ رہی تھی۔ اس نے اپنی شعبدہ گری سے مہمانوں کو مسحور کر دیا تھا اور بے شمار نگاہیں اس کے لئے دلچسپی سے بھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ تب سامری نے اپنے تفریحی پروگرام کا آخری آئیٹم پیش کیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر گردن جھکا دی۔ تالیاں زور زور سے بج رہی تھیں۔ نینی نے مضطربانہ انداز میں اسے پردے کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا اور خود بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن دفعتاً" اسے خیال آیا کہ وہ ایک پر وقار اور باعزت خاندان کی لڑکی ہے اسے اس طرح بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ کچھ اور کوشش کر لینا مناسب ہو گی چنانچہ اس نے اس کے لئے ویٹر ہی کا سہارا لیا پھر اس نے ویٹر کو نزدیک بلا کر سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"کیا لاؤں مادام۔"؟ ویٹر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں تم میرا ایک کام کرو۔"

"جی فرمائیے۔" ویٹر ادب سے دوہرا ہو گیا۔

"اس شعبدہ گر کو میری میز پر بلا کر لاؤ اسے میرا پیغام دے دو اگر نہ آئے تو کوئی حرج نہیں ہے تم اس سے یہی کہو کہ تمہاری ایک مداح تم سے ملنا چاہتی ہے۔"

"جی بہتر۔" ویٹر گردن ہلا کر چلا گیا۔ نینی مضطربانہ انداز میں میز کا ایک حصہ کھٹ کھٹانے لگی۔ اس کی نگاہیں بار بار اس دروازے کی جانب اٹھ جاتی تھیں جو ہوٹل کے اس حصے میں داخلی دروازے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس نے سامری کو آتے دیکھا۔ ویٹر اس کے ساتھ نہیں تھا لیکن چند ہی ساعت کے بعد ویٹر بھی اندر داخل ہو گیا اور سامری کو اس نے اسکی میز کی طرف اشارہ کیا۔ سامری نے اس جانب دیکھا اور نینی کی ساری جان

اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ سامری اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اس کی جانب بڑھا۔ اس دوران بہت سی میزوں سے لوگ اٹھے اور اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی پیشکش کی۔ وہ ان کی اس پر خلوص پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نینی کی جانب آگیا تھا۔

"آپ نے مجھے طلب کیا خاتون۔"؟ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں' جی ہاں تشریف رکھئے۔" نینی نروس ہونے لگی تھی وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"دراصل میں آپ کے کمالات سے بیحد متاثر ہوں اس دور میں آپ نے جس قسم کے تفریحی کمالات پیش کئے ہیں ہم عام شعبدہ گروں سے اس کی توقع نہیں رکھتے۔" نینی نے کہا۔

"اپنی پذیرائی سے میں بے حد آپ کا ممنون ہوں خاتون۔" سامری گردن جھکا کر بولا۔

"میں آپ سے بہت سی باتیں کرنے کی خواہشمند ہوں کیا میں نے آپ کے قیمتی وقت کو ضائع نہیں کیا۔"؟ نینی نے پوچھا۔

"نہیں اپنے شو کے بعد میں بالکل آزاد ہوں اور میرے دل میں خود ہی خواہش ہے کہ اس ملک کے لوگوں سے ربط و ضبط بڑھاؤں ویسے خاتون آپ جیسی مہذب اور شائستہ خاتون مجھے اتنی اہمیت دیں تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات نہیں ہو سکتی۔" سامری نے انتہائی شستہ لہجے میں کہا۔ نینی اس کے لہجے کی مٹھاس میں کھو گئی۔

"آپ کیا پئیں گے۔"؟ نینی نے پوچھا۔

"خاتون جو پلوا دیں ویسے میں ابھی تک خاتون کے نام سے واقف نہیں ہو سکا۔"

"میرا نام نینی ہے نینی فیروز۔"

"اوہ بڑا خوبصورت نام ہے مختصر سا اور آپ کی شخصیت سے ہم آہنگ۔"

"شکریہ مسٹر سامری کیا آپ کا نام واقعی سامری ہے۔"؟

"جی ہاں میرا نام سامری ہی ہے والدین نے چونکہ میرا یہ نام رکھ دیا تھا اس لئے یہ ہمیشہ کیلئے میرے اوپر لاگو ہو گیا اور میں نے اسی کو اپنا لیا۔"

"ویسے آپ کے کمالات واقعی سامری جادو گر ہی کے ہیں کیا آپ سچ مچ جادو جانتے ہیں۔"

"جو کچھ آپ نے دیکھا وہی جانتا ہوں۔ جادو جانتا تو سب سے پہلے آپ پر جادو کرتا تاکہ آپ جیسی حسین خاتون میری زندگی میں کوئی بہت بڑا مقام چھوڑ جاتیں۔"

"بڑی خوبصورت گفتگو کرتے ہیں آپ' ہاں آپ نے یہ نہیں بتایا کہ میں آپ کے لئے کیا منگواؤں۔"

"خاتون آپ نے مجھے طلب کیا میں حاضر ہو گیا اب ہم آپ کے ہیں۔"

"کیا آپ اپنی پسند نہیں بتائیں گے"؟ نینی نے پوچھا۔

"جی نہیں اگر میں اپنی مرضی سے آپ کو پینا چاہوں تو یہ تو میرے لئے ممکن نہیں ہے۔"

"ایکسیلنٹ۔" نینی ہنس پڑی۔ پھر اس نے ویٹر کو بلا کر ایک اعلیٰ مشروب کا آرڈر دیا۔ چند لمحے بعد وہ مشروب پی رہے تھے۔

"میں آپ سے بیحد متاثر ہوں مسٹر سامری اور آپ کی زیادہ سے زیادہ قربت چاہتی ہوں۔"

"یہ میری خوش بختی ہے خاتون ویسے آپ مجھے اپنے بارے میں کچھ اور تفصیل بتایئے۔"

"بس کیا تفصیل بتاؤں میرے والد یہاں کے ایک مشہور تاجر ہیں۔ فیروز الدین کا نام صنعت کاری کے کسی شعبے کے فرد سے پوچھ لیجئے وہ ناواقفیت کا اظہار نہیں کریگا۔ کروڑوں روپے کی جائیداد اور دولت کے مالک ہیں ہم لوگ ہم صرف دو بہنیں ہیں دوسری بھی میری جڑواں بہن ہے لیکن اس کی فطرت مجھ سے بہت مختلف ہے تنک چڑی اور مغرور اور میں اس کے برعکس شستہ مزاج ہوں ہر اس چیز کو پسند کرتی ہوں جو ذہنوں میں حیرت پیدا کر دے۔"

"بیشک انسان فطری طور پر تجسس پسند ہے اور جو تجسس سے عاری ہو ہم اسے جذبات سے عاری کہہ سکتے ہیں۔"

"مسٹر سامری آپ کا قیام کہاں ہے۔"؟

"دراصل خاتون اس ہوٹل سے میرا معاہدہ ہو گیا ہے میں کچھ عرصے یہیں قیام کروں گا آپ کا کیا خیال ہے میرے شو کو لوگوں نے پسند کیا ہو گا۔"؟

"آپ صرف پسند کی بات کرتے ہیں میں تو کہتی ہوں کہ اگر آپ کچھ روز اور اس ہوٹل میں قیام کرلیں تو اس ہوٹل کی تقدیر بدل جائے گی۔"

"شکریہ آپکا آپ نے میری بہت ہمت افزائی کی ہے ان سے اسی شرط پر میرا معاہدہ ہوا ہے کہ اگر لوگوں نے میرا شو پسند کیا تو منیجر میرے معاوضہ کی ادائیگی کرے گا ورنہ مجھے یہاں سے ہٹادے گا۔"

"ایسی تیسی اس مینجر کی اگر اس نے ایسی کوئی کوشش کی تو کل ہی میں یہ ہوٹل خرید لوں گی۔ اس کے بعد یہاں صرف آپ کا شو ہو گا۔"

"اوہ میرے لئے آپ اتنا بڑا اقدام کریں گی خاتون۔"

"مسٹر سامری میں اس قسم کی لڑکی ہوں۔"

"بہرصورت آپ جیسی حسین اور خوش اخلاق لڑکی سے مل کر مجھے جتنی خوشی ہوئی ہے میں نہیں بیان کر سکتا ویسے ہوٹل کا قیام میرے لئے کافی تکلیف دہ ہے میں ہوٹل میں قیام کا قائل نہیں ہوں لیکن کیا کروں بے گھر ہوں یہاں قیام کرنا ہی پڑے گا۔"

"ڈیئر مسٹر سامری آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں اگر آپ نے میری دوستی قبول کی ہے تو کیا اس بات کی آپ توقع کرتے ہیں کہ میں آپ کو ہوٹل میں زندگی گزارنے دوں۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"سامری آپ کو اس ملک میں جو تکلیف ہے براہ کرم ایک دوست کی حیثیت سے اس کے بارے میں ضرور بتائیں' میں آپ کو کسی تکلیف کا شکار نہ ہونے دوں گی ورنہ پھر اس ملک میں میری جیسی دوست کی موجودگی آپ کے کس کام کی۔"

"لیکن خاتون اس سلسلے میں آپ میری کیا مدد کر سکیں گی۔"؟

"میری کوٹھی میں تقریباً ساٹھ کمرے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارے استعمال میں کتنے کمرے ہیں تین یا چار۔ کچھ نوکروں کے لئے ہیں اور باقی مہمانوں کے لئے۔ تو کیا آپ

اتنی بڑی کوٹھی میں قیام نہیں کر سکتے اور اگر آپ قیام نہ کر سکیں تو میں آپ کے لئے ایک الگ کوٹھی بھی خرید سکتی ہوں۔" نینی نے مغرور لہجے میں کہا اور سامری مسکرانے لگا۔

"بہرصورت آپ کے دولت خانے میں تھوڑی سی جگہ مجھے مل جائے تو میں سمجھوں گا کہ میں بیحد خوش قسمت انسان ہوں اور اس ملک میں میرے لئے جگہ موجود ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں آج تو مجبوری ہے آپ یہیں قیام کریں کل آپ کے قیام کا بندوبست کر دوں گی وعدہ کرتی ہوں۔" سامری نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر تین گھنٹے تک وہ دونوں ساتھ رہے۔ سامری نے رقص کی درخواست کی تھی لیکن نینی نے اس سے معذرت کرلی۔

"میرے ڈیڈی نے مجھ پر کچھ پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ بعض پابندیاں مجھے دل سے قبول نہیں ہیں مگر ان وعدوں پر پابندی ضروری سمجھتی رہوں اور اس میں وہ وعدہ بھی شامل ہے کہ میں رقص سے پرہیز کروں' اور اس میں بذات خود دلچسپی نہیں لوں گی آپ مجھے معاف فرمائیں۔"

"میں اصول پرست لوگوں کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ میں جب تک یہاں آپ کے ساتھ ہوں میں خود بھی رقص نہیں کروں گا۔"

"آپ کتنے نفیس انسان ہیں۔" نینی نے جواب دیا اور پھر وہ جب گھر واپس گئی تو اس کے خوابوں میں کچھ اور ہی رنگ سمائے ہوئے تھے۔

دوسرے دن اس نے فیروز صاحب سے بات کرنے کی کوشش کی پوچھ لینا زیادہ بہتر تھا باقی تفصیل میں جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی چنانچہ فیروز صاحب کے کمرے میں پہنچ کر اس نے سلام کیا اور وہ تعجب خیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"خیریت بیٹے کیا بات ہے۔"؟

"ڈیڈی میرا ایک مہمان اس کوٹھی میں کچھ عرصے قیام کریگا۔"

"ضرور ضرور بیٹے کوٹھی تمہاری ہے وہ کون ہے"؟ فیروز صاحب نے سوال کیا۔

"میرا دوست۔"

"خوب۔" فیروز صاحب نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "یہ دوستی کہاں سے ہوئی۔"؟

"بس ڈیڈی تفصیل میں نہیں جاؤں گی صرف ایک بات کا احساس دلاؤں گی آپ کو کہ آپ کے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کی ہے اس لئے آپ کو تشویش زدہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"بھئی میں تشویش زدہ بالکل نہیں ہوں میں جانتا ہوں کہ تم ایک سمجھدار لڑکی ہو اپنے اچھے برے کے بارے میں بہتر سوچ سکتی ہو اگر تم محسوس کرتی ہو کہ اس شخص کی گنجائش یہاں ہے تو ضرور لے آؤ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"شکریہ ڈیڈی اس کے بارے میں تفصیلات میں آپ کو فرصت سے بعد میں بتا دوں گی آپ جب اس سے ملیں گے تو خود دیکھ لیں گے کہ وہ کیا انسان ہے ویسے وہ مقامی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب۔"؟ فیروز صاحب تعجب سے بولے۔

"ایک ایرانی ہے۔" نینی نے جواب دیا اور فیروز صاحب مسکرانے لگے۔

"سفارت خانے سے کوئی تعلق ہے۔"

"جی نہیں۔ میں نے آپ سے کہہ جو دیا کہ باقی تفصیلات بعد میں بتاؤں گی۔"

"اچھا بھئی ٹھیک ہے تم اسے لے آؤ۔" فیروز صاحب پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور نینی خوش خوش باہر نکل آئی۔ وہ یہ خوشخبری جلد از جلد سامری کو سنا دینا چاہتی تھی لیکن بہر صورت اس سے قبل اس کے لئے تیاریاں ضروری تھیں۔ نینی نے کوٹھی کا سب سے بڑا کمرہ منتخب کیا۔ دن بھر اسے ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ کرتی رہی۔ وہ باغ باغ ہو رہی تھی اور کمرے کو ہر پہلو سے دیکھ رہی تھی تب ملک صاحب اندر داخل ہو گئے اور نینی چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"ڈیئر نینی دیکھو تمہیں میری ذہانت کا اعتراف کرنا ہو گا میں نے کبھی تم دونوں کے معاملے میں دھوکہ نہیں کھایا جبکہ میرا خیال ہے کہ خود فیروز صاحب بھی بعض اوقات یہ فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہوں گے کہ تم میں سے کون نینی ہے اور کون

فرحت۔" ملک صاحب نے کہا اور نینی ہونٹ بھینچ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"میرا خیال ہے ملک صاحب آپ کو عقل و دانش سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آپ مجھے فرحت کا ہم پلہ بنا رہے ہیں جبکہ مجھ میں اور فرحت میں بڑا فرق ہے اسے نہ لباس پہننے کا سلیقہ ہے اور نہ اٹھنے بیٹھنے کی تمیز مجھے تو شرمندگی ہے اس بات سے کہ وہ میری بہن ہے۔"

"جی ہاں ان دونوں معاملات میں تو وہ آپ سے بہت پیچھے ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے میں بعض اوقات جب آپ کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہوتا ہے میں سوچتا ہوں دونوں بہنوں میں اتنا تضاد ہے کہ ایک تو جامہ زیبی کی اعلیٰ مثال اور دوسری لباس اور رہن سہن کے معاملوں میں بالکل ہی کوری۔"

"کیا آپ درست کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔"؟

"بالکل بالکل اس میں شک بھی کیا ہے ہزار آدمیوں میں کہلوا لیجئے۔"

ملک صاحب بے اختیار بولے۔

"مگر براہ کرم ایک منٹ انتظار فرمائیے میں فرحت کو بلاتی ہوں کیا یہ الفاظ اس کے سامنے دوہرائیں گے تاکہ اسے اپنی حیثیت کا احساس ہو جائے۔" نینی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوتے کہا اور ملک صاحب کا رنگ سفید ہو گیا۔

"سنئے تو سہی جو بات دل میں ہے اسے منظر عام پر لانے کی کیا ضرورت ہے۔" ملک صاحب گھبرائے ہوئے انداز میں بولے۔

"نہیں ملک صاحب میں اسے اس کی حیثیت کا احساس دلانا چاہتی ہوں۔"

"اور مجھے قتل کرا دینا چاہتی ہیں کیوں۔" ملک صاحب روہانسی آواز میں بولے۔

"کیا آپ ڈرتے ہیں اس سے۔"؟ نینی نے کہا۔

"ہرگز نہیں بھلا ڈرنے کی کیا بات ہے بھلا وہ میرا بگاڑ بھی کیا سکتی ہیں میرا خیال ہے بلاوجہ مخاصمت مول لینے سے کیا فائدہ۔ میں اس سے دشمنی بھی نہیں چاہتا اور بہر صورت میں آپ لوگوں کا مہمان ہوں۔"

"گویا آپ یہ الفاظ اس کے سامنے نہیں کہنا چاہتے۔" نینی ہونٹ بھینچ کر بولی۔

"ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ میں وقت سے پہلے مرنے کا خواہشمند نہیں ہوں۔"

"پھر یہاں سے دفعان ہو جایئے۔ ملک صاحب نکل جایئے فوراً یہاں سے ورنہ میں یہ گلدان آپ کے سر پر کھینچ ماروں گی۔"

"ارے ارے مذاق نہ کیجئے آپ' ویسے میں جارہا ہوں۔" ملک صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور باہر نکل آئے ان دونوں آتش فشاں لڑکیوں سے ان کے حواس خراب ہو جاتے تھے جس مقصد کے لئے انہیں یہاں بلایا گیا تھا اب تو انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ مقصد ان کے لئے جان لیوا ثابت ہو گا۔ اگر فیروز صاحب کی یہ رائے نہ ہوتی کہ اس خاندان میں کوئی جگہ بنانے کی کوششیں کرو تو ملک صاحب یہاں سے کبھی کے بھاگ چکے ہوتے ان کی آتش مزاج لڑکیوں کے درمیان تو زندگی ہر وقت سولی پر ہی لٹکی رہتی تھی۔ ان میں سے کسی ایک کو خوش کرنا بےحد مشکل کام تھا ہمیشہ ایسے مسائل سے گزرنا پڑتا تھا اگر وہ کسی ایک کی تعریف کرتے تو وہ اس بات پر مصر ہو جاتی کہ یہ تعریف دوسری کے سامنے کی جائے اور وہ اپنے اندر قطعی اتنی ہمت نہ پاتے تھے کہ ان میں سے کسی کی برائی اور کسی کی اچھائی بیان کرتے یہ جرات تو شاید فیروز صاحب کی بھی نہیں ہوتی تھی تو پھر ملک صاحب کس گنتی میں آتے تھے۔

ملک صاحب کے جانے کے بعد نینی نے گردن ٹیڑھی کی اور بڑبڑائی "خوشامدی کہیں کا۔" پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

وہ حسب معمول اپنی میز پر موجود تھی اور لوگ چاروں طرف سے سامری سامری کے نعرے لگا رہے تھے۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے سامری اسٹیج پر نظر آیا اس کے بعد اس نے کچھ نئے کمالات کا مظاہرہ کیا۔ لوگ بے اختیار اسے داد دے رہے تھے۔ سامری نے ایک بار نینی کی جانب بھی دیکھا پھر اس نے ربڑ کا ایک سانپ اپنی آستین سے نکالا اور اسے لوگوں کے سامنے ہلانے لگا۔

"یہ عظیم تحفہ میں اپنی ایک دوست کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے سانپ کو چٹکی میں پکڑا اور اسے نینی کی جانب پھینک دیا۔ نینی ایک چیخ کے ساتھ پیچھے ہٹی تھی لیکن جو چیز اس کے گلے میں آ کر پڑی وہ خوبصورت پھولوں کا ایک ہار تھا۔ نینی نے ہار کو دیکھا اور پھر

متحیرانہ انداز میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گئی اور لوگ تالیاں بجانے لگے۔ نینی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ پھر وہ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ تالیاں بجانے لگی۔

سامری نے کئی بار اس کی جانب دیکھا اور اپنے پروگرام پیش کرتا رہا۔ کئی بار اس نے اس کو متوجہ کیا تھا' پھر جب شو ختم ہو گیا اور لوگوں کی تالیاں ختم ہو گئیں تو نینی سامری کا انتظار کرنے لگی' اور چند ساعت کے بعد وہ لباس تبدیل کر کے اس کے پاس پہنچ گیا۔

"ہیلو نینی۔" اس نے اسے مخاطب کیا۔

"کیسی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہوں۔"

"کیا کر رہی ہیں۔"

"کچھ نہیں آپ کے پاس آنے کی خواہشمند تھی سو آ گئی۔"

"مجھے آپ کا انتظار بھی تھا۔"

"خیریت۔"

"جی ہاں۔"

"میرا خیال ہے اب ہم لوگوں کو ایک دوسرے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" نینی نے مسرت دباتے ہوئے کہا۔

"اوہ' کوئی خاص وجہ۔"

"جی ہاں' میں نے آپ کو پیش کش کی تھی کہ آپ میرے ساتھ میری کوٹھی میں قیام کریں۔"

"جی ہاں۔ لیکن میں اسے بہتر نہیں سمجھتا۔"

"کیا مطلب۔"؟ نینی نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"میں اپنی ذات سے کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتا' ممکن ہے آپ کے گھر کے لوگ مجھے پسند نہ کریں۔" سامری بولا۔

"مجال ہے کسی کی' نینی جو کچھ سوچتی ہے کوئی بھی اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔"

"اوہ۔ کیا واقعی۔"

"جی ہاں۔ یہ میری فطرت ہے۔" نینی نے جواب دیا اور سامری مسکرانے لگا۔

"ویسے آپ کے گھر میں اور کون کون ہے۔"؟

"میرے ڈیڈی' ایک میری بہن اور میں بس' باقی ملازم وغیرہ ہیں' ان کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔"

"تو کیا آپ نے اپنے لوگوں سے اس سلسلے میں اجازت لے لی تھی۔" سامری نے پوچھا۔

"اجازت لینے کا کیا سوال ہے۔ اور پھر جب میں بتا چکی ہوں کہ وہاں لوگ ہی کتنے ہیں تو یہ سوال بے معنی ہو جاتا ہے' ڈیڈی' فرحت اور میں ویسے تو میں ڈیڈی سے اس سلسلے میں بات کر لی تھی اور انہوں نے بخوشی مجھے اجازت دے دی تھی۔" "چلئے تب ٹھیک ہے۔" سامری مسکراتا ہوا بولا۔ اور پھر دونوں بیٹھ کر ایک مشروب سے شغل کرنے لگے۔

"تو پھر کب چلیں گے آپ۔" نینی نے پوچھا۔

"جب آپ حکم دیں۔"

"بس آج میرے ساتھ۔"

"اوہ اتنی جلد۔"

"جی ہاں۔" نینی فیصلہ کن لہجے میں بولی اور سامری نے دونوں شانے ہلا دیئے۔

"اگر آپ کا حکم ہے تو بھلا سامری کی مجال کہ وہ آپ کے اس حکم سے سرتابی کرے۔" سامری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر اسی رات سامری اس خوبصورت کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔ رات کو فیروز صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی' فرحت اپنے کمرے میں بند تھی' صرف نینی ہی اس کی مہمانداری کرتی رہی تھی' تب سامری نے متعجبانہ انداز میں کہا۔

"آپ کی کوٹھی کا ماحول بڑا پر سکون ہے' کیا آپ کی بہن فرحت یہاں موجود نہیں ہے۔"

"ہو گی۔ اپنے کمرے میں۔" نینی نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا اور سامری متعجبانہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب۔"؟

"مطلب یہ کہ میری اس سے بنتی نہیں ہے۔"

"کیوں۔"؟

"ہم لوگوں کے درمیان نہ بننے کی سب سے بڑی وجہ ہماری ذہنی ہم نا آہنگی ہے' چنانچہ میں اس سے الگ تھلگ رہتی ہوں' نا تو وہ میرے دوستوں کو ڈسٹرب کرتی ہے اور نہ ہی میں اس کے دوستوں کو۔"

"واہ۔" سامری نے کہا اور اسی وقت دروازے سے ملک صاحب نے اندر جھانکا۔

"کیا بات ہے۔"؟ نینی نے غرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بھئی کیا بتاؤں' اس کوٹھی کا ماحول اتنا سنسان ہے کہ وحشت ہوتی ہے' یوں لگتا ہے جیسے کسی قبرستان میں وقت گزر رہا ہو' انسانوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں' لیکن کوئی ملتا ہی نہیں۔ اندر آ جاؤں" ملک صاحب نے پوچھا اور نینی کے کچھ بولنے سے پیشتر ہی سامری نے ملک صاحب کو اندر بلا لیا۔ نینی غصے سے کھول کر رہ گئی تھی۔

"آیئے آیئے۔" اور ملک صاحب اندر داخل ہو گئے۔

"کون ہیں آپ۔" نینی کے ڈیڈی نہیں ہو سکتے۔" سامری مزاحیہ انداز میں بولا۔

"لل' لاحول ولاقوۃ' کیسی باتیں کرتے ہیں آپ' میں نینی کا ڈیڈی لگ رہا ہوں آپ کو۔"

"میں نے کہا نا نینی کے ڈیڈی تو نہیں لگ رہے' مگر پھر آپ کون ہیں۔ نینی نے تو بتایا تھا کہ اس کوٹھی میں وہ' فرحت اور اس کے ڈیڈی رہتے ہیں۔"

"یہ ملک صاحب ہیں۔" نینی تڑ سے بولی۔

"اوہو۔" ملک صاحب۔"

"جی ہاں۔ میں ملک صاحب ہوں۔" ملک انتہائی بے وقوفانہ انداز میں بولا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" سامری نے کہا اور اپنا ہاتھ ملک صاحب کی

طرف بڑھا دیا۔ ملک نے اپنا ہاتھ سامری کے ہاتھ میں دے دیا۔ لیکن جونہی ان کا ہاتھ سامری کے ہاتھ میں پہنچا' ملک صاحب کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان کے پاؤں کے نیچے کتے کی دم ہو۔ اور کتا ئیوں ئیوں کر رہا ہو۔ وہ اچھل پڑے۔ لیکن سامری نے ان کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا' البتہ وہ بار بار اچھل رہے تھے۔

"خیریت ملک صاحب خیریت۔" سامری نے پوچھا۔ "کیا آپ مصافحہ کرتے وقت اچھلتے بھی ہیں۔"؟

"وہ —— پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔" ملک صاحب گھبرائے ہوئے انداز میں بولے۔

"کیا ہو رہا ہے۔"؟

"بالکل نہیں پتہ پیارے بھائی' بالکل نہیں پتہ۔ نجانے کیا ہو رہا ہے۔" ملک صاحب نے کہا اور کتے کا پلا ایک بار پھر ان کے پاؤں کے نیچے آ کر چیخا تھا۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس کی آواز سامری نہ سن رہا ہو۔

"نجانے آپ کیوں اچھل رہے ہیں جناب۔ تشریف رکھئے۔" سامری نے کہا اور ملک صاحب گھبرائے ہوئے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ لیکن جونہی وہ صوفے پر بیٹھے پھر اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ کتے کا پلا ان کے بدن کے نیچے دب گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔" نینی غرائی۔

"کتا۔ کتا ہو گیا ہے۔" ملک صاحب گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے۔ اور پھر کہنے لگے۔ "میں۔ میں ابھی آتا ہوں۔ ایک منٹ صرف ایک منٹ۔" ملک صاحب نے کہا اور پھر انتہائی برق رفتاری سے دروازے کی جانب بھاگ نکلے' اور اتنی تیزی سے بھاگے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ نینی بری طرح ہنس پڑی تھی لیکن سامری سنجیدہ کھڑا تھا۔

"کیا ہوا تھا اس شخص کو۔" نینی نے متحیرانہ لہجے میں کہا اور یہ آوازیں کیسی تھیں۔"؟ سامری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں نے محسوس کیا تھا مس نینی کہ آپ اس کی آمد سے خوش نہیں ہیں۔"

"ہاں میں اس سے نفرت کرتی ہوں' عجیب خوشامدی آدمی ہے۔"

"بس تو میں نے سوچا اسے بھگانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔"

"اوہ۔ نینی کی آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں' پھر وہ بولی۔

"تو یہ تمہاری شرارت تھی۔"

"کمال کے انسان ہو' واقعی کمال کے آدمی ہو' تم تو اچھے اچھوں کا خانہ خراب کر کے رکھ دو۔" نینی ہنستے ہوئے بولی اور سامری بھی ہنستا رہا۔ کافی دیر تک وہ مختلف قسم کی گفتگو کرتے رہے' نینی فرحت اور ملک صاحب کے بارے میں بتاتی رہی' اور پھر اس نے گھڑی دیکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"بس ڈیئر سامری آرام کرو' اور دیکھو اگر کسی قسم کی تکلیف اٹھائی تو میں سخت ناراض ہو جاؤں گی۔"

"فکر نہ کرو ڈیئر نینی اگر میں کسی قسم کا تکلف محسوس کرتا تو پھر یہاں نہ آتا' سامری نے کہا اور نینی مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

دوسری صبح ہنگامہ خیز تھی ناشتے کی میز پر فیروز صاحب' ملک صاحب' نینی اور فرحت موجود تھے' نینی خود اپنے سامری کو لے کر آئی تھی اس سے قبل وہ کسی حد تک سامری کا تعارف کرا چکی تھی۔ سامری نے اندر داخل ہو کر فیروز صاحب کو سلام کیا' فیروز صاحب نے پرتپاک انداز میں اس کا خیر مقدم کیا۔ سامری کی شخصیت تو ایسی ہی تھی کہ کوئی بھی اس سے متاثر ہو سکتا تھا۔ البتہ صرف فرحت تھی جس نے ناک چڑھا کر اسے دیکھا تھا اور گردن جھکالی تھی ملک صاحب بے چارے اسی طرح خاموش بیٹھے رہے تھے۔

"تشریف رکھیئے مسٹر سامری فیروز صاحب نے کرسی کی جانب اشارہ کیا اور سامری بیٹھ گیا۔" نینی آپ کا تعارف کرا چکی ہے' نینی کے دوست ظاہر ہے میرے ہی بچے ہوتے ہیں چنانچہ میں آپ کو اپنی اس رہائش گاہ میں خوش آمدید کہتا ہوں۔"

"شکریہ جناب۔" سامری بیٹھ گیا۔

"ناشتہ شروع کریں اس کے بعد گفتگو ہو گی۔" فیروز صاحب نے کہا اور خاموشی سے ناشتہ ہونے لگا۔ لیکن جس جگہ سامری موجود وہاں ہنگامہ کیوں نہ ہو' اور تختہ مشق اس وقت بیچارے ملک صاحب کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ نینی رات کو

ملک صاحب کے بارے میں کسی حد تک تفصیلات بتا چکی تھی۔ چنانچہ ناشتہ کرتے ہوئے دفعتاً" چائے کی پیالی ملک صاحب کے اوپر الٹ گئی' حالانکہ ملک صاحب نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا سب لوگ چونک کر اس طرف دیکھنے لگے ملک صاحب بوکھلائے ہوئے انداز میں کھڑے ہوئے پھر بیٹھ گئے۔ پھر کھڑے ہو گئے۔

"میں میں کیا کروں اب۔" انہوں نے پوچھا۔

"کپڑے بدل کر آیئے۔" فیروز صاحب کسی حد تک ناخوشگوار لہجے میں بولے ایک معزز مہمان کے سامنے ملک صاحب کی احمقانہ حرکت انہیں پسند نہیں آئی تھی۔ ملک صاحب اٹھ کر باہر نکل گئے۔

فرحت کے چہرے پر نفرت کے آثار اور گہرے ہو گئے تھے۔ تب اس نے فیروز الدین صاحب سے کہا۔" میری سمجھ میں نہیں آتا ڈیڈی آپ نے اس احمق آدمی کو کیوں بلایا ہے۔" فرحت بولی

"بھئی میرے دوست کا بیٹا ہے۔ اس میں حماقت کی کیا بات ہے۔" فیروز صاحب نے کسی قدر ناخوشگوار انداز میں کہا۔

"ہو نہ حماقت کی کیا بات ہے۔" نینی منہ سکوڑ کر بولی اور خاموش ہو گئی۔

ناشتہ جاری رہا تھا' یہاں تک کہ ناشتہ ختم ہو گیا تھا لیکن ملک صاحب واپس نہیں آئے تھے' ناشتے کے بعد فیروز صاحب نے دوستانہ انداز میں سامری کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے آئے۔ نینی بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی آئی تھی البتہ فرحت چلی گئی تھی۔

"آپ کی دونوں بیٹیوں میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔ فیروز صاحب" سامری نے کہا۔

"جڑواں ہیں دونوں۔"

"جی" نینی نے مجھے بتایا تھا لیکن بڑی عجیب بات ہے ان دونوں میں یگانگت نہیں معلوم ہوتی۔"

"ہاں بس نجانے کیوں ایک دوسرے سے ناراض رہتی ہیں۔ بیٹھئے۔" فیروز صاحب

نے سامری کو بیٹھنے کی پیش کش کی اور نینی سے بولے۔

"نینی بیٹے اگر تم اجازت دو تو ہم لوگ آپس میں کچھ باتیں کر لیں' اس کے بعد تم مسٹر سامری کو اپنے ساتھ لے جا سکتی ہو۔"

"جی" نینی نے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ سامری مسکرا کر فیروز صاحب کو دیکھنے لگا تھا۔

"بیٹے میں آپ سے مکمل تعارف چاہتا ہوں۔" فیروز صاحب بولے۔

"جی میں کیا عرض کروں سیاح ہوں جگہ جگہ آتا جاتا رہتا ہوں' خاتون سے ملاقات ہو گئی۔ ان کی پر خلوص شخصیت دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا پھر جب انہوں نے مجھے اپنے ساتھ قیام کی پیشکش کی تو میں انکار نہ کر سکا' دیکھئے جناب ہر شخص خواہشمند ہوتا ہے کہ ہر جگہ اس کے اچھے دوست ہوں چنانچہ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے میں یہاں پہنچ گیا۔"

"خوش آمدید' خوش آمدید" فیروز صاحب مسکرا کر بولے "میں تمہاری آمد سے بہت خوش ہوں۔ یہاں اطمینان سے رہو' جب تک دل چاہے رہو' ویسے تمہارا تعلق ایران سے ہے۔"؟

"جی ہاں۔"

"والدین تو ہوں گے وہاں پر۔"

"بد بختی ہے جناب بچپن ہی میں والدین کے سائے سے محروم ہو گیا تھا۔"

"اوہ بڑا افسوس ہوا' ذریعہ معاش کیا ہے۔"؟

"زمینیں بے شمار زمینیں' جائیداد بس انہی کی آمدنی ملتی ہے' اپنے طور پر ہر جگہ تھوڑی بہت تفریح کا بندوبست کر لیتا ہوں' بس اس کے علاوہ اور کوئی شغل نہیں ہے۔"

"اچھا مشغلہ ہے' اچھا مشغلہ ہے۔" فیروز صاحب مسکراتے ہوئے بولے' بہر صورت بیٹے ہم تو کاروباری آدمی ہیں صبح کو جاتے ہیں شام کو واپس آتے ہیں تو اگر ہم سے زیادہ ملاقاتیں نہ ہوں تو محسوس مت کرنا' یہاں جب تک دل چاہے رہو مجھے تمہاری آمد سے خوشی ہوئی ہے۔" فیروز صاب نے رسماً" کہا اور پھر اجازت طلب کر کے چلے گئے۔

سامری بھی کمرے سے نکل آیا تھا' فیروز صاحب شاید اپنے دفتر چلے گئے سامری اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ نینی کو اب تک اس بات کا علم نہ ہوا ہو گا کہ فیروز صاحب چلے گئے ہیں چنانچہ وہ موجود نہیں تھی۔

تھوڑی دیر تک سامری یہاں کے حالات پر غور کرتا رہا خاصی دلچسپ جگہ تھی خاص طور سے ملک۔ صاحب اس کا تختہ مشق بن سکتے تھے وہ ان کے سلسلے میں بہت سی شرارتیں سوچنے لگا پھر اپنے کمرے سے نکل آیا۔ کمرے سے نکلا ہی تھا کہ سامنے سے نینی نظر آئی وہ ایک ستون پر جھکی ہوئی نجانے کیا دیکھ رہی تھی' سامری آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس نے نینی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

نینی چونک کر پلٹی ایک لمحے کے لئے غصیلی نگاہوں سے سامری کو دیکھا' دوسرے لمحے اس کا تھپڑ سامری کے گال پر براہ راست پڑا اور سامری کی آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں۔

"کیا بدتمیزی تھی۔؟" نینی غرائی۔

"ارے ارے آپ' آپ کو کیا ہو گیا ہے مس نینی۔" سامری متحیرانہ انداز میں منہ پھاڑ کر رہ گیا تھا۔

"میرا نام نینی نہیں فرحت ہے سمجھے۔" اس نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا اور سامری کھوپڑی کھجا کر رہ گیا۔

اسے اس غلط فہمی پر بڑی شرمندگی ہوئی تھی' لیکن فرحت نے تو اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا' وہ تو مہمان تھا۔ فرحت پاؤں پٹختی ہوئی ایک طرف چلی گئی اور سامری اسی جگہ کھڑا ہوا سوچتا رہا۔" پھر اس نے کہا۔

"اچھا مس فرحت آپ کا دماغ بھی درست کرنا پڑے گا اور پھر واپس اپنے کمرے میں آ گیا ویسے یہ صورتحال خاصی خراب تھی دونوں لڑکیوں میں ذرا بھی فرق نہیں تھا آوازیں تک یکساں تھیں چنانچہ سامری کو خاصی مشکلات پیش آ سکتی تھیں تقریباً پندرہ منٹ تک وہ اپنے کمرے میں رہا اور نینی اس کے پاس نہیں آئی تب اس نے سوچا کہ کسی ملازم کو تلاش کرے اور اس سے کہے کہ نینی کو بلا لائے نجانے کس طرح یہ لوگ ان

دونوں کو پہچانتے ہیں' باہر نکلا لیکن اتفاق سے کوئی ملازم نظر نہیں پڑا۔ ہاں چند ساعت کے بعد فرحت آتی نظر آئی اور سامری ایک دم ٹھٹھک کر رک گیا۔

"ڈیڈی چلے گئے مسٹر سامری۔"؟ اس نے پوچھا۔ سامری کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس وقت تو فرحت کا لہجہ ناخوشگوار نہیں تھا۔

"میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا۔" سامری نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی آپ نے میرے گال پر تھپڑ مارا ہے۔ کیا مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک جائز ہے۔؟" غلط فہمی تو کسی طرح بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں نے۔؟ مسٹر سامری کیا کہہ رہے ہیں آپ۔"

"آپ ہیں کون۔؟ پہلے یہ بتائیے۔"

"میں نینی ہوں' نینی۔" اس نے جواب دیا۔ اور سامری ایک بار پھر دیوار سے ٹک گیا۔

"آپ واقعی نینی ہیں۔"؟ اس نے کہا۔

"کیوں کیا ہوا آخر۔"؟

"کچھ نہیں مس نینی' آئیے فیروز صاحب چلے گئے۔"

"میں کہتی ہوں ہوا کیا۔"؟

"میں نے عرض کیا نا کہ کچھ نہیں کوئی خاص بات نہیں بس میں آپ میں اور آپ کی بہن میں تمیز نہیں کر سکا۔"

"اوہ' نہیں" نینی ہنس کر بولی ہاں ہم دونوں واقعی ہم شکل ہیں۔

لیکن عادت اور مزاج میں وہ انتہائی بدتمیز ہے بھلا وہ بھی کوئی لڑکی ہے۔" نینی نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر کہا اور سامری سر ہلانے لگا۔

"واقعی وہ لڑکی عادت اور مزاج میں بڑی خراب تھی۔" سامری نے نینی کو یہ نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے بتانا بے مقصد تھا اور پھر وہ اپنے طور پر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ فرحت سے انتقام لے گا۔ چنانچہ اس نے خاموشی اختیار کی۔

"اب کیا پروگرام ہے۔"؟ نینی نے پوچھا۔

"جو آپ پسند کریں میں تو شام تک خالی رہتا ہوں' بس ساڑھے آٹھ بجے مجھے ہوٹل پہنچنا ہو گا۔" سامری نے جواب دیا۔

"تب پھر آج میں آپ کو اس شہر کی سیر کراؤں گی۔" نینی بولی اور سامری نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔

پھر پورا دن نینی کے ساتھ شہر کی سیرو تفریح میں گزرا' نینی بہت اچھی لڑکی ثابت ہوئی تھی اور سامری اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر یہاں کا پروگرام ختم بھی ہو جائے گا تب بھی کچھ عرصے تک وہ نینی کے ساتھ رہے گا۔ بڑی دلچسپ شخصیت تھی بہت ہی پسندیدہ بڑی عمدہ گفتگو کرنے والی' شام کو وہ واپس پہنچ گئے۔ سب سے پہلے ملک صاحب ہی سے ملاقات ہوئی تھی جو ایک عمدہ سوٹ پہنے ٹائی باندھے کوٹھی کے بیرونی حصے میں چہل قدمی کر رہے تھے ان لوگوں کی کار دیکھ کر ان کی جانب متوجہ ہو گئے اور پھر پورچ میں آ گئے۔

"ہیلو ملک صاحب۔" سامری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیلو جناب' میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔" ملک صاحب کا لہجہ خوشگوار نہیں تھا۔

"ہاں ہاں ضرور ضرور" کیا گفتگو کریں گے آپ۔"؟ نینی نے پوچھا۔

"بس مس نینی کچھ پرائیویٹ گفتگو ہے' براہ کرم آپ ہمیں موقع دیں۔" ملک صاحب نے کہا اور سامری نے نینی کی جانب دیکھ کر آنکھ دبائی۔

"کیا حرج ہے نینی ملک صاحب بھی ہمارے اپنے ہی ہیں۔ میں ان سے باتیں کروں گا آپ براہ کرم اندر جائیں' میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

"نینی ان دونوں کو گھورتی ہوئی اندر چلی گئی تب سامری ملک صاحب کے ساتھ ٹہلتا ہوا دور نکل آیا۔"

"جی ملک صاحب فرمائیے۔" اس نے کہا۔

"میں آپ سے کچھ ضروری گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو کیجئے۔" سامری بولا۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔"؟ ملک صاحب نے پوچھا۔

"مس نینی مجھے لے کر آئی ہیں۔"

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"آخر کیوں۔"؟

"بس میں جو یہاں آیا ہوا ہوں۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ملک صاحب۔؟ کیا بیک وقت دو مہمان نہیں آ سکتے۔"

"مہمان۔ کیا میں مہمان نظر آتا ہوں آپ کو۔"؟

"آپ تو مجھے نجانے کیا نظر آتے ہیں ملک صاحب لیکن آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔"؟

"دیکھئے مسٹر مجھے فیروز صاحب نے بلایا ہے۔ میں ان کے دوست کا بیٹا ہوں اور فیروز صاحب نے مجھے یہاں اس لئے بلایا ہے کہ ان دونوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے میں اس سے شادی کر لوں۔" ملک صاحب نے فرمایا۔

"میری طرف سے پیشگی مبارکباد ملک صاحب۔ اگر آپ نے میری ترکیبوں پر عمل کیا تو کامیابی یقینی ہے۔"

"کیا واقعی۔"؟ ملک صاحب خوش ہو کر بولے۔

"سو فیصدی۔"

"تب پھر فرمائیے۔"؟

"پہلے یہ بتائیے آپ ان دونوں میں سے کس کو چاہتے ہیں۔"

"دونوں کو" ملک صاحب بولے۔ اور سامری مسکرانے لگا۔ پھر اس نے ملک صاحب کے کان میں آہستہ آہستہ کچھ کہا تھا۔

"ملک صاحب خوشی سے اچھل پڑے تھے۔" اگر یہ بات ہے میرے دوست' تب تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔ انہوں نے سامری کا ہاتھ پکڑا اور زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"بس ملک صاحب' آپ بالکل بے فکر ہو جائیے۔ اور آرام سے زندگی بسر کیجئے

سامری آپ کے ساتھ ہے۔"

"آپ تو بڑے کام کے آدمی نکلے۔ میں جاؤں۔"؟ ملک صاحب بولے۔

"بخوشی۔" سامری نے کہا۔ اور پھر وہ ملک صاحب کو جاتے دیکھتا رہا۔ ملک صاحب جب اندر چلے گئے تو سامری بھی مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ پھر وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ ایک طرف سے نینی کی آواز سنائی دی۔

"مسٹر سامری۔! ادھر آ جائیے۔" اور سامری مسکراتا ہوا اس کی طرف چل پڑا۔ نینی بھی خوشی سے مسکرا رہی تھی۔ "آیئے اس کمرے میں بیٹھیں گے۔" نینی نے کہا اور اسے ساتھ لے کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ "تشریف رکھئے۔ کیا پلاؤں آپ کو۔"

"کیا کریں گے مس نینی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل تو چائے پی تھی۔"

"آپ۔ آپ بہت ہینڈ سم ہیں سامری۔" میں نے تو جب سے آپ کو دیکھا ہے ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہوں۔"

"اوہ۔ خود میری بھی یہی کیفیت ہے ڈیئر نینی۔" سامری نے کہا۔

"سامری کیا۔ آپ اپنے وطن واپس چلے جائیں گے۔"؟

"آپ منع کریں گی تو نہیں جاؤں گا۔" سامری نے کہا۔ اور نینی اس کے قریب آ گئی۔

"میں آپ کو چاہتی ہوں سامری۔"

"اور میں بھی۔" سامری نے کہا اور نینی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ نینی کے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے آ ملے تھے۔

ایک طویل بوسے سے فارغ ہو کر نینی اس سے الگ ہو گئی۔ "اب آپ اپنے کمرے میں آرام کریں میں تھوڑی دیر کے بعد آؤں گی۔"

"جی بہتر۔ میں شو پر جاؤں گا"!

"میں بھی چلوں گی۔" نینی نے کہا اور سامری اس کمرے سے نکل آیا چند ساعت کے بعد وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

نینی کے اظہار محبت کے خوشگوار تاثر نے اس کی روح میں طمانیت بھر دی تھی۔ وہ

سوچ رہا تھا کہ نینی واقعی خوبصورت لڑکی ہے' اور ہر لحاظ سے دلکش' اگر ممکن ہو سکا تو وہ اس کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لے گا' یوں بھی مالدار آدمی کی بیٹی تھی اور اتنی دولت مند تھی کہ اس کے بعد سامری کو کسی قسم کی تکلیف اٹھانے کا موقع ہی نہ رہتا تھا۔ بہر حال اس نے شو کے لباس کی تیاریاں شروع کر دیں وہ اپنا سامان بھی یہیں لے آیا تھا۔ پھر اس نے اپنے سامان میں سے ایک سوٹ نکالا اور اسے پہننے لگا۔ سوٹ پہننے کے بعد اس نے چند ساعت نینی کا انتظار کیا تب اس نے سوچا کہ خود ہی چلا جائے۔ تب وہ نینی کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

دروازہ کھولا تو نینی سامنے ہی نظر آئی' عجیب سی شکل بنائے ہوئے وہ ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ سامری کو دیکھتے ہی اس نے نفرت سے منہ سکوڑ لیا' اور سامری کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا ہو گئے۔

"نینی۔" اس نے نینی کو آواز دی۔ اور نینی بپھرے ہوئے انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے ڈیئر۔" وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور نینی کے نزدیک پہنچ گیا' اس نے نینی کے شانوں پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے اب تو بے تکلفی کے سارے مراحل طے ہو گئے تھے۔ چنانچہ کسی بھی قسم کا کوئی ہرج تو تھا نہیں۔ لیکن نینی کا تھپڑ شاخ کی زور دار آواز کے ساتھ سامری کے منہ پر پڑا اور سامری بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ارے ارے تمہیں کیا ہوا۔" اس نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

"میں تم جیسے لوگوں سے بے انتہا نفرت کرتی ہوں۔" نینی غرائے ہوئے لہجے میں بولی اور سامری ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ارے باپ رے لیکن آپ اس کمرے میں کیسے موجود ہیں مس فرحت۔" اس نے پوچھا۔

"فرحت۔" نینی غرائی۔

"تو۔ تو۔ تو پھر کون ہیں آپ۔"

"نینی ہوں نینی۔ کیا سمجھے۔"

"ٹھک کیا۔"

"ہاں میں نینی ہوں سمجھے' نہیں سمجھے۔" نینی غرائی۔

"س۔ سس سمجھ گیا۔" سامری ہکلایا۔

"فرحت وہ تھی جس سے تم عشق لڑا رہے تھے۔"

"کک۔ کیا۔"؟ سامری اچھل پڑا۔

"دیکھو سامری ہوش میں رہو' میں تمہارا دماغ درست کرونگی۔"

"ارے ارے مس نینی۔ آپ یقین کریں' آپ یقین کریں۔ میں۔ میں تو۔"

"میں کوئی یقین کرنا نہیں چاہتی۔ گیٹ آؤٹ' پلیز گیٹ آؤٹ۔" نینی غرائی اور سامری چند ساعت تک سوچتا رہا کہ کیا کرے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہو گئی تھی' اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا' ان دونوں لڑکیوں نے تو اس کی ساری شعبدہ گری ہوا کر دی تھی۔ فرحت۔ لیکن فرحت نے ایسا کیوں کیا۔ کیا وہ فرحت تھی۔ یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل کام تھا' ممکن ہے یہ نینی نہ ہو فرحت ہو' چنانچہ وہ ہمت کر کے بولا۔

"دیکھو مس فرحت اگر تم مجھ سے فراڈ کر رہی ہو تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے' میں نینی کا مہمان ہوں اور وہ مجھے چاہتی ہے۔"

"میں کہتی ہوں باہر نکل جاؤ۔" نینی غرا کر کھڑی ہو گئی اور سامری جلدی سے باہر نکل گیا۔ لیکن اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی باہر نکل کر وہ کافی دیر تک کچھ سوچتا رہا' چند ساعت وہ اسی طرح کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ دوبارہ نینی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"مس نینی میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ درحقیقت غلط فہمی ہو گئی تھی آپ میرے ساتھ تو چلئے اس کے بعد ہم لوگ فیصلہ کر لیں گے۔ قصور آپ کی بہن کا ہے۔"

نیی اسے خونخوار نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ "میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے گھٹیا انسان ہو گے۔"

"آپ مجھے جو دل چاہے کہہ لیں لیکن آپ کو میری باتیں سننا پڑیں گی۔ آیئے ہم چلتے ہیں' اس کے بعد راستے میں باتیں کریں گے۔" سامری نے کہا اور نجانے کیوں نینی مان گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کار میں بیٹھے ہوٹل کی جانب جا رہے تھے۔ نینی بدستور

پھولی ہوئی تھی۔

"آپ کی بہن فرحت بیحد چالاک معلوم ہوتی ہیں آپ یقین کریں میں آپ کے دھوکے میں ان کے پاس پہنچ گیا' حالانکہ ایک دفعہ وہ میرے چہرے پر تھپڑ لگا چکی ہیں' لیکن آج نجانے کیوں انہوں نے اس قدر دلچسپی کا اظہار کیا۔"

"کیا تم درست کہہ رہے ہو سامری۔"

"ہاں مس نینی۔ آپ خود سوچیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں انہیں۔"

"فرحت بیحد کمینی ہے۔ اگر اس نے یہ اقدام کیا ہے تو صرف مجھے جلانے کے لئے۔ لیکن دیکھ لوں گی اسے۔" نینی نے کہا۔

"رات کو سامری نے شو کیا۔ اور پھر نینی کے ساتھ ہی واپس آ گیا۔ رات کے کھانے پر سب موجود تھے۔ ملک صاحب حسب معمول گہرافشانی فرما رہے تھے۔ اور سب ان کی بکواس سے بور ہو رہے تھے۔ پھر انہوں نے تجویز پیش کی۔

"آج پورا چاند ہے کیوں نہ سمندر کی سیر کی جائے۔ چاندنی سمندر پر دوڑتی ہوئی بے حد حسین لگتی ہے۔"

"واہ ملک صاحب کیا روشنی دوڑتی ہے۔ فیروز صاحب آپ بھی چلئے۔" سامری نے لقمہ دیا۔

"بھئی میں بچوں کے درمیان کیا کروں گا' تم لوگ جاؤ۔" فیروز صاحب نے سیر چشمی سے کہا۔ اور ملک صاحب نے سامری کی طرف دیکھ کر آنکھ دبا دی۔ دونوں لڑکیاں بھی تیار ہو گئی تھیں۔ ویسے سامری خوفزدہ تھا۔

سمندر کے کنارے پر زیادہ رونق نہیں تھی۔ وہ چاروں ساحل پر پہنچ گئے۔ ٹھنڈی ریت کے ٹیلے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔ دیر تک وہ خاموشی سے چہل قدمی کرتے رہے۔ پھر سامری نے نینی سے کہا۔

"مس نینی آپ اس ٹیلے تک دوڑیں گی میرے ساتھ۔"

"کیوں۔"؟

"دیکھتے ہیں کون تیز دوڑتا ہے۔"

"میں ایک اور تجویز پیش کروں۔" ملک صاحب بولے۔

"جی۔" سامری نے کہا۔

"کیوں نہ آنکھ مچولی کھیلی جائے۔"

"وہ کیا ہوتی ہے۔" سامری نے پوچھا اور ملک صاحب آنکھ مچولی کی تفصیل بتانے لگے۔ سامری نے اس کھیل کو پسند کیا تھا۔ دونوں لڑکیاں بھی تعاون پر آمادہ تھیں۔ اور پھر کھیل شروع ہو گیا۔

یہ ساری تفریح پروگرام کے مطابق ہو رہی تھی۔ لیکن اس میں الجھن کی صرف ایک بات تھی وہ یہ کہ فرحت نے جان بوجھ کر ایسا ہی لباس پہنا تھا جو نینی نے پہنا تھا۔ سامری کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا لیکن بہرحال آج وہ محتاط رہنا چاہتا تھا۔

ملک صاحب چور بنے۔ اور وہ لوگ ٹیلوں کے پیچھے جا چھپے۔ نینی سامری سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ تینوں دور سے ملک صاحب کو دیکھ رہے تھے جو بیوقوفوں کی طرح منہ اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ جب وہ کسی کی طرف بڑھتے تو وہ ٹیلہ چھوڑ کر دوسرے ٹیلے کی آڑ میں ہو جاتا۔ اسی طرح وہ ٹیلے بدلتے رہے۔

پھر سامری ایک ٹیلے کی طرف پہنچا تو وہاں نینی موجود تھی۔ "یہ ملک صاحب واقعی بے وقوف ہیں۔"

"یقیناً" نینی نے جواب دیا۔

"براہ کرم یہ بتا دیں کہ آپ نینی ہیں یا فرحت۔"

"ارے۔" نینی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "آپ ڈر رہے ہیں۔"

"دونوں خواتین کے تھپڑ کھا چکا ہوں۔ مزید نہیں کھانا چاہتا۔"

"میں فرحت ہوں سامری صاحب۔" نینی بولی۔

"ارے باپ رے۔" سامری اچھل پڑا۔

"میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

"نف۔ فرمائیے۔"

"نینی کے اندر کیا خوبی ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔"؟

"وہ تو ٹھیک ہے مس فرحت۔ لیکن۔ لیکن آپ غور کریں۔ آپ"

"سامری صاحب۔ میں آپ کو پسند کرنے لگی ہوں۔ اگر آپ نے میری محبت کا جواب محبت سے نہ دیا تو آپ دیکھیں گے کہ میں آپ کا کیا حشر کرتی ہوں"

"یعنی آپ دھمکیاں دے رہی ہیں۔"

"ہاں یہی سمجھ لیں۔" فرحت نے کہا۔ اور سامری پریشان نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

دوسرے شکار ملک صاحب تھے۔ بالآخر وہ ایک چور کو پکڑنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ یہ نینی جو ایک ٹیلے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"پکڑ لیا۔ پکڑ لیا۔" ملک صاحب خوش ہو کر بولے۔

"بکواس مت کرو۔ خاموش رہو۔" نینی غرائی۔

"کیا مطلب؟" ملک صاحب کا منہ پھیل گیا۔ لیکن پھر ان کی نگاہیں بھی نینی کی نگاہوں کے تعاقب میں اٹھ گئیں! "آہ دیکھئے مس فرحت۔ وہ دونوں کتنے خوش ہیں۔ پیار محبت کا یہی موسم ہوتا ہے۔" ملک صاحب نے کہا اور نینی چونک پڑی۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے ملک صاحب کو دیکھنے لگی تھی۔

"ملک صاحب۔"

"فرحت ڈارلنگ۔"

"کیا آپ واقعی مجھے چاہتے ہیں۔"

"بری طرح مس فرحت۔"

"آہ ملک صاحب۔ آپ کی محبت نے مجھے متاثر کر ہی دیا۔"

"میں آپ پر زندگی نچھاور کر سکتا ہوں مس فرحت۔"

"تب پھر۔ رات کو۔ دو بجے میں اپنے کمرے میں آپکا انتظار کرونگی۔"

"کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں مس فرحت۔"؟

"جی ہاں۔"

"میں آؤں گا۔ ضرور آؤں گا۔ آپ بلائیں اور میں حاضر نہ ہوں۔"

ملک صاحب بولے۔

"اب جائیں۔ محبتوں کا یوں آشکارا نہیں کرتے۔ کسی کو ہماری محبت کا علم نہ ہونے پائے۔" نینی نے کہا اور ملک صاحب شرافت سے چلے گئے۔ نینی کے پیٹ میں قہقہے مچل رہے تھے۔

فیروز صاحب نے دروازہ کھول دیا۔ وہ نیند سے بوجھل آنکھوں سے نینی کو دیکھ رہے تھے۔ "کیا بات ہے بیٹے۔"؟

"ڈیڈی۔ ایک ضروری کام سے آئی تھی۔"

"اس وقت۔"

"ہاں ڈیڈی مجھے اندازہ ہے۔ دو بجے ہیں۔"

"کیا بات ہے۔ اندر آؤ۔" فیروز صاحب بولے۔

"ڈیڈی۔ آپ ملک صاحب کو اچھا انسان سمجھتے ہیں۔"

"کیا ہوا ہے۔؟"

"میں نے انہیں چوروں کی طرح فرحت کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔"

"کیا۔ ابھی۔"؟

"ہاں۔"

"اوہ۔ ٹھہرو۔ میں گاؤن پہن لوں۔ ابھی چلتا ہوں۔"

"جلدی آیئے ڈیڈی۔" نینی بولی اور فیروز صاحب گاؤن پہن کر نکل آئے۔ میرا جانا مناسب نہیں ہے ڈیڈی۔ آپ جا کر دیکھیں۔" نینی بولی اور فیروز صاحب غصے میں ڈوبے فرحت کے کمرے کی طرف چل پڑے لیکن ابھی وہ دور ہی تھے کہ انہیں کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔

یہ ملک صاحب تھے جنہیں فرحت نے کراٹے کا ایک داؤ مار کر باہر پھینک دیا تھا۔ پھر بپھری ہوئی فرحت باہر نکلی اور اس نے ملک صاحب پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

"ذلیل کمینے انسان تیری جرات کس طرح ہوئی۔" فرحت غصے سے رو پڑی۔ لیکن ملک صاحب اس کو ہر ٹھوکر پر کراہنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ پھر فرحت کی نگاہ فیروز صاحب پر پڑی۔

"اٹھایئے ڈیڈی اپنی سوغات کو۔ اگر آپ کی وجہ سے یہ گھر ہمارے لئے مخدوش ہو گیا ہے تو ہم کسی ہوٹل میں اپنا بندوبست کر لیں۔"

"سوری بیٹے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ملک امان اللہ کا بیٹا اتنا ذلیل فطرت انسان ہو سکتا ہے۔" فیروز صاحب نفرت سے بولے۔ اور پھر ملک صاحب کو زمین سے اٹھاتے ہوئے کہنے لگے۔ "تم سورج نکلنے کے فوراً بعد یہ گھر چھوڑ دو گے اور پھر ادھر کا رخ نہیں کرو گے۔ سمجھے۔ ورنہ اپنی اس بے عزتی پر میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

ملک صاحب اٹھ کر بھاگ گئے تھے۔ لیکن وہ سورج نکلنے سے قبل ہی نکل بھاگے تھے۔ رہ گیا سامری تو وہ بھی برا پھنسا تھا۔ اب دونوں بہنوں کی توجہ کا مرکز وہی بن گیا تھا۔ فرحت کھل کر اس سے اظہار عشق کر چکی تھی۔ دوسری طرف نینی تھی۔ حالانکہ سامری نینی سے زیادہ متاثر تھا۔ لیکن دونوں بہنوں کا مشکل ہونا بیحد خطرناک تھا اور خاص طور سے ایسی صورت میں جبکہ دونوں کھل گئی تھیں۔

"یقین کیجئے۔ نینی فرحت سے بس صرف آپ کے دھوکے میں مل لیتا ہوں۔ ورنہ میں اس سے کبھی نہ ملوں۔"

"لیکن آپ بار بار دھوکا کیوں کھا جاتے ہیں۔"

"آپ دونوں کی شکلیں جو یکساں ہیں۔"

"ڈیڈی کو تو کبھی دھوکا نہیں ہوتا۔"

"افسوس میں ڈیڈی نہیں ہوں۔" سامری بیچارگی سے بولا۔

"اس فرحت کی بچی سے تو میں اچھی طرح نمٹ لوں گی۔ کسی وقت بری طرح مار کھائے گی میرے ہاتھوں سے۔ میں جان رہی ہوں وہ چھانٹ چھانٹ کر ویسے ہی لباس پہن رہی ہے آجکل جیسے کہ میں پہنتی ہوں۔ اور پتہ ہے کیوں صرف تمہیں بیوقوف بنانے کے لئے لیکن سامری اگر تمہارے دل میں میری محبت ہے تو تمہیں اس کے ہاتھوں بیوقوف

نہیں بننا چاہئے بلکہ مجھے پہچان لینا چاہئے۔"

"اب پہچان لوں گا۔ نینی بھروسہ رکھو۔" سامری نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"عجیب مصیبت کا شکار ہو گیا تھا وہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، فرحت بھی کھل کر سامنے آ گئی تھی وہ صاف لہجے میں اس سے بات کرتی تھی اور کہتی تھی کہ آخر اس میں کیا کمی ہے۔ دوسری بار جب فرحت ملی تو اس نے سامری کو پکڑ لیا۔

"سامری صاحب، کیا سوچا آپ نے میرے بارے میں۔"

"جی جی۔ آپ۔ آپ۔"

"میں فرحت ہوں۔" فرحت بولی

"ہاں ہاں میں پہچان گیا ہوں۔" سامری خوش ہو کر بولا۔

"تو پھر مجھے جواب دیجئے۔"

"میں کیا جواب دوں مس فرحت۔"

"میں ڈیڈی سے بات کروں۔" فرحت نے کہا۔

"م۔ میرا خیال ہے ابھی نہیں۔"

"پھر کب۔"؟

"آپ پہلے میری بات تو سن لیں۔"

"جی فرمائیے۔" فرحت نے سنجیدگی سے کہا۔

"دراصل مس فرحت آپ کو معلوم ہے کہ مس نینی مجھے یہاں لائی ہیں اور وہ بھی مجھ سے خاصی متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے اگر میں نے انہیں نظر انداز کیا تو وہ یہاں میری موجودگی پسند نہیں کریں گی۔"

"اس کی کیا مجال ہے کہ وہ پسند نہ کرے، میں دیکھوں گی کہ وہ کیسے پسند نہیں کرے گی۔" فرحت نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ نے ملک صاحب کا حشر دیکھا۔" سامری نے کہا۔

"آپ میں اور ملک صاحب میں خاصا فرق ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے مس فرحت لیکن۔"

"لیکن کیا۔"؟

"مس نینی اس بات کو کہاں برداشت کریں گی۔"

"وہ برداشت کرنے والی یا نہ کرنے والی کون ہوتی ہے۔" فرحت غصیلے لہجے میں بولی۔

"آپ لوگ پہلے آپس میں فیصلہ کر لیں مس فرحت، تب میری رائے بھی آپ کے سامنے آ جائے گی۔"

"نہیں میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں، آپ نینی سے شادی کرنے کے خواہشمند ہیں یا مجھ سے شادی کرنا پسند کریں گے۔"

"دیکھئے مس فرحت مجھے اس سلسلے میں صرف دو دن کا موقع اور عنایت فرما دیجئے۔" سامری نے کہا۔ لیکن اس وقت اس کی روح فنا ہو گئی جب اس نے دروازے میں نینی کو کھڑے دیکھا۔ نینی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے خونخوار انداز میں انہیں گھور رہی تھی۔

"ہوں۔ تو یہاں عشق و محبت ہو رہا ہے۔ سامری تم کب تک مجھے بیوقوف بناتے رہو گے۔"

"م میں۔ میں۔ میں نے آپ کو بیوقوف نہیں بنایا۔ یہ مس مس فرحت۔"

"فرحت۔" نینی خونخوار انداز میں آگے بڑھی اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"فرحت تم میرے راستے میں آنے سے باز نہیں آؤ گی۔"

"بکواس مت کرو تم ہوتی کون ہو میرا راستہ روکنے والی۔" فرحت نے کہا۔

"میں تمہاری شکل بگاڑ دوں گی نینی۔" فرحت نے کہا اور نینی پر ٹوٹ پڑی۔

اور اب سامری کو ایک کونے میں کھڑے ہو جانا پڑا، دونوں خونخوار انداز میں ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں، مصیبت کی بات یہ تھی کہ وہ مارشل آرٹ سے واقف معلوم ہوتی تھیں، وہ دونوں ایک دوسرے کو بری طرح مار رہی تھیں اور سامری بے چارے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ انہیں روک سکتا۔ اس کی ساری شعبدہ گری دھری رہ گئی تھی، تب اس نے یہی سوچا کہ اس جگہ سے باہر نکل جائے۔ وہ دروازے کی طرف کھسکا لیکن

فرحت اس کے سامنے آ گئی۔

"اگر تم نے باہر جانے کی کوشش کی۔ تو۔تو۔"

"سامری تم باہر نہیں جاؤ گے۔" نینی بولی۔

"ابھی اسی جگہ فیصلہ ہو گا کہ ہم دونوں میں سے کون تم سے شادی کرے گا۔" نینی نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"م۔ میں ابھی آتا ہوں۔" سامری گھگھیا کر بولا۔

"تم نے دروازے سے قدم نکالا تو ——— تو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" نینی چیخی۔

"میں بھی۔" فرحت گرجی۔

"بتاؤ کس سے شادی کرو گے۔ تم خود جواب دو۔" دونوں دروازے پر جم گئی تھیں۔ دونوں کی بری حالت ہو رہی تھی۔

"دیکھئے خواتین۔ ایسی حالت میں فیصلہ کس طرح ہو سکتا ہے۔" سامری کی بری حالت تھی۔

"فیصلہ ابھی ہو گا۔"

"ابھی اور اسی وقت۔"

"تو پھر۔ آپ لوگ خود ہی فیصلہ کر لیں۔" سامری نے مظلومانہ لہجے میں جواب دیا اور دونوں اسے گھورنے لگیں۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دیر تک دیکھتی رہیں۔

"فرحت۔" نینی بولی۔ "اس کا مقصد ہے کہ یہ ہم دونوں کو بیوقوف بنا رہا ہے۔"

"یقیناً ایسی ہی بات ہے۔" فرحت بولی۔

"پھر تو ہم بلاوجہ ہی اس کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کیوں۔"؟

"بیشک۔"

"اس کی ایسی تیسی۔ اس کی یہ مجال۔" فرحت نے غراتے ہوئے کہا۔ اور پھر دونوں سامری کی طرف جھپٹیں۔ سامری جھکائی دے کر ایک طرف ہو گیا تھا۔

"ارے ارے۔ آپ لوگ غیر اخلاقی ---- ہیں میں آپ کا۔" لیکن دوسرے لمحے فرحت کا گھونسہ اس کے جبڑے پر پڑا۔

"مہمان ہیں۔ کیوں۔" نینی نے اس کے بال نوچ ڈالے۔

"نینی تم اسے پکڑو۔ میں گولی ماروں گی اس کمینے کو۔ اس نے ہماری توہین کی ہے۔" فرحت دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ شاید پستول لینے گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سامری کو بھی موقع مل گیا۔ وہ نینی کے چنگل سے نکل کر دروازے کی طرف بھاگا تھا۔

"نکلنے نہ پائے۔ فرحت۔ فرحت۔" نینی چیخی لیکن دوڑنے میں وہ سامری کا مقابلہ نہیں کر سکی تھیں۔ سامری بے تحاشہ دوڑتا ہوا کوٹھی سے باہر نکل آیا تھا اور یہ اس کی خوش بختی تھی کہ اسے ایک ٹیکسی فوراً ہی مل گئی۔

مینجر نے چونک کر اسے دیکھا۔ "لیکن آپ کیوں جانا چاہتے ہیں مسٹر سامری' ہمارے ہوٹل میں آپ کا شو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔"

"براہ کرم جلدی کریں۔ ورنہ کسی مصیبت کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ مجھے میرا معاوضہ دے دیں۔" سامری بولا۔

"کیوں۔"؟ مینجر نے کہنا چاہا۔

"آپ میری بات نہیں مانیں گے۔"؟ سامری غرایا۔

"اوہ۔ معاوضہ یہ لے لیں لیکن۔" مینجر نے جیب سے نوٹ نکال کر گنتے ہوئے کہا اور سامری نے نوٹوں پر جھپٹا مارا۔ مینجر اسے آوازیں دیتا رہا تھا لیکن سامری نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ دوڑتا ہوا باہر آیا تھا ٹیکسی اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

"چلو۔" سامری ٹیکسی میں بیٹھتا ہوا بولا۔

"اب کہاں چلوں صاحب۔" ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

"ریلوے اسٹیشن آہ۔ جلدی کرو۔" سامری نے دور سے نینی کی کار دیکھ لی تھی جس میں دونوں بہنیں موجود تھیں۔ ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ کافی دور جا کر سامری نے سکون کی سانس لی تھی۔ شائید انہوں نے اس کی ٹیکسی نہیں دیکھی تھی۔

خالی چہرہ

کالی صورت کالی زبان کی فوزیہ' واپس آکر تیری چپٹی ناک بالکل ہی چپٹی نہ کر دی تو قدسیہ نام نہیں۔ قدسیہ ربانی نے دانت پیستے ہوئے کہا اور کار کو ریس دینے لگی اس کے ساتھ ہی اس نے کلچ آدھا چھوڑا ہوا تھا۔ گاڑی سکنڈ گیئر میں تھی۔ مقصد یہی تھا کہ سائیلنسر میں پانی نہ آنے پائے۔ تقریباً ایک فرلانگ کا نشیب تھا۔ اس کے بعد ذرا بلندی نظر آ رہی تھی اور وہاں پانی نہیں جمع ہوا تھا۔ بارش تھی کہ قیامت چاروں طرف پانی کا دھواں نظر آ رہا تھا۔ اور آسمان کا صرف ایک ہی رنگ تھا۔

بڑے بڑے دل گردے کے لوگ اس طوفانی بارش میں سفر کی جرات نہیں کر سکتے تھے لیکن قدسیہ کے بارے میں اس کی تمام سہیلیوں کی رائے تھی کہ اس کے سینے میں دل گردے نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے بلکہ اس کا اندرونی نظام عام انسانوں جیسا ہے ہی نہیں۔ شاید وہ اندر سے ٹھوس تھی بالکل ٹھوس۔

لیکن بات اس قدر نہیں تھی جتنی بڑھا چڑھا دی گئی تھی۔ وہ میڈیکل کی طالبہ تھی اور خاص طور سے سرجری سے دلچسپی رکھتی تھی۔ اس لئے مردوں کی چیر پھاڑ سے اسے خاص رغبت تھی۔ اور وہ بغیر کسی دقت کے ان کے سارے اعضاء الگ کر لیا کرتی تھی جبکہ دوسری لڑکیاں اور لڑکے تک بدہیبت مردوں سے خوف کھاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ جنونی حد تک ایڈونچر پسند تھی اور خطرناک ترین مراحل سے بھی خوف نہیں کھاتی تھی۔

بس اس کی انہی خصوصیات کو بڑھا چڑھا دیا گیا اور یہ بات کسی کو نہیں معلوم تھی کہ دیواروں پر رینگنے والی چھپکلیوں سے اس کا دم نکلتا ہے۔ چھپکلی کے علاوہ کسی اور جانور سے

نہیں ڈرتی تھی لیکن جہاں چھپکلی دیکھی اس کا رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں۔!

دن کو تین بجے گھر سے نکلی تھی۔ احسن آباد سے دلاور پور کا فاصلہ ڈھائی سو کلو میٹر تھا اور خطرناک ترین راستوں پر بھی قدسیہ ربانی کی کار کے میٹر کی سوئی سو سے نیچے نہیں رہی تھی۔ محتاط اندازے کے مطابق اس کا خیال تھا کہ یہ سفر ساڑھے تین گھنٹے سے زیادہ کا نہیں ہوگا اس بنیاد پر اس نے اپنی سہیلیوں کو چیلنج کر دیا تھا۔ "تم میں سے جو میرے ساتھ چلنا چاہے چلے چھ بجے میں ناہید کے گھر ہوں گی لیکن ٹرین تم لوگوں کو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے پہنچائے گی۔"

"نہیں بھائی ہمیں ابھی دنیا دیکھنی ہے۔ تم شائد کسی عشق و شق میں ناکامی کے بعد خودکشی کرنے پر تل گئی ہو اور چاہتی ہو کہ دوسری دنیا میں بھی تنہا نہ جاؤ۔ لیکن ہم میں سے کوئی تمہارے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔" فرخندہ نے کہا تھا۔

"قدسیہ تم بھی ٹرین سے کیوں نہیں چلتیں لطف رہے گا۔" محمودہ بولی۔

"جی نہیں مجھے ریل گاڑیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ٹرین کا سفر بھی کوئی سفر ہے۔ میں تو کار سے ہی جاؤں گی تم میں سے کوئی میرے ساتھ نہیں جائیگا تو میں تنہا ہی جاؤں گی۔"

"تب پھر فی امان اللہ جاؤ لیکن یہ سوچ لو قدسیہ بارشوں کا موسم ہے۔ اور پہاڑی راستوں پر بعض اوقات اتنا پانی جمع ہو جاتا ہے کہ بسیں بھی ڈوب جائیں۔ تمہاری ننھی منی کار میرا خیال ہے کہ کشتی کا کام نہیں دے سکتی۔" فوزیہ نے کہا۔

"بس چپٹی ناک والی۔ تم تو بولا ہی نہ کرو۔ اچھا پھر خدا حافظ۔" قدسیہ باہر نکل آئی۔

اس سلسلے میں تو اس نے ربانی صاحب کی بات بھی نہیں مانی تھی۔ ربانی صاحب اس کے والد تھے اور انہوں نے بڑے ناز و نعم سے قدسیہ کو پرورش کیا تھا۔ بچپن ہی سے ماں سے محروم ہو گئی تھی اور اس کے بعد سے ربانی صاحب نے اسے کسی اور محرومی کا شکار نہ ہونے دیا اسی وجہ سے قدسیہ اتنی خود سر ہو گئی تھی۔ کالج میں ان دنوں چھٹیاں تھیں اور دلاور پور میں ان کی ایک مشترکہ سہیلی کی سالگرہ تھی' چنانچہ سب لڑکیوں نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ قدسیہ بھی تیار ہو گئی لیکن وہ ہمیشہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی عادی تھی

چنانچہ یہاں بھی اس نے ٹانگ اڑا دی۔ اس نے کہا کہ کاروں سے سفر کیا جائے لیکن دوسری لڑکیاں اس کی طرح بے جگر نہیں تھیں اور پھر سب کے والدین ان کے ہاتھوں اتنے مجبور بھی نہیں تھے جتنے ربانی صاحب۔

قدسیہ چل پڑی۔ لیکن چپٹی ناک والی فوزیہ کی پیشن گوئی درست ثابت ہوئی۔ ابھی اس نے ایک چوتھائی سفر طے کیا تھا کہ بارش کی یورش شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سیاہ ہو گیا اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ لیکن بارش بھی بارش تھی خدا کی پناہ۔ ذرا سی دیر میں جل تھل ہو گیا تھا اور سڑکوں کے نشیب بھر گئے تھے۔ اور اب واقعی قدسیہ کو ڈرائیونگ میں کافی مشکل پیش آ رہی تھی۔ اگر گاڑی بند ہو گئی تو مصیبت ہی آ جائے گی۔ پانی کا کوئی ریلا اسے کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے قدسیہ کوشش کر رہی تھی کہ کوئی مناسب جگہ تلاش کر لے اور یہ مناسب جگہ بلندی ہی ہو سکتی تھی۔ کوئی ایسی بلندی جہاں بارش کا پانی نہ رک سکے۔

اب اس کے سوا اور کیا سوچا جا سکتا تھا کہ بارش سے پناہ لینے کے لئے کوئی جگہ مل جائے سفر کا مسئلہ تو کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ بارش بھی محض فوزیہ کی وجہ سے آئی تھی ورنہ کوئی تک تھی۔ یہ دن تو باقاعدہ بارشوں کے بھی نہیں تھے۔ لیکن فوزیہ کی کالی زبان۔

"خدا کرے کیڑے پڑ جائیں اس زبان میں۔ سڑ کر گر جائے۔"

قدسیہ بمشکل تمام ڈرائیونگ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی اور کار رینگنے کی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی اسے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے سمندر میں کشتی چلا رہی ہو۔ پانی کچھ اس طرح چاروں طرف پھیلا ہوا تھا کہ بلاشبہ اگر کوئی کمزور دل لڑکی ہوتی تو دہشت سے بیہوش ہو جاتی۔ لیکن اس کے حواس پوری طرح قابو میں تھے۔

اس کی نگاہیں اس بلندی پر تھیں جو اب نزدیک آتی جا رہی تھی۔ لیکن کار کی رفتار ست رکھنی پڑ رہی تھی یہ ضروری تھا۔ ویسے احسن پور سے دلاور پورہ کئی بار جا چکی تھی۔ دلاور پور میں ان کے ایک قریبی عزیز بھی رہتے تھے۔ اور اتنے اچھے لوگ تھے کہ قدسیہ اکثر ان سے ملنے کے لئے جاتی رہتی۔ جب بھی چھٹیاں ہوتیں وہ ایک دو دن کے لئے اپنے ان عزیزوں کے ہاں چلی جاتی تھی۔ اور عام طور سے یہ سفر کار کے ذریعے ہی طے ہوتا تھا۔

چنانچہ اس نے جو چیلنج کیا تھا وہ غلط نہیں تھا وہ ساڑھے تین گھنٹے میں بھی پہنچ کر دکھا سکتی تھی مگر پھر وہی فوزیہ کی کالی زبان اسے جب بھی فوزیہ کی شکل یاد آتی شدید غصہ آ جاتا' وہ لوگ مزے سے ٹرین میں ہنستی بولتی سفر کر رہی ہوں گی۔ پھر اس نے اپنے بارے میں سوچا۔

اس سے بھی تو غلطی ہی ہوئی تھی' بھلا سب لوگوں کے ساتھ ٹرین کے سفر میں جو لطف آتا وہ بھلا اس تنہا سفر میں کہاں! لیکن بس ضد ہی تو تھی اور اس نے ضد میں آ کر دوسرے لوگوں کی بات نہیں مانی اور یہ ضد اسے ذلیل و رسوا کر رہی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اگر وہ وقت پر نہ پہنچی تو وہ سب کی سب اس کا مذاق اڑائیں گی' حالانکہ سالگرہ دوسرے دن تھی لیکن ان لوگوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک رات اپنی اس سہیلی کے ساتھ ہی گزار دی جائے۔ وہ انہیں دیکھ کر کتنی خوش ہو گی اور حیران بھی۔ لیکن اب اب تو اس کا پہنچنا ذرا مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ بارش کا دھواں تاحد نگاہ بکھرا ہوا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بارش اس کا راستہ روکنا چاہتی ہو۔

اس نے اپنے ذہن کو مختلف خیالات میں الجھانے کی کوشش کی کہ کس طرح پانی کا خوف ذہن سے نکل جائے لیکن کار کی رفتار ست ہو چکی تھی ایکسیلیٹر پر دباؤ بہت تیز تھا اور اس نے کلچ آدھا چھوڑا ہوا تھا' اس طرح انجن تو گرم ہو رہا تھا لیکن یہی ضروری تھا کہ سائیلنسر میں پانی نہ آئے۔

"خدا خدا کر کے پانی کی شرر شرر کچھ کم ہونے لگی' گویا اب وہ بلندی کی جانب جا رہی تھی لیکن سڑک پھسلوان تھی اور اس پھسلوان سڑک پر کار ڈرائیونگ کافی مشکل کام تھا۔ ڈرائیونگ کے سلسلے میں قدسیہ کو زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ وہ بلاشبہ ایک ماہر ڈرائیور تھی اور اگر ماہر نہ ہوتی تو اس آسانی سے کار کو پانی سے باہر نہ نکال لاتی۔ حالانکہ ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا لیکن بادلوں نے آسمان کو ڈھک لیا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے سات ساڑھے سات بج چکے ہوں۔ اب خشک سڑک آ گئی تھی حالانکہ پانی یہاں بھی تیزی سے پڑ رہا تھا لیکن نیچے ڈھلان کی جانب جا رہا تھا۔ وہ بلندی خاصی طویل تھی' لیکن اس کے بعد پھر ڈھلان تھا اور اس ڈھلان پر بھی پانی اتنا ہی ہو گا' اگر انہی ڈھلانوں کا سفر جاری رکھا تو ایسی

ہی کسی جگہ کار ڈوب بھی سکتی ہے جہاں بہت زیادہ پانی ہو۔

اور یہ تشویشناک بات تھی۔

پھر کیا کیا جائے۔ اس ہولناک ویرانے میں رک کر بارش کے رک جانے کا انتظار کیا جائے۔ لیکن بارش نہ جانے کب تک جاری رہے اف خدایا! کس مصیبت میں پھنس گئی۔

کاش ڈیڈی ہی کی بات مان لیتی انہوں نے زمانے کی خرابی کا ذکر کیا تھا۔

لیکن قدسیہ خراب زمانے سے کہاں ڈرتی تھی۔ کئی بدمعاشوں کی مرمت کر چکی تھی اور ہر طرح سے نڈر تھی۔ اس نے کسی کی نہیں سنی تھی اور اب اس کا خمیازہ بھگت رہی تھی۔ بلندی کا سفر اس نے تیزی سے کیا پھر ایک چھوٹے سے ڈھلان کو بھی عبور کر گئی اب تقریباً" پچاس کلو میٹر تک ہی بلند راستہ تھا۔ لیکن اس کے بعد قدسیہ کو وہ ڈھلان یاد تھے جہاں ایک بار اس کی کار کے بریک فیل ہو گئے تھے اور تین میل تک اس نے وہ طوفانی سفر کیا تھا جو اس کی زندگی کا یادگار سفر تھا۔

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تین میل کے وہ ڈھلان یقیناً موت کے پیغامبر تھے وہاں ڈرائیونگ کر جانا ممکن ہو گا اس کی ہمت ساتھ چھوڑنے لگی۔ نہیں وہ ڈھلان نہیں طے کئے جا سکتے۔ پھر اب۔

اس نے کار روک دی۔ اس بارش میں تو کوئی اس طرف سے گزرے گا بھی نہیں۔ بیکار ہے۔ آگے بڑھنا موت کو دعوت دینا ہے۔ اور بہرحال وہ اتنی نڈر نہیں تھی کہ موت کو گلے لگانے دوڑ پڑتی۔

بڑے وحشت ناک خیالات آ رہے تھے اس کے ذہن میں کار کی چھت پر جلترنگ بج رہا تھا اور واپر بہتے ہوئے پانی کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس نے انجن کو زبردست ریس دی اور بند کر دیا۔ پھر دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ لیکن تیز بارش سر پر جوتوں کی طرح پڑی اور وہ بوکھلا کر اندر گھس گئی۔ پھر اس نے واپیر مشین بھی بند کر دی۔ بیٹری نئی تھی لیکن اسے اس طرح ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔

آج تو واقعی گڑبڑ ہو گئی۔ کاش کسی کی بات مان لی جاتی۔ اس نے سوچا اور دفعتاً اس کے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔

"ہاں بیٹے بس سردی اتنی شدید تھی کی اسٹیرنگ برف ہو رہا تھا۔ ہمت نہیں پڑ سکی اور میں راستے میں ہی رک گیا۔"

"راستے میں۔؟"

"ہاں۔"

"تو کیا آپ کار کے اندر سوئے تھے ڈیڈی۔"؟

"نہیں۔ تقریباً یہاں سے ڈیڑھ کلو میٹر پر پہلے ایک ٹرک اسٹینڈ تھا۔ تم نے دیکھا ہے۔"؟

"ہاں مجھے یاد ہے۔ لیکن اب نہیں ہے۔"

"وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ کچھ مجرمانہ کارروائیاں ہونے لگی تھیں۔"

"تو پھر"؟

"عین اس جگہ سے جہاں ٹرک اسٹینڈ تھا ایک پگڈنڈی جاتی ہے۔ کچی سڑک کا اختتام ایک ڈاک بنگلے پر ہوا ہے۔ اکثر میں نے اسے دیکھا تھا دور سے اس کی سیاہ چمنی نظر آتی ہے۔ بس وہی یاد آ گئی اور میں سیدھا چلا گیا۔ رات اس ڈاک بنگلے میں گزاری تھی۔"

"بھوت ووت تو نہیں تھے وہاں۔"؟

"مجھے تو نہیں ملے۔ لیکن تمہیں ان کا خیال کیوں آیا۔"؟

"بس سنا ہے کہ ڈاک بنگلوں وغیرہ میں بھوت بہت زیادہ ہوتے ہیں۔"

"مجھے تو وہاں بس ایک شریف بھوت ملا تھا۔"

"ملا تھا؟" اس نے چونک کر ربانی صاحب کو دیکھا۔

"ہاں۔ لیکن بڑا شریف بھوت تھا۔ میری خوب خدمت کی اور جب میں نے اسے کچھ دینا چاہا تو اس نے منع کر دیا۔"

"اوہ۔ چوکیدار ہو گا۔" قدسیہ ہنس پڑی۔

"اب جو بھی سمجھ لو۔ انسان کا اپنا ذوق نگاہ ہے۔ جسے جو چاہے بنا دے۔"

یہ تھی وہ گفتگو جو باپ بیٹی کے درمیان ہوئی تھی۔ اور اس وقت کچھ ایسے نشانات نظر آئے تھے جنہوں نے یہ گفتگو اسے یاد دلا دی تھی۔

وہ ٹرک اسٹینڈ یہیں بائیں ہاتھ پر تھا۔ جو اب ختم ہو چکا ہے لیکن جب یہاں ٹرک کھڑے ہوئے تھے تو عارضی طور پر ایک ہوٹل یا چائے خانہ بھی تعمیر ہو چکا تھا جو چٹائی بانسوں پر مشتمل تھا۔ ٹرک اسٹینڈ کے خاتمے کے بعد چائے خانے کے وجود کا کوئی جواز ہی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اسے بھی ختم کر دیا گیا تھا۔ لیکن چائے خانے کے چولہے اور ایک تندور بنانے کے لئے ایک بھٹی بنائی گئی تھی جو اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ اور چائے خانے کے مالک نے اسے توڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی اب بھی اس چائے خانے کی یادگار کے طور پر موجود تھی اور اس وقت اسے دیکھ کر ہی وہ گفتگو اسے یاد آ گئی تھی۔

چائے خانے کے پیچھے کی پگڈنڈی صاف نظر آ رہی تھی اور اس پگڈنڈی پر آگے چل کر وہ گیسٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلہ ان سب کا تذکرہ اس کے ڈیڈی نے کیا تھا۔

تو کیا اس بارش سے پناہ حاصل کرنے کے لئے اس طرف چلا جائے۔ اگلے نشیب تک جانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس نشیب میں پانی دوگنا ہو گا کہ اس کی کار اس سے نہ گزر سکے گی۔

ایک بار پھر اس نے کار اسٹارٹ کی اور آخری فیصلہ کر کے اس کا رخ بدل دیا۔ سڑک سے اترے ہوئے ایک گڑھا پڑ گیا تھا اس نے آہستگی سے کار گڑھے میں اتار دی اور پھر اسے دوسرے گیئر میں آگے بڑھانے لگی پگڈنڈی کا بھی کیا بھروسہ۔

بارش ایک خوبصورت موسم ہے۔ اس موسم میں روح جوان ہوتی ہے لیکن روح کی جوانی برقرار رکھنے کے لئے پر سکون ماحول بھی ضروری ہے۔ اس بھیانک ماحول میں تو بارش میں کوئی حسن نہیں رہ جاتا۔ پگڈنڈی کا سفر بھی کافی خوفناک تھا' کہیں کہیں تو پگڈنڈی اتنی پتلی تھی کہ اس پر سے گاڑی گزارنا مشکل لگتا تھا۔ لیکن ڈرائیونگ کے معاملے میں تو قدسیہ واقعی عمدہ تھی۔ وہ گاڑی کو وہاں سے بھی گزار لے گئی اور اب جبکہ اسے گیسٹ ہاؤس کی بوسیدہ عمارت نظر آئی تو اسے سکون محسوس ہوا۔ اور پھر اب جو کچھ ہو چکا تھا اس پر تو خاک ہی ڈالی جائے تو زیادہ بہتر ہے' فی الوقت دیکھنا یہ ہے کہ اس گیسٹ ہاؤس میں آرام کی گنجائش ہے یا نہیں۔ جوں جوں عمارت قریب آتی جا رہی تھی' قدسیہ کو سکون کا احساس ہوتا جا رہا تھا۔ عمارت کے سامنے کا حصہ بڑا ناہموار تھا۔ بائیں جانب ایک ایسی جگہ

تھی جس میں ڈھلوان تھے۔ کار وہاں نہیں روکی جا سکتی تھی۔ البتہ ایک چھوٹا سا راستہ پشت پر جانے کے لئے تھا۔ کار کھڑی کرنے کے لئے ممکن ہے پشت پر کوئی مناسب جگہ مل جائے' اس نے سوچا اور وہ کار کو پشت کی جانب لیتی چلی گئی۔

ڈاک بنگلے کے عقب میں بلاشبہ ہموار جگہ موجود تھی اور یہاں کار کھڑی کی جا سکتی تھی اس نے جہاں تک ممکن ہو سکا کار کو ڈاک بنگلے کی دیوار سے ملا کر کھڑا کیا تاکہ بارش میں زیادہ سفر نہ کرنا پڑے گو کہ کار میں کافی سامان موجود تھا۔ لباس' ٹیپ ریکارڈر اور دوسری چند چیزیں جو اس نے تقریباً ساتھ لے لی تھیں چائے کا تھرموس بھی تھا جو اس نے ابھی تک استعمال نہیں کیا تھا بس حالات ہی ایسے ہو گئے کہ مہلت ہی نہ ملی۔ سفر مصیبت بن گیا تھا۔ بہرصورت اس نے یہ ساری چیزیں سمیٹیں اور کار لاک کر کے تیزی سے ڈاک بنگلے کے دوسری جانب دوڑی۔ عقب میں کوئی دروازہ نہیں تھا کمبختوں نے اتنا بھی خیال نہیں رکھا۔ اس نے دانت کچکچا کر سوچا اگر کوئی عقب سے آنا چاہے تو کیسے آئے۔ صدر دروازے تک پہنچتے ہی پہنچتے اس کا لباس کافی بھیگ گیا تھا' بہرصورت وہ ڈاک بنگلے کے اندر داخل ہو گئی' سامنے ہی ایک سائبان نظر آ رہا تھا جس پر سیمنٹ شیٹ پڑی ہوئی تھیں' سائبان کے نیچے پہنچ کر اس نے کسی قدر سکون کی سانس لی' یہ ایک چبوترہ تھا اور اس کے بعد بوسیدہ کواڑوں والا دروازہ۔ چبوترے کے نیچے کھڑی وہ گہری گہری سانسیں لیتی رہی' اور جب کسی قدر سکون ہوا تو دروازے کی جانب متوجہ ہوئی۔ وہ چوکیدار اس کے علم میں تھا جسے اس کے ڈیڈی نے بھوت قرار دیا تھا۔

پتہ نہیں کمبخت کہاں ہے۔ بوڑھا خیر خواہ آدمی ہو گا ورنہ وہ سائبان کے نیچے بارش سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا۔ کیا اسے آواز دی جائے۔

"ایک مصیبت سے نکل کر آئی تھی اس لئے اس ویران عمارت کی ویرانی پر توجہ نہیں دی تھی اور باہر کے خوفناک موسم ہی سے خوفزدہ تھی۔ بہرحال چند لمحات سکون کی سانسیں لینے کے بعد اس نے ہاتھوں میں اٹھایا ہوا سامان نیچے رکھ دیا۔ چھوٹے سے بیگ میں سالگرہ میں پہننے والے خوبصورت کپڑے تھے۔ رات کے سونے کے لئے ایک لباس لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ میک اپ کا تھوڑا سا سامان اور زیورات ظاہر ہے وہ سیلی کی

سالگرہ میں یونہی تو نہیں جا سکتی تھی۔

تھوڑی دیر تک تو وہ وہیں کھڑی رہی بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن بیٹھنے سے فائدہ۔؟ اس نے سوچا اور پھر وہ دروازے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اس نے دروازے کو ڈھکیل کر دیکھا۔ اندر سے بند تھا لیکن اسے اطمینان ہوا اندر کوئی موجود ہے۔ ایک لمحے کے لئے اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ کہیں چوکیدار یہاں سے چلا نہ گیا ہو۔ اس طرح تو اس ویران ماحول میں بڑی وحشت ہوتی۔ لیکن بند دروازے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی اندر موجود ہے۔

اس نے دروازے میں لٹکی ہوئی زنجیر بجائی اور دیر تک بجاتی رہی۔ تب کچھ آہٹیں سنائی دیں اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کسی نے دروازہ کھولا اور پھر دروازہ کھولنے والا باہر آ گیا۔

ڈیڈی نے درست ہی تو کہا تھا۔ کمبخت بھوت ہی تو معلوم ہوتا ہے۔ اس نے بوڑھے کی خوفناک شکل دیکھتے ہوئے سوچا۔ پورے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے پپوٹے لٹکے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں بال بھی نظر آ رہے تھے۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے جو روئی کی طرح سفید تھے۔ ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے تھا چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس نے قدسیہ کو دیکھا اور پھر شاید مسکرانے کی کوشش کی۔

"ہاں کیا ہے۔" اس کی آواز میں ایک عجیب سی کھڑکھڑاہٹ تھی۔!

"کیا نظر آ رہا ہے تمہیں بڑے میاں؟۔ قدسیہ نے پوچھا۔

"لڑکی۔" بوڑھے نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"خوب۔ خوب۔ تمہاری نگاہیں تو کافی تیز معلوم ہوتی ہیں۔ چوکیدار ہو یہاں کے۔"

"ہاں بی بی جی۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"تو تم اتنا بھی جانتے ہو گے کہ اگر شدید بارش میں کوئی اس ڈاک بنگلے میں پناہ لینے کے لئے آئے تو اسے دروازہ کھلا ہوا ملنا چاہئے۔"

"اس ڈاک بنگلے میں کون پناہ لینے آتا ہے' بس شاذ و نادر ہی کوئی ادھر کا رخ کرتا ہے

اور کبھی کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ کوئی یہاں آئے گا۔ مگر لوگ آ جاتے ہیں۔ بعض اوقات کئی کئی مہینے اور بعض اوقات سالہا سال گزر جاتے ہیں کوئی نہیں آتا۔ کوئی آتا ہی نہیں۔ کوئی آتا ہی نہیں۔" بوڑھے نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"چچا جان یہ وقت فلسفے کا نہیں ہے۔ میری حالت دیکھ رہے ہیں آپ۔" قدسیہ نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایں۔ ہاں۔ حالت۔ حالت نا۔ دیکھ رہا ہوں۔ کیا چاہتی ہو۔"؟

"ڈاک بنگلے میں آنے کے بعد کیا چاہا جا سکتا ہے۔" قدسیہ نے کسی قدر تیز لہجے میں پوچھا۔

"کیا چاہا جا سکتا ہے۔" بوڑھا پر خیال انداز میں گردن جھکا کر سوچنے لگا' پھر چونک کر بولا۔

"ارے ہاں تمہیں یقیناً رہائش کے لئے جگہ چاہئے ہو گی۔"

"جی ہاں۔ چاہئے تو سہی۔" قدسیہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"تو پھر آؤ' کھڑی کیوں ہو۔" بوڑھے نے کہا۔

"اور میرا سامان کون اٹھائے گا۔"؟

"سامان بھی آ جائے گا۔ سامان کہیں نہیں جاتا۔" بوڑھے نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"بہت بے فکر انسان معلوم ہوتے ہو۔"؟

"فکر۔ کہیں انسان کا دامن کہاں چھوڑتی ہیں۔ کہاں تک ان فکروں کی فکر کرو۔ تم آؤ۔ سامان کا ذمہ دار میں ہوں۔"

"اٹھا ہی لو تو کیا حرج ہے۔" قدسیہ بلبلا کر بولی۔

"ایں۔ اچھا۔ بڑی ضدی لگتی ہو۔ بچی ہو نا۔ بچے ضدی ہوا ہی کرتے ہیں۔" اس نے باہر نکل کر قدسیہ کا مختصر سامان اٹھا لیا۔

"آؤ اب تو مطمئن ہو اندر آ جاؤ۔" وہ بولا اور قدسیہ ایک گہری سانس لے کر اس کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔

ماحول میں کسی قدر گھٹن تھی۔ سیلن کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ قدسیہ کو بڑی ناگواری محسوس ہوئی۔

"حفظان صحت کے اصول جانتے ہو۔"؟ اس نے بوڑھے کے ساتھ چلتے ہوئے کہا

"بہت کچھ جانتا ہوں کیوں۔"؟

"یہ کھڑکیاں اگر کھلی رکھی جائیں تو کیا حرج ہے۔"؟

"بدبو محسوس کر رہی ہو۔"؟

"گھٹن ہے پورے ماحول میں گھٹن ہے۔ اگر تم یہ دروازے اور کھڑکیاں کھلی رکھو تو اتنی سیلن اور بدبو یہاں نہ ہو۔" قدسیہ ناک سکوڑتی ہوئی بولی۔ بوڑھا ہنسنے لگا۔

"میں تمہیں خوشگوار جگہ لے جا رہا ہوں۔ آؤ تمہیں اوپری منزل کا کمرہ دے دوں۔" اس نے کہا اور قدسیہ نے گردن ہلا دی۔

"اس کمرے سے نکلنے کے بعد ایک چھوٹی سی جگہ تھی جس میں ایک دروازہ سیدھا چلا گیا تھا اور ساتھ ہی اوپر جانے کے لئے زینہ بھی تھا۔ بوسیدہ اور گندہ سازینہ جس کی صفائی نہیں کی گئی تھی۔

"تم اس گیسٹ روم کو بہت گندہ رکھتے ہو۔" قدسیہ نے کہا اور بوڑھا پھر عجیب سے انداز میں ہنسنے لگا۔

"تو پھر کیا کروں۔ یہاں آتا ہی کون ہے جس کے لئے صفائی ستھرائی کروں" بس میں ہوں جو وقت گزار رہا ہوں"

"لیکن کوئی نہ کوئی آ ہی جاتا ہے جیسے میں۔" قدسیہ نے کہا۔

"ہاں جیسے تم۔ جیسے وہ۔" بوڑھا گردن ہلا کر بولا۔

"وہ کون۔"؟

"لڑکی باتیں بہت کرتی ہو' پہلے اپنے لئے آرام کی جگہ تو دیکھ لو۔" بوڑھے نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا اور قدسیہ اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ اوپر کا کمرہ کسی قدر ہوا دار اور گھٹن اور سیلن سے پاک تھا' صاف ستھرا ہی تھا' ایک طرف الماری بنی ہوئی تھی جو صاف تھی۔ ایک چارپائی جس پر ایک میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔

"واہ۔ کیا عمدہ رہائش گاہ ہے۔" قدسیہ نے ہنستے ہوئے کہا اور بوڑھا بھی ہنسنے لگا۔

"محلوں سے آئی ہو۔ محلوں کی باتیں محلوں میں کرو۔ یہ ویرانہ ہے۔ یہاں اور کیا ہو گا۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے" بشرطیکہ اہل اقتدار توجہ دیں اور اپنے فرض کو پہچانیں۔" قدسیہ نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"اقتدار مل جانے کے بعد توجہ کون دیتا ہے۔ بوڑھے نے کہا اور قدسیہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اب تک جو اس نے باتیں کی تھیں ان میں کافی ستھراؤ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بوڑھا تعلیم یافتہ ہو۔ یہ احساسات چند لمحات تک اس کے ذہن میں رہے تھے۔ لیکن اسے ان ساری باتوں کا کیا کرنا تھا' نجانے کتنی دیر یہاں گزارنی پڑے بارش تھی کہ اب بھی زور شور سے ہو رہی تھی۔ بوڑھے نے اس کا سامان الماری میں رکھ دیا اور چارپائی کی طرف رخ کر کے بولا۔

"بیٹھو۔! اور قدسیہ اس وقت یہی سب کچھ غنیمت سمجھ کر بیٹھ گئی۔ حالانکہ ابھی وقت زیادہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن تاریکی کافی تھی۔ بہرحال وہ بوڑھے کو بغور دیکھ سکتی تھی۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا اور اس کی چندھیائی ہوئی نگاہیں بھی قدسیہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"کیا نام ہے تمہارا۔"

"چوکیدار۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"یہ نام ہوا۔"

"ہاں۔ لوگوں نے ہمیشہ اسی نام سے پکارا۔ مجھے یہی نام یاد آ گیا ہے کبھی کوئی اور نام بھی تھا لیکن اب بھول چکا ہوں۔"

"خدا کی پناہ۔ آج مقدر میں یہی سب کچھ لکھا ہے تو میں کیا کروں۔ بارش' ناکامی ڈاک بنگلہ اور تم بھی نرے فلسفی توبہ توبہ۔"

"حقیقتوں سے گھبراتی ہو۔ بارش میں تنہا نکل آئیں نڈر ہونا اچھی بات ہے لیکن حقیقتیں کچھ اور بھی ہو سکتی ہیں۔"

"اللہ کے واسطے اللہ کے واسطے اب یہ نصیحتوں کا پٹارہ بند کرو۔ یہ سب کچھ سنتے سنتے تو میرے کان پک گئے ہیں کوئی اور بات کرو۔"

"اوہ۔ غالباً تم بہت پریشان ہو۔ چائے بنا کر لاؤں۔"؟

"خوب۔ کیا یہاں ان چیزوں کا بندوبست بھی ہے۔"

"جو طلب کرو گی مل جائے گا۔ کہہ کر دیکھو۔"

"کمال ہے۔ یہاں تو متضاد کیفیت ہیں یعنی جگہ اتنی گھٹیا لیکن۔ بہر حال چائے میرے پاس ہے۔ بیٹھو تمہیں بھی پلاؤں گی۔ اچانک فلسفی بوڑھا قدسیہ کو پسند آ گیا۔ کم از کم اس کی بکواس سے اس ماحول کی وحشت تو کم ہو گی۔ اگر کوئی سنکی بوڑھا ہوتا تو بوریت کا وہی عالم رہتا۔

"بوڑھا زمین پر ہی بیٹھ گیا۔ قدسیہ نے تھرماس کے ڈھکن میں چائے انڈیلی۔ دوسرا ڈھکن بھی تھا اس نے وہ بھر کر بوڑھے کو دیا۔ لیکن بوڑھے نے گردن ہلا دی۔

"نہیں۔ میں نہیں پیتا۔"

"ارے پی لو۔ پی لو۔ اس موسم میں اس کی ضرورت ہے۔"

"میں عمدہ قسم کی کافی پیتا ہوں۔ چائے مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ اور قدسیہ نے آنکھیں پھاڑ دیں۔ اسے بوڑھے کی بات پر غصہ آ گیا تھا۔ دوسرے لمحے اس نے چائے واپس پلٹ دی اور وہ خود چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔

"تم کافی پیتے ہو۔"

"ہاں۔ پیو گی۔"؟

"جاؤ بنا کر لاؤ۔ بڑے باذوق معلوم ہوتے ہو۔ دیکھوں تو سہی تمہاری کافی۔" وہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔ اور بوڑھا مسکراتا ہوا اٹھ گیا۔ وہ باہر نکل گیا تو قدسیہ نے ارد گرد کے ماحول کو دیکھا۔

سامنے بڑی سی کھڑکی تھی جس کے دوپٹ تو ثابت تھے لیکن ایک پیٹ کے شیشے نکلے ہوئے تھے' کھڑکی بند تھی لیکن اسے کھولنے کی ضرورت اس لئے نہیں تھی کہ اس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

آسمان بدستور یک رنگ تھا اور اس پر دھواں دھواں سا چھایا ہوا تھا۔ خدا کی پناہ یوں لگتا ہے جیسے بارش قیامت تک نہ رکے گی۔ اس نے پریشان انداز میں سوچا۔ پھر اس چارپائی کو دیکھنے لگی جس پر وہ بیٹھی تھی! عام حالات میں اس قسم کی چارپائیوں سے اسے شدید نفرت تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے۔ لیکن کیا کیا جاتا مجبوری تھی۔ اور بعض اوقات انسان مجبوری کے ہاتھوں جانے کیا کچھ کرتا ہے۔ یہ تو پھر بھی بہتر جگہ تھی۔ کم از کم سر پر چھت تو ہے اس نے چھت کے تصور کے ساتھ ہی چھت کو دیکھا۔ پرانے طرز کی عمارت تھی' اور کڑیاں چھت میں نصب تھیں' لیکن خاصی بوسیدہ نظر آ رہی تھی۔

کہیں تیز بارش اس چھت ہی کو نہ لے بیٹھے۔ اس نے خوفزدہ انداز میں سوچا۔ لیکن پھر اپنی حالت پر ہنس پڑی۔ شاید غور و وسوسوں کا شکار ہو رہی تھی۔ کچھ بھی نہیں ہو گا بارش بالآخر بند ہو گی اور وہ یہاں سے چلی جائے گی۔

لیکن اگر بارش رات تک بند نہ ہوئی تو۔؟ اس نے سوچا مجبوری ہے اس پناہ گاہ کو تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ کسی نشیب میں پانی میں ڈوب کر مر جانے سے کیا فائدہ۔ ہاں ایک فیصلہ اس نے ضرور کیا تھا۔ آئندہ ایسی تقریبات میں ذرا احتیاط برتے گی کسی بھی وقت کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔"

بوڑھا بظاہر بے ضرر انسان تھا لیکن اس کی جگہ کسی خطرناک شخص سے بھی ملاقات ہو سکتی تھی۔ اس ویرانے میں وہ کسی کا کیا بگاڑ لیتی بہرحال عورت ہے۔ ایک بار پھر اس کی ذہنی رو بوڑھے کی طرف بھٹک گئی۔

"عجیب سی فطرت کا مالک ہے کافی عمر رسیدہ ہے لیکن نخرے بہت ہیں۔ عمر کے آخری ایام گزار رہا ہو گا۔ نہ جانے اس کی کیا کہانی ہے۔ بہرحال اگر رات یہاں گزارنی پڑی تو بھی بوڑھا بور نہیں ثابت ہو گا۔

کافی پیتے ہیں بڑے میاں چائے نہیں پیتے' اس نے سوچا اور ہنس پڑی۔ ذرا دیکھیں تو سہی کیسی کافی ہے' ویسے آدمی کچھ پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے' اس کی باتوں میں ربطہ تھا اور کوئی بھی بات بے تکی نہیں تھی' ہو سکتا ہے بیچارہ کسی حادثے کا شکار ہو اور کوئی ایسی کہانی اس کی یاد سے وابستہ ہو جو اپنے اندر کوئی ٹریجڈی رکھتی ہو اور ایسی کہانیاں تو جگہ جگہ نظر

آتی ہیں' لاکھوں کہانیاں' لاتعداد کہانیاں' خود اس کی اپنی بھی ایک کہانی تھی۔ خود سری کی کہانی۔ خود سری نجانے کیوں اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی' بس اس کا دل چاہتا تھا کہ ہر بات سے بغاوت کی جائے۔ ہر ایک سے اختلاف کیا جائے۔ یہ اختلاف اس کی فطرت بن چکی تھی اور اس کی یہ فطرت اسے بارہا نقصان بھی پہنچا چکی تھی۔ اب جیسے ہی وقت چند ساعت کے بعد باہر قدموں کی چاپ سنائی دی' اور وہ اپنے خیالات جھٹک کر دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔

بوڑھا ایک ٹرے ہاتھ میں لئے داخل ہوا۔ ٹرے میں کافی کی ایک پیالی رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کافی کا ایک بھبکا قدسیہ نے محسوس کیا اور اس کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں اول تو ٹرے ہی خاصی قیمتی تھی۔ اس کے بعد اس میں رکھی ہوئی کافی کی پیالی جو یقیناً غیر ملکی تھی۔ اس نے کافی کا رنگ دیکھا اور پھر دلچسپ انداز میں بوڑھے کی شکل دیکھنے لگی۔

"واہ کافی تو واقعی عمدہ معلوم ہوتی ہے۔" اس نے کہا اور بوڑھا ہنسنے لگا۔

"بے بی بعض اوقات ہم کسی انسان کے بارے میں اندازہ لگانے میں سخت غلطی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں چاہئے کہ پہلے سامنے والے کی شخصیت کو جانچیں۔ اس کے بعد اس بارے میں فیصلہ کریں۔ مضحکہ اڑانا اچھی بات نہیں ہے کیونکہ دوسرے اسے اچھا نہیں سمجھتے۔"

"نہیں نہیں چوکیدار میں تمہارا مضحکہ تو نہیں اڑا رہی۔"

قدسیہ جلدی سے بولی۔

"تمہارا انداز ایسا ہی تھا بے بی لیکن میں نے برا محسوس نہیں کیا اگر تم اس بات سے خوش ہوتی ہو اور مضحکہ اڑا لو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کافی پیو۔"

"تمہاری پیالی کہاں ہے۔"؟

"میں نے وہیں باورچی خانے میں پی لی۔ دراصل میں بہت گرم کافی پینے کا عادی ہوں۔"

قدسیہ کافی دیکھ کر خاصی مرعوب ہو گئی تھی' اس نے کافی کی پیالی اٹھائی اور اس کا ہلکا

سا سپ لیا۔ اس کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ اتنی لذیذ کافی اس نے کبھی نہیں پی تھی۔

"واہ چوکیدار تمہارا ٹیسٹ تو واقعی لاجواب ہے۔"

"تھا کو' اب تو صرف تصور رہ گیا ہے۔" بوڑھے نے کہا۔

"بڑے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کافی عمر ہو گی تمہاری چوکیدار لیکن اب بھی زندگی کی دلچسپیوں سے بھرپور نظر آتے ہو جیسے یہ کافی۔" قدسیہ نے کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"کافی۔ عمر کے لئے تو ہر شے ناکافی ہوتی ہے۔ اس کافی کی کیا بات کرتی ہو۔" بوڑھے نے کہا۔

"یہ برتن بھی بہت شفاف ہیں۔ حالانکہ ڈاک بنگلہ دیکھ کر کافی کوفت ہوئی تھی۔ لیکن اب یہ کوفت دور ہوتی جا رہی ہے۔"

"شکریہ کی طالب ہوئی۔ کیوں۔"؟

"نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے مجھے تم سے ایک شکوہ ہے۔"

"کیا۔"؟

"تم نے اپنا نام کیوں نہیں بتایا۔"؟

"چوکیدار ہوں۔ اور اب اس نام کے سوا کوئی نام یاد نہیں رہ گیا۔"

"شاید خود کو چھپانا چاہتے ہو۔"

"سب یہی کرتے ہیں۔ تم تو میرے لئے اجنبی ہو۔ لوگ اپنوں سے خود کو چھپاتے ہیں۔ صحیح کیفیات کا اظہار دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔"

"تعلیم یافتہ ہو۔"؟ قدسیہ نے پوچھا۔

"تجربے یافتہ ہوں اور بس۔"

"خوب آدمی ہو۔ لیکن تم اس عمر میں خود کو چھپا کر کیا کرو گے۔"

"چھپانے کی عمر تو یہی ہوتی ہے۔ نوجوانی کی عمر تو سب پر آشکار ہوتی ہے۔"

"خاصے تعلیم یافتہ ہو۔ یقین کرو میرے دل میں تمہارے بارے میں جاننے کا بڑا

اشتیاق ہے۔ انوکھی فطرت کے مالک ہو۔"

"انسانی فطرت ہے یہ بھی۔ کوئی کہانی سننے کی خواہشمند ہوں۔ لیکن کہانیاں اتنی سستی نہیں ہوتیں۔" اپنی ذات کا ہمراز بنانے کے لئے بڑے جتن کرنے ہوتے ہیں۔ تم کہانی کو سن کر کیا کرو گی جسے بارش بند ہونے کے بعد یہاں سے جا کر بھول جاؤ۔ اور باتیں کرو وقت گزاری کے دوسرے سامان بھی ہوتے ہیں۔"

"خدا کی پناہ۔ تمہاری منطق نے تو میرا دماغ خراب کر دیا میں تو سوچ رہی تھی کہ تم سے باتیں کر کے وقت اچھا گزرے گا۔"

"ہر انسان اچھا وقت گزارنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ دوسروں کے دل کی داستان اس کے لئے وقت گزاری سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن داستانیں اتنی سستی نہیں ہوتیں کہ انہیں یوں ضائع کیا جائے۔"

"اچھا بابا ختم کرو۔ تمہاری مرضی۔"

"میں جاؤں۔"

"ہاں ہاں جاؤ۔ خاموش بیٹھنے سے کیا فائدہ لیکن بارش یہ کمبخت بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔"

"اسے روکنا میرے اختیار میں نہیں ہے اس لئے تم اس کا غصہ مجھ پر نہ اتارو۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"مگر بارش نہ رکی تو رات کو یہاں ٹھہرو گی۔"؟

"ہاں مجبوری ہے۔"

"تب پھر تمہارے لئے بھی رات کے کھانے کا بندوبست کرنا ہو گا۔" بوڑھے نے کہا۔

"اوہو یہ تکلیف کس طرح کرو گے' کیا تمہارے پاس کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں۔" قدسیہ نے سوال کیا۔

"میں نے کہا نا' کیا کیا نہیں ہے یہاں اور پھر تین دن سے تو بزی کے لئے بھی کھانا پکا رہا ہوں۔" بوڑھے نے کہا۔

"کس کے لئے۔" قدسیہ چونک پڑی۔

"بزی کے لئے۔"

"یہ کیا چیز ہوتی ہے۔" قدسیہ نے تعجب سے پوچھا اور بوڑھا اس کی جانب گہری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"نہیں بیٹے کسی کا مذاق نہیں اڑاتے۔ وہ بھی ایک انوکھا انسان ہے۔"

"انوکھا۔ بڑا ہی عجیب شعر کہتا ہے' تصویریں بناتا ہے اور نجانے کہاں کہاں بھٹکتا رہتا ہے۔ آج اسے تین دن ہو گئے اس ڈاک بنگلے میں آئے ہوئے' یوں لگتا ہے جیسے یہیں مستقل رہائش اختیار کرنا چاہتا ہو۔"

"تت۔ تو۔ یہاں میرے علاوہ کوئی اور بھی موجود رہے گا؟"

"میں نے کہا نا کبھی آتے ہیں تو کئی کئی مہمان آ جاتے ہیں نہیں آتے تو برسوں نہیں آتے۔"

"مگر یہ بزی۔ بزی" قدسیہ کو اب کسی قدر وحشت کا احساس ہوا۔ یہاں اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔ یہ بات ذرا پریشان کن تھی' بوڑھے کی تو خیر کوئی بات نہیں تھی اس کے بارے میں تو قدسیہ نے اندازہ لگایا تھا کہ صرف ایک بکواس آدمی ہے۔ لیکن یہ بزی کون ہے' اس نے سوچا اور سوالیہ نگاہوں سے بوڑھے کی جانب دیکھنے لگی۔

"ہاں تین روز پہلے آیا تھا۔ مصور ہے۔ اس کا مختصر سامان اس کے کمرے میں پڑا ہوا ہے۔"

"مگر وہ کہاں مقیم ہے۔" قدسیہ نے پوچھا۔

"اسے مقیم رہنے کی پرواہ ہی کہاں ہے' نجانے اس ڈاک بنگلے میں ہی کیوں چلا آیا ہے۔ وہ تو کسی پہاڑی مقام پر بھی رہ سکتا ہے۔ تین دن قبل یہاں آیا تھا۔ خشک فطرت اور لاابالی سا انسان ہے' نجانے اپنی فطرت میں کیا ہے۔ ویسے بہت اچھا مصور ہے۔" بوڑھے نے کہا۔

"تو کیا وہ اس وقت بھی یہاں موجود ہے۔"

"نہیں بارش آنے سے پہلے پہاڑوں کی جانب نکل گیا تھا۔ نجانے کہاں بھیگ رہا ہو

گا ابھی تک تو واپس نہیں آیا۔"

"اوہو۔ تو کیا وہ بھی اوپری منزل میں ہے۔"

"نہیں، نچلی منزل کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ اس نے اوپری منزل میں شاید کبھی قدم نہیں رکھا۔"

"تعجب ہے یہاں سب ایک جیسے ہی ہیں۔ لیکن بابا اگر یہ بات ہے تو آپ کو ایک تکلیف کرنا ہو گی۔"

"کیا۔"؟ بوڑھے نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے آپ رات کو یہیں سو جائیں تو کیا حرج ہے۔"

"اوہ ڈر رہی ہو۔ اطمینان ہی رکھو بڑا ہی بے ضرر آدمی ہے، معصوم فطرت کبھی کبھی ہلکے ہلکے مذاق پر اتر آتا ہے، مجھ سے تو بڑا ہی بے تکلف ہو گیا ہے۔ ویسے وہ لڑکا مجھے پسند ہے"

"بابا تمہیں پسند ہے۔ مجھے تو نہیں ہے۔"

"ارے واہ دیکھا بھی نہیں اور ناپسند کر دیا، بہر صورت تم بے فکر رہو اور اس ڈاک بنگلے میں تمہاری حفاظت میرے سپرد ہے، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بارش بند ہو جائے تو یہاں سے چلی جانا۔" بوڑھے نے کہا اور قدسیہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ بوڑھا آہستہ آہستہ باہر نکل گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ کس قدر پریشانیاں آج میری تقدیر میں لکھی گئیں اگر ان کا کہا مان لیتی تو دلاور پور پہنچ چکی ہوتی۔ کمبخت میری فکر مند ہوں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میری تلاش میں نکل پڑیں لیکن اتنی شدید بارش میں نکلنا بھی قیامت ہے، اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر بزمی کے بارے میں سوچنے لگی۔

"بزمی۔ نام تو شاعرانہ ہے مصور ہے۔ لیکن اس ڈاک بنگلے میں کیوں آ پڑا ہے۔ ہو گا کوئی سر پھرا مجھے کیا۔ لیکن ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ نہ جانے کس قسم کا انسان ہے۔ مگر اس بارش میں کہاں جا مرا کیا تصویریں بنا رہا ہو گا۔" وہ ہنس پڑی۔

پھر کسی خیال کے تحت اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی دروازے کو اندر سے بند کر

کے دیکھا۔ دروازہ بند ہو جاتا تھا اس نے سکون کی سانس لی۔ لیکن دوسرے لمحے کھڑکی کی طرف نگاہ اٹھ گئی۔!

"آہ۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔ لیکن اس کا جائے وقوع وہ جلدی سے کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ جھانک کر دیکھا تو اس طرف سے کسی قدر اطمینان ہو گیا۔ نیچے سپاٹ دیوار تھی اور کھڑکی کے راستے کسی کے اندر آنے کا امکان نہیں تھا۔ پھر وہ کھڑکی کے قریب کھڑی بارش کو دیکھتی رہی۔

یہ بارش نہیں رکے گی۔ کوئی امکان نہیں ہے۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اور اسی وقت اس کی نگاہ ڈاک بنگلے کے پھاٹک کی طرف اٹھ گئی۔ بغل میں اسٹینڈ اور کینوس دبائے بارش میں شرابور ایک نوجوان اندر داخل ہو رہا تھا۔ بھیگے ہوئے چوہے کی مانند دبلا پتلا لیکن خوش شکل۔

تو یہ بزمی ہے۔ مگر بارش نے اسے چوہا بنا دیا ہے۔ حالت سے پتہ چلتا ہے کہ رات کو نمونیہ ضرور ہو جائے گا۔ نوجوان کو دیکھنے کے بعد اسے سکون ہو گیا۔ یہ بھی خطرناک نہیں ہو سکتا۔

نوجوان نگاہوں سے غائب ہو گیا تھا۔ وہ دیر تک کھڑی رہی۔ بارش کے بارے میں تو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اسے رات کو اس ڈاک بنگلے کا مہمان ضرور بنائے گی۔ اگر رک بھی جائے تو بھی بے سود ہے۔ اب اس اندھیرے میں سفر کرنا تو دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے۔"

تب اچانک اس کے ذہن میں شرارت ابھر آئی۔ ڈاک بنگلے کا ماحول اور بزمی کیوں نہ تھوڑی سی تفریح کی جائے۔ آہ کاش بوڑھا اس نوجوان کو اس کے بارے میں نہ بتائے لطف آئے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھا اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں جلی ہوئی لالٹین تھی۔ "

اندھیرا ہو گیا ہے۔ یہ رکھ لو۔"

"دوسری موجود ہے۔"؟

"ہاں۔"

"تم کیا کر رہے ہو چوکیدار بابا۔"

"کھانا پکا رہا ہوں۔"

"کیا بزمی صاحب آ گئے۔"؟

"ہاں۔ نہ جانے کہاں سے بھٹکتا ہوا آیا ہے۔"

"تم نے انہیں میرے بارے میں بتا دیا۔"

"پوچھا ہی نہیں۔"

"نہیں بتایا تم نے" وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

"کیا تم اس سے ملنا چاہتی ہو۔ بتا دوں اسے۔" بوڑھے نے پوچھا۔

"ارے نہیں بابا۔ تمہیں میری قسم۔ بالکل مت بتانا۔ لطف آئے گا۔" قدسیہ مسکرا کر بولی۔

"کیسا لطف آئے گا"؟ بوڑھے نے پوچھا۔

"اوہ بابا۔ دیکھو رات تو گزارنی ہی ہے۔ تھوڑا سا لطف ہی لیں گے۔ بس تم اسے کچھ بھی مت بتانا۔ وعدہ کرو بتاؤ گے تو نہیں۔"؟

"ٹھیک ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے۔ لیکن کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔" بوڑھے نے کہا۔

"تم بے فکر رہو چوکیدار بابا۔ اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بس تھوڑی سی تفریح۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

"لیکن تم کسی معاملے میں دخل بھی مت دینا۔ بلکہ غائب ہی ہو جانا۔ میرا مطلب ہے کسی آواز پر آنا نہیں۔" قدسیہ نے کسی تصور سے مسکراتے ہوئے کہا اور بوڑھے نے سادگی سے گردن ہلا دی۔ قدسیہ دل ہی دل میں مسکراتی رہی تھی۔

رات ہو گئی اور بوڑھے نے خاموشی سے ایک ٹرے میں کھانا لا کر رکھ دیا۔ کھانا دیکھ کر بھی قدسیہ حیران رہ گئی تھی۔ اتنا عمدہ اور تازہ کھانا تھا کہ وہ بے اختیار داد دے اٹھی۔ " بابا۔ تم تو حیرت انگیز ثابت ہو رہے ہو۔ ڈاک بنگلہ جتنا گندہ ہے تم نے اس کی کسر دوسرے انداز میں پوری کر دی ہے۔ اتنا عمدہ کھانا ہر چیز تازہ ہے۔ کمال ہے۔"

بوڑھا مسکراتا رہا۔ پھر وہ برتن وغیرہ سمیٹ کر چلا گیا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے بزمی کو بھی کھانا دے دیا ہے اور وہ کھانے کے بعد آرام کرنے لیٹ گیا ہے۔ جاتے وقت اس نے پوچھا تھا کہ اب اس کی ضرورت تو نہیں ہے اور قدسیہ نے اس کا شکریہ ادا کر کے کہا تھا کہ اب وہ آرام کرے اور اپنے وعدے کو یاد رکھے۔

بزمی سے مذاق کرنے کے لئے قدسیہ نے بہترین ترکیب سوچ لی تھی۔ چنانچہ وہ انتظار کرنے لگی اس نے ضروری تیاریاں کر لی تھیں۔ رات کے تقریباً پونے دس بجے وہ اٹھ گئی۔ ٹیپ ریکارڈر کو اس نے کھڑکی کے دوسری طرف مضبوطی سے لٹکا دیا۔ اپنا سامان وغیرہ چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ اور پھر وہ سالگرہ کا لباس پہننے لگی۔

یہ سرخ رنگ کا حسین لباس اس نے خاص طور سے سالگرہ کے لئے تیار کرایا تھا جس میں وہ دلہن نظر آئے۔ دوسری لڑکیوں نے بھی ویسے ہی لباس بنائے تھے۔ بہرحال اس نے لباس پہن کر خوبصورت میک اپ کیا اور پھر زیورات کو بھی دلہنوں کے سے انداز میں پہن لیا۔ ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ اپنی شرارت پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اور پھر اس نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

یہ ٹیپ بھی اس نے خود ہی تیار کیا تھا۔ پہلے اس میں تیز تیز کراہنے کی آوازیں بھری گئی تھیں۔ پھر چیخیں پھر ہنسی اور اس کے بعد۔ اس کی اپنی آواز میں ایک گیت۔ ایک انوکھا گیت۔

اور پھر ٹیپ سے کراہنے کی تیز آوازیں ابھریں۔ اور قدسیہ جلدی سے کمرے سے نکل کر ایک جگہ چھپ گئی۔ اس کے بعد چیخ کی آواز مسلسل چیخیں جو بہت ہولناک تھیں اور اسکے بعد قہقہہ۔ ہذیانی قہقہہ۔

رد عمل حسب توقع ہوا تھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور اس نے بزمی کے ہیولے کو دیکھا۔ وہ دوڑتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ پھر گانے کی آواز ابھری اور بزمی ٹھٹک گیا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کمرے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ بڑا ہی وحشت زدہ تھا۔ قدسیہ کو صرف ایک خطرہ تھا کہ کہیں بوڑھا ان آوازوں کو سن کر دوڑا چلا آئے سارا کھیل بگڑ جائے

گا۔ حالانکہ اس نے بوڑھے کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔

گیت جاری رہا۔ بزی سخت پریشان تھا۔ کبھی وہ ایک طرف جاتا تو کبھی دوسری طرف۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور اسی وقت گانے کی آواز بند ہو گئی۔

وہ مارا۔ قدسیہ نے مسرت سے کہا۔ بڑے اچھے موقع پر کیسٹ ختم ہوا ہے۔ اب وہ اس کے بارے میں بھی اندازہ نہیں لگا سکے گا۔ بزی دیر تک اندر رہا اور پھر باہر نکل آیا۔ اب وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر شاید وہ پریشان ہو کر بوڑھے کو اطلاع دینے کے لئے باہر نکل گیا۔

کاش سمجھدار بوڑھا میرے اس کھیل کو خراب نہ کر دے۔ قدسیہ نے حسرت سے سوچا۔ ابھی تک تو بوڑھے نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ اور اس کا یہ دلچسپ کھیل آسانی سے جاری تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

پھر اس نے لالٹین بجھا دی اور خود پلنگ پر دلہنوں کے سے انداز میں جا بیٹھی۔ بلاشبہ اس نے چالاکی سے انتہائی پر اسرار ماحول پیدا کر دیا تھا!

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر قدموں کی آواز سنی اور یہ اندازہ لگا لیا کہ آواز ایک ہی انسان کے قدموں کی ہے۔ آہ۔ شاید بوڑھے چوکیدار نے اس کی ہدایات پر عمل کیا ہے۔ کوئی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

اور پھر اس نے ایک آواز سنی۔ یہ بوڑھا چوکیدار بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اس سے قبل تو۔! آہ۔ لیکن یہ لالٹین وہ لالٹین کی طرف بڑھا پھر لائیٹر نکال کر لالٹین روشن کر دی۔

دفعتاً قدسیہ کے حلق سے سسکیاں نکلنے لگیں۔ گھونگھٹ سے وہ بزی کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ سسکیوں کی آواز پر بزی بری طرح اچھل پڑا تھا۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور ساکت رہ گیا۔

قدسیہ کا خیال تھا کہ اب وہ چیختا ہوا وہاں سے نکل بھاگے گا۔ لیکن بزی میں تو شاید بھاگنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہیں ہارٹ فیل ہی نہ ہو جائے کمبخت کا۔ قدسیہ نے سوچا اور ہنس پڑی۔

اس کی یہ ہنسی بھی بڑی پر اسرار تھی۔ بزی کے بدن کو اب بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ وہ ساکت و جامد کھڑا رہا۔ پھر چند ساعت کے بعد قدسیہ کو اس کے اندر زندگی کا احساس ہوا۔ وہ آہستہ قدموں سے اس کی جانب آ رہا تھا۔ دبلا پتلا ہے مگر ہے نڈر انسان اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

بزی اس سے چند قدم کے فاصلے پر آ کھڑا ہوا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا اور پھر اس کی آواز ابھری۔ "تم کون ہو۔"؟

جواب میں قدسیہ پھر سسکنے لگی۔ اور دیر تک اس کی سسکیاں گونجتی رہیں۔ بزی خاموش کھڑا رہا تھا۔ "مجھے جواب دو۔ تم کون ہو۔ اس دنیا میں ہر روح سسکتی آئی ہے اور سسکتی چلی جاتی ہے۔ نہ جانے تقدیریں بنانے والے نے انسان کی تقدیر میں یہ سسکیاں کیوں لکھ دی ہیں۔ یا پھر خوشیوں کا نام ہی نہ ہوتا۔ کون خوش ہے۔ کس کی روح پر بوجھ نہیں ہے۔ کیا انسان اس بوجھ کو اٹھانے کے قابل تھے۔؟

اس کی خاموشی سوالیہ تھی۔ قدسیہ نے دل ہی دل میں اس کے نڈر ہونے کا اعتراف کیا۔ بزی کی آواز بے حد خوبصورت تھی خالصتاً مردانہ آواز جو اس کے جثے سے ہم آہنگ نہیں تھی۔

"میں تمہارے بارے میں جاننے کا خواہش مند ہوں اس دنیا میں سب کمزور ہیں کوئی ایک دوسرے کا دکھ بانٹ نہیں سکتا۔ لیکن سنا ہے دل کی بھڑاس نکال دینے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ میں تمہارے بارے میں جاننے کا خواہش مند ہوں۔"

قدسیہ کی سسکیاں رک گئیں۔ وہ اس طرح خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ چنانچہ وہ بولی۔

"میرے بارے میں جان کر کیا کرو گے۔"؟

"کوئی کسی کے بارے میں جان کر کچھ نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود انسان کے دل میں ایک دوسرے کو جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔"

"میں ایک مظلوم روح ہوں۔ ایک بھٹکتی روح جو سکون کی متلاشی ہے۔" قدسیہ بولی۔

"آہ کتنے خوش نصیب ہیں وہ جو قبر کی خاموشیاں اپنا لیتے ہیں۔ وہ جو پیا سے نہیں ہوتے لوگ اتنے پر سکون کس طرح ہو جاتے ہیں۔"

"خدا جانے۔" قدسیہ بولی۔

"ہم سب خلاؤں میں بھٹک رہے ہیں۔ کچھ پوشیدہ ہیں کچھ ظاہر۔ وہ جو نظر نہیں آتے ممکن ہے خود کو چھپاتے ہوں۔"

"ممکن ہے۔" قدسیہ اس کی بکواس کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اسے غصہ آ رہا تھا کہ روح کا ذکر سننے کے بعد بھی اس کی آواز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور وہ اسی طرح پر سکون نظر آ رہا تھا۔

"میں تمہارے بارے میں جاننے کا خواہش مند ہوں۔"

"کیا کرو گے۔"؟

"کچھ بھی نہیں۔ لیکن چند ساعت قبل یہ کمرہ خالی تھا۔"

"میں تو ہمیشہ سے یہاں ہوں۔"

"میں نہیں دیکھ سکا تھا۔"

"دیکھ بھی کس طرح سکتے تھے۔ میں اپنی ذلت کو دوسروں کے سامنے عریاں نہیں کرنا چاہتی۔"

"ظرف زندگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ موت کے بعد ہم سب سے بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں کھل جانا چاہئے۔"

"تم میرے بارے میں جاننے کے لئے کیوں بضد ہو۔"؟

"بضد نہیں ہوں۔ تم اگر نہ بتانا چاہو اور میری موجودگی کو تم ناپسند کرو تو میں خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"نہیں۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ مجھے کسی ایسے وجود کی تلاش ہے جو میری تشنہ لبی کو مٹا دے۔"

"کاش میری ناکارہ ذات تمہارے کام آ سکتی۔ کاش میں کبھی کسی کی مدد کر سکتا۔"

بزمی کی آواز بے حد افسردہ تھی۔

"میں نے پہاڑوں کے دامن میں جنم لیا۔ میں نے ایک ایسی بستی میں آنکھ کھولی جو سکون کی بستی تھی۔ اس بستی میں میری ماں میرا باپ اور میرے بہن بھائی رہتے تھے۔ ہم بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن پھر۔ پھر قدسیہ لمبی سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔

"خاموش کیوں ہو گئیں۔"؟

"میں کسی غیر کو اپنی کہانی کیوں سناؤں۔"

"اپنوں کے مل جانے کی امید ہے۔"؟ بزمی نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس دنیا میں کون اپنا ہے۔ زندگی میں سب چھوٹ گئے تو موت کے بعد کسے اپنا کہہ سکتی ہوں۔"

"تو پھر اپنوں اور غیروں کا تعین کیوں کرتی ہو۔"؟

"تم میری کہانی سنے بغیر نہیں رہ سکتے۔"؟

"تمہیں بھی تاریکیاں گزارنی ہیں۔ یوں خاموش بیٹھ کر کیا کرو گی۔ کہو اپنے بارے میں کہو۔ بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"!

"تارا ایک نوخیز لڑکی جس نے زندگی کے سولہ سال والدین کے سائے میں گزارے لیکن سائے صرف سائے ہوتے ہیں اور جس نے سایوں سے پیار کیا۔ ہمیشہ دکھی رہا۔ سائے اپنے کیوں نہیں ہوتے۔"؟

"سائے کبھی اپنے نہیں ہوتے" بزمی بولا۔

"قدسیہ کا ذہن تیزی سے ایک کہانی مرتب کر رہا تھا ایسی کہانیاں اس نے پڑھی تھیں اور اس کا حافظہ بے حد عمدہ تھا۔

"پھر تارا ٹوٹ گیا۔ بستی میں وبا پھیلی۔ اور۔ اور لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگے۔ تارا کے دو بھائی مر گئے۔ ماں ان کے غم میں پاگل ہو کر پہاڑوں میں چیخنے لگی۔ باپ کی کمر ٹوٹ گئی۔ وہ بستر پر لگ گیا اور موت نے اسے بھی سکون دے دیا۔ صرف تارا رہ گئی۔ حالات کے رحم و کرم پر تھی۔ لوگ بستی سے بھاگنے لگے تب بستی کا ایک اوباش نوجوان تارا کے پاس پہنچ گیا۔ رمضو پہلے بھی تارا پر بری نگاہ رکھتا تھا۔ ایک بار تارا کے بھائیوں نے اس کی

کافی پٹائی کی تھی۔ اس وقت سے وہ تارا کے لئے دل میں شدید بغض رکھتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی آواز میں ہمدردی تھی۔

"تارا۔ اس وقت بستی کے ہر شخص کا دکھ مشترک ہے مجھے دلی رنج ہے کہ تم بے سہارا رہ گئی۔"

"ہاں رمضو۔ میں بے سہارا ضرور ہوں۔ لیکن میں آج بھی تجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔"

"نہیں تارا تو غلط سمجھ رہی ہے۔ رمضو تیری بے بسی سے کوئی فائدہ اٹھانے نہیں آیا۔"

"پھر کیوں آیا ہے۔"؟

"بستی خالی ہو رہی ہے۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ میں بھی بستی چھوڑ رہا تھا کہ تیرا خیال آگیا۔"

"تو پھر۔"؟

"تو لڑکی ہے تارا۔ اور زمانہ بہت نازک ہے۔ لوگ کسی کی بے بسی نہیں دیکھتے۔ بس یہ دیکھتے ہیں کہ کس سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔"

"تو میں کیا کروں۔"؟

"میں چاہتا ہوں تارا کہ تجھے بھی تیرے رشتہ داروں کے پاس پہنچا دوں۔ دیکھ تارا میری دشمنی تیرے باپ اور بھائی کے مرنے کے بعد ختم ہو گئی ہے۔ اب مجھے تجھ سے کوئی گلا نہیں ہے۔ میں تو بستی کے ناطے تیری مدد کرنا چاہتا تھا۔

اور۔ اور تارا نرم پڑ گئی۔ رمضو کی آواز سے دھوکا کھا گئی۔

"مگر۔ میرا تو کوئی ناطے والا نہیں ہے۔ میں کہاں جاؤں گی۔"

"بستی تو چھوڑنی ہی پڑے گی تارا۔ پوری بستی خالی ہو رہی ہے۔ تو یہاں اکیلی موت کا انتظار کرے گی۔"؟

"نہیں نہیں۔ میں۔ مرنا نہیں چاہتی۔"

"تو آ۔ میرے ساتھ چل۔ میں لاکھ برا ہوں پر پر تجھے تنگ نہیں کروں گا۔ وعدہ کرتا

ہوں۔" رمضو نے کہا اور تارا دھوکے میں آ گئی۔ موت کے خوف نے اسے رمضو جیسے بدکار انسان کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ بستی چھوڑ کر رمضو کے ساتھ چل پڑی رمضو نے ایک شہر کا رخ کیا تھا۔ تارا کے پاس اس کے ماں باپ کی جمع کی ہوئی کچھ پونجی تھی کچھ زیور تھے اس نے وہ ساری چیزیں ساتھ لے لیں۔ اور رمضو کے ساتھ شہر آ گئی۔

رمضو خود قلاش تھا لیکن راستے میں اس نے تارا کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا کہ تارا کا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب روئے زمین پر رمضو کے علاوہ اس کا اور کوئی بھی سہارا نہیں ہے۔ رمضو ایک مسافر خانے میں ٹھہرا تھا۔ اس نے تارا سے کچھ نہیں مانگا اور بولا۔

"میں بہت جلد محنت مزدوری تلاش کر لوں گا تارا اور پھر یہاں کوئی چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لوں گا۔ تو فکر مت کرنا۔"

"رمضو پہلے تو گھر کرائے پر لے لے۔ مجھے یہاں بہت ڈر لگتا ہے۔"

"مگر اس کے لئے پیسے چاہئے ہوتے ہیں پگلی پہلے میں کوئی کام تو تلاش کر لوں۔"

"پیسے میرے پاس ہیں رمضو۔"

"نہیں۔ میں تیرے پیسے نہیں لوں گا۔"

"نہیں رمضو۔ تیرے سوا اب اس دنیا میں میرا کون ہے۔ میرے پیسے اس کام نہ آئے تو میں ان کا کیا کروں گی۔"

"مگر میں چاہتا ہوں تارا کہ کوئی کام کر لوں اور پھر کوئی نیک لڑکا دیکھ کر تیرے ہاتھ پیلے کر دوں۔ میں تیرا بوجھ کب تک اٹھاؤں گا۔"!

"رمضو" تارا چونک پڑی۔ اور رمضو شیطان سے فرشتہ بن گیا اس کے لئے اس نے ضد کر کے رمضو کو مجبور کر دیا اور رمضو نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ وہ واقعی بدل گیا تھا تارا کو اس سے جو خوف تھا وہ آہستہ آہستہ دور ہو گیا۔ وہ سکون سے رمضو کے ساتھ رہ رہی تھی۔ رمضو روزانہ کام کی تلاش میں نکل جاتا اور شام کو نشے میں ڈوبا ہوا واپس آ جاتا۔ اپنی ناکامیوں کو وہ کچی شراب میں ڈبو دیتا تھا۔ لیکن نشے میں ہونے کے باوجود اس نے کبھی تارا کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔

"مجھے نوکری ضرور مل جائے گی تارا اور اس کے بعد میں پہلا کام یہ کروں گا کہ تجھے دلہن بنا دوں۔ اور اس امید پر تارا کے زیورات اور اس کی ساری جمع پونجی ختم ہو گئی۔

فاقوں پر نوبت پہنچ گئی لیکن رمضو کو نوکری نہیں ملی ہاں شراب اسے نہ جانے کب کہاں سے مل جاتی تھی۔ پھر ایک شام جب وہ واپس آیا تو شراب کے نشے میں نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی لہرا رہی تھی۔

"نوکری مل گئی ہے تارا۔" اس نے کہا اور تارا بھی خوش ہو گئی۔ بہت اچھی نوکری مل گئی ہے اور اب تیری شادی بھی ہو جائے گی۔" اس کی آواز کا تاثر تارا نہیں سمجھ سکی تھی۔

رمضو شراب اب بھی پیتا تھا لیکن اس نے گھر میں بہت کچھ لانا شروع کر دیا تھا۔ پھر ایک شام وہ بہت مسرور نظر آیا۔ "تارا میں نے تیری بات پکی کر دی ہے۔ بس چند روز کی بات ہے۔"

اور معصوم تارا شرما گئی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ حالانکہ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے جسے اس کی تقدیر کا مالک بنایا جا رہا ہے۔ کیسا ہے کیا کرتا ہے کہاں رہتا ہے۔"

لیکن وہ یہ سارے سوالات نہیں کر سکی زبان بھی نہ کھل سکی تھی۔ پھر شادی کا جوڑا آ گیا۔ زیورات آ گئے اور تارا کو حکم دیا گیا کہ وہ دلہن بن جائے۔ معصوم تارا اپنے ہاتھوں دلہن بن گئی۔ اس نے زیور پہن لئے مگر نہ بارات آئی نہ لوگ جمع ہوئے نہ دعوتیں ہوئیں۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہاں رات کو تارا کا دولہا اندر آ گیا۔

یہ کیسی شادی ہے۔ شادی تو ایسے نہیں ہوتی۔ اس کا تو نکاح بھی نہیں ہوا۔ قاضی بھی نہیں آیا تھا پھر۔ پھر شادی کیسے ہو گئی۔ یہ کیسی شادی ہے۔ اس نے اس بے نکاح دولہا کی شکل دیکھی۔

موٹا تازہ سیاہ فام۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ بڑی سی توند دولہا ایسے ہوتے ہیں۔ اس نے خوف کی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کے دانت نکلے پڑ رہے تھے۔

"اللہ قسم۔ بہت خوبصورت ہو۔ بہت خوبصورت۔"

"تم۔ تم کون ہو؟۔" تارا نے پوچھا۔

"میرا نام۔ بو خان ہے جی۔ سیٹھ بو خان۔"

"لیکن۔ میرا تو تم سے نکاح بھی نہیں ہوا؟۔"

"نکاح۔ بو خان ہنس پڑا۔ "کیا نکاح بھی ہوتا ہے۔"

"تم۔ تم میرے شوہر نہیں ہو۔" تارا چیخ پڑی۔

ارے ارے شور کیوں مچا رہی ہو۔ آج کی رات تو ہم ہی تمہارے شوہر ہیں۔ پورے دس ہزار خرچ کئے ہم نے ابھی تو ہم تین دن تک تمہارے شوہر رہیں گے۔ پورے تین دن کی بات ہوئی ہے رمضو سے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ۔ ورنہ۔"

"ابے رمضو۔ او رمضو الو کے پٹھے۔ یہ بھوتنی والی کیا بک رہی ہے۔" بو سیٹھ گھبرا کر چیخا۔ اور شراب کے اندر ڈوبا ہوا رمضو اندر آ گیا۔

"کیا بک رہی ہے ری۔ سیٹھ صاحب کو خوش کر۔" وہ دھاڑا۔

"رمضو۔ رمضو تم تو کہتے تھے۔" تارا بوکھلا کر بولی۔

"یہی سب کہتا تھا تارا۔ آج سے تو ہر روز دلہن بنے گی سمجھی۔ ہر روز تو دلہن بنے گی۔" رمضو ہنسنے لگا۔

"نہیں رمضو۔ میں ایسی دلہن نہیں بنوں گی۔ میں۔ میں مر جاؤں گی مگر ایسی دلہن نہیں بنوں گی۔"

"دیکھو رمضو۔ اپنے سے رڑا نہیں چلے گا۔ تو نے کہا تھا کہ لڑکی راضی ہے۔"

"کیسے سیٹھ ہو۔ بو خان۔ دبوچ لو سسری کو۔"

"ایسے نہیں بھائی۔ اپن تو راضی خوشی کے سیٹھ ہیں۔ دس ہزار روپیہ بھی خرچ کریں اور گڑبڑ بھی کریں۔ نہیں رمضو۔ کل ہمارے پیسے واپس کر دینا۔"

"تو نہیں مانے گی تارا؟۔"

"ہرگز نہیں اسے نکل دے ورنہ۔ ورنہ میں اس کا خون کر دوں گی۔" تارا چیخ کر بولی اور بو سیٹھ خود باہر بھاگ گئے۔ رمضو بھی ان کے ساتھ ہی نکل گیا۔ لیکن جب وہ

واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک جلی ہوئی لکڑی تھی اور اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"بول۔ اب انکار کرے گی؟۔"

"میں تیری صورت پر تھوکتی ہوں رمضو۔" تارا نے کہا اور رمضو نے لکڑی گھما دی جو تارا کی پسلی پر پڑی تھی۔ تارا کے حلق سے کراہ نکلی اور رمضو کو دورہ پڑ گیا۔ شراب کے نشے میں وہ بھول گیا تھا کہ اس نے تارا کو کس طرح مارا تھا۔ تارا گر پڑی۔ اور دلہن بنی تارا موت کی آغوش میں جا سوئی۔ اور اس کے بعد۔ اس کے بعد تارا۔ تمہارے سامنے ہے۔ لیکن اب اس دنیا میں اس کے لئے سب رمضو بن چکے ہیں۔ اسے ساری دنیا کے مردوں سے نفرت ہے۔ میں اس دنیا کے ہر مرد کا خون پی لینا چاہتی ہوں۔ میں۔ میں تمہارا بھی خون پی جاؤں گی۔"

قدسیہ پلنگ سے نیچے اتر آئی۔ اس کا خیال تھا کہ اب مصور چیختا ہوا بھاگ نکلے گا اور یہاں سے میل دو میل جا کر ہی پناہ لے گا لیکن وہ کمبخت اب بھی اسی طرح کھڑا تھا۔ قدسیہ دونوں ہاتھ پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تب اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"رک جاؤ معصوم لڑکی۔ میری سوکھی رگوں میں تمہیں خون نہیں ملے گا۔ یہ خون تو عرصہ دراز ہوا خشک ہو چکا ہے ہاں اب ان رگوں میں زندگی کہاں۔ ان رگوں کا خون تو آخری بار اس وقت بہا تھا جب۔ بستی میں بھونچال آیا تھا۔ جب جب بڑی کی آواز خوابناک ہو گئی اور قدسیہ کے قدم رک گئے۔

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟۔" وہ بولی۔

"روح تو روح کو پہچان لیتی ہے۔ لیکن۔ تم۔ تم۔ کیا تم میرے وجود میں زندگی دیکھ رہی ہو۔ میں نے کہا تھا نا اس دنیا میں انسان بے سکون ہے۔ زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی۔ ہم وہ بے سکون روحیں ہیں جنہیں مرنے کے بعد بھی سکون نہیں ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھی؟۔" قدسیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا ان ویرانوں میں۔ ان ویرانوں میں تم زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہو ——

کیا یہ زندہ لوگوں کا مسکن ہو سکتا ہے۔"

"تو کیا۔ تو کیا۔" قدسیہ کی آواز پھنسنے لگی۔ اب وہ بڑی کی بے خوفی کا راز سمجھ چکی تھی۔ بڑی کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور پھر اس کے منہ سے ایک خوفناک آواز نکلی۔

ڈھولک کی تھاپ پر کنواریوں کے کنوارے گیت ابھر رہے تھے۔ معصوم معصوم گیت جن میں خوشیاں چھپی ہوئی تھیں۔ انجانی کپکپاہٹیں جنہیں وہ صرف محسوس کر رہی تھی سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اور یہ کپکپاہٹیں جھوم جھوم کر گیت بن جاتی تھیں۔ گلاب گلاب نشیلی مسکراتی ہوئی آنکھیں جن پر بوجھل پلکوں کے غلاف جھکے جا رہے تھے۔ باہر اجالے میں برسات کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔

چودھری عبد اللہ کے بیٹے کی شادی سابق نمبردار حکیم الدین کی بیٹی سے ہو رہی تھی۔ کنواریاں گیت چھوڑ آئیں اور ان جھروکوں میں آئیں جن سے دولہا دلہن کو دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ سب اس بانکے بانکے چھیلے کی چھب دیکھنے کے لئے بے چین تھیں جسے درجنوں بار دیکھ چکی تھیں۔ عبداللہ کا بیٹا شمشاد گھوڑے سے اترا۔ بلند و بالا چوڑی چھاتی' دولہا بنا ہوا بڑا ہی سج رہا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں بلائیں لی جا رہی تھیں۔ حکیم الدین آگے بڑھا اور دولہا کے باپ سے مصافحہ کیا اور دولہا کو عزت کے ساتھ مسند کی طرف لے جایا گیا اور پھر بٹھا دیا گیا۔ پھر سب ایک دوسرے سے گفتگو کرنے لگے۔ چاروں طرف زندگی تھی۔ ڈھولک پر پھر تھاپ پڑنے لگی اور پھر قاضی صاحب آ گئے۔

"لڑکیوں سے کہو گیت بند کر دیں نکاح ہو گا۔" کسی کی آواز ابھری اور اندر خبر پہنچ گئی۔ کنواریوں کو ہر چیز سے دلچسپی تھی جھروکے پھر آباد ہو گئے۔ نکاح کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پھر قاضی صاحب کی آواز ابھری۔

"بڑے چودھری صاحب ابھی نہیں آئے نکاح میں دیر ہو رہی ہے۔"

"ایں۔" حکیم الدین چونک پڑے۔ عبد اللہ نزدیک ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں عبداللہ کی طرف دیکھا اور بولے۔

"عبداللہ۔ کیا بڑے چودھری صاحب آئیں گے؟۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا مطلب۔؟" حکیم الدین کے چہرے پر خوف کے آثار لہرانے لگے۔

"کیا تم نے انھیں بلایا ہے حکیم الدین۔؟" عبداللہ نے پوچھا۔

میں نے تو انھیں نہیں بلایا عبداللہ بڑے چودھری صاحب کو تو بیٹے والے بلاتے ہیں ان کی مرضی کے بغیر تو بستی میں کوئی شادی ہوتی ہی نہیں۔"

"جہاں تک مرضی کی بات ہے حکیم الدین تو بڑے چودھری صاحب کو میرے بیٹے کی شادی پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے جہاں تک انھیں بلانے کا سوال ہے تو ان کا اور ہمارا کیا جوڑ۔ اپنے بیٹے کی شادی دعوت انھیں دینے جانا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ بات وہی ہے بھلا وہ شریک کہاں ہوتے مگر تم اتنے پریشان کیوں ہو۔؟" عبداللہ نے سوال کیا۔

"اوہ عبداللہ یہ تم نے برا کیا بہت ہی برا کیا خدا خیر کرے۔"

حیکم الدین کے چہرے پر خوف کے تاثرات اور گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا حکیم الدین تم اتنے پریشان کیوں ہو۔

چودھری صاحب کا اور ہمارا تو کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔ بھلا وہ ہمارے بیٹے کی شادی میں کیوں شریک ہوتے۔ نکاح شروع کرواؤ خوامخواہ کے جھنجھٹوں میں نہ پڑو۔"

"جیسی تمہاری مرضی اللہ خیر کرے۔" حکیم الدین نے کہا اور قاضی صاحب کو نکاح کی اجازت دے دی۔ قاضی صاحب خود بھی پریشان نظر آ رہے تھے۔

"یہ کیسی شادی ہے حکیم الدین جس میں بڑے صاحب شریک نہیں تو ان کا کوئی ہرکارہ بھی نہیں ہے۔ تم سوچ لو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔" قاضی صاحب نے کہا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نکاح کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ عبداللہ بھی ان کے نزدیک ہی موجود تھے اور پھر ضروری تیاریوں کے بعد نکاح شروع ہو گیا۔ قاضی صاحب نے خطبہ پڑھا اور چاروں طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں گونجنے لگیں۔ بہت سے لوگوں نے بڑے چودھری صاحب کے بارے میں سوال کیا تھا لیکن اس سوال کا کوئی مناسب جواب نہیں پا سکے تھے۔ مٹھائی اور دوسری چیزیں تقسیم ہونے لگیں اور چاروں طرف لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ بستی کا بیٹا اور بستی کی بیٹی تھی سبھی خوش تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ خوشی سے مسکراتے ہوئے ہونٹ سکڑنے لگے۔ دور سے

چند گھوڑے آتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اور سب سے آگے چودھری صاحب کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ غیض و غضب کا پیکر' بلند و بالا قد و قامت کا مالک بڑی بڑی مونچھوں سے آراستہ۔ خونخوار چہرے والا شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا احاطے کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔ ان کی بھاری آواز گونجی۔

"عبداللہ کہاں ہے۔" اور عبداللہ آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کیوں عبداللہ ہماری تم سے کب کی دشمنی ہے۔" چودھری صاحب نے سوال کیا۔

"میں نہیں سمجھا سرکار بھلا میری مجال کہ میں آپ سے دشمنی کا خیال بھی کروں۔"

"تو پھر تمہیں بستی کی ریت معلوم ہے۔ ہمارے بغیر بستی میں کوئی شادی نہیں ہو سکتی ہے یا پہلے کبھی ہوئی ہے۔؟"

تمام براتی سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ چودھری صاحب کے تیور اچھے نہیں تھے۔ اور ان کے بارے میں سبھی لوگ جانتے تھے بستی والے چودھری صاحب کی مرضی سے جی سکتے ہیں وہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو وہ کبھی آباد نہیں ہو سکتا تھا۔

اور اس وقت عبداللہ پر آبنی تھی۔ بلاوا ہمیشہ بیٹے والوں کی طرف سے ہوتا ہے اور سارا قصور عبداللہ کا تھا۔ حکیم الدین اس جرم سے مستثنٰی تھے لیکن روح ان کی بھی فنا ہو رہی تھی۔ نہ جانے اب کیا ہو گا۔

"بستی والو تم نے دیکھا اس عبداللہ کو۔ اس نے اپنے بیٹے کو بستی کا باغی بنایا ہے۔ بھلا اس بستی کے لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ اپنے بیٹوں کو شہر میں تعلیم دلوائیں۔ کسان کے بیٹے کو کسان ہی ہونا چاہئے لیکن عبداللہ نے اپنے بیٹے کو شہر میں تعلیم دلوائی شہر میں اسے نوکری دلوائی جیسے بستی سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ کیا یہ بات بستی کی ریت کے خلاف نہیں ہے۔ اور اس کے بعد براہ راست ہماری بے عزتی کی اس نے بیٹے کی شادی میں ہمیں پوچھا بھی نہیں۔"

"میں نے بستی سے بغاوت نہیں کی ہے چودھری صاحب آپ کا خیال غلط ہے۔ تعلیم دلانا کوئی بری بات تو نہیں ہے۔ آپ دیکھ لیں میرا بیٹا شہر میں رہنے کے باوجود بستی کی بیٹی بیاہنے آیا ہے۔"

"گویا احسان کیا ہے بستی پر۔ سنا تم نے۔" چودھری صاحب طنزیہ انداز میں بولے۔ پھر ان کی گرجدار آواز ابھری۔ "لیکن عبد اللہ تم نے جس رسم کی ابتدا کی ہے ہم اسے پھلنے پھولنے نہیں دیں گے آج تم نے ہمیں نہ بلا کر ہماری بے عزتی کی ہے کل دوسرے کریں گے اور ہماری کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ چنانچہ ہم یہ حکم دیتے ہیں کہ یہ شادی رد کر دی جائے۔ یہ شادی نہیں ہو گی۔"

"کیا کہہ رہے ہیں چودھری صاحب معاف کر دیں بیچارے کو۔ بھلا کس کی مجال ہے کہ کوئی آپ کی بے عزتی کرے۔" ایک بوڑھے نے آگے بڑھ کر کہا اور چودھری صاحب غیض آلود نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"آگے آؤ۔" انہوں نے بوڑھے سے کہا اور بوڑھا آگے بڑھ آیا۔ دوسرے لمحے چودھری صاحب کی لات بوڑھے کے منہ پر پڑی اور بوڑھا ایک چیخ کے ساتھ دوسری طرف الٹ گیا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔

"ہمیں مشورہ دے رہا تھا۔" چودھری صاحب غرائے۔ کس کی مجال نہ تھی کہ زخمی بوڑھے کو اٹھانے کی کوشش کرتا۔ حکیم الدین آگے بڑھ آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"بہت بڑی بھول ہو گئی سرکار۔ معاف کر دیں اب تو نکاح ہو چکا ہے۔"

"نکاح ہو چکا ہے۔؟" چودھری صاحب نے گردن ہلائی۔

"ہاں سرکار۔"

"تو کیا ہے حکیم الدین۔ نکاح کے بعد طلاق بھی ہو سکتی ہے۔" چودھری صاحب بے رحمی سے بولے اور بہت سی آوازیں نکل گئیں۔

"نہیں چودھری صاحب خدا کے واسطے ایسی بدشگونی کی بات نہ کریں۔"

"کیا نام ہے تیرے بیٹے کا۔؟" چودھری صاحب نے پوچھا۔

"شمشلو سرکار۔" عبد اللہ بولا۔

"شمشلو۔ ہم تجھے حکم دیتے ہیں۔" چودھری صاحب نے کہا اور چھبیلا' ارمان بھرا اٹھ گیا اور آہستہ آہستہ چودھری صاحب کے قریب پہنچ گیا اور اس نے بڑے ادب سے

انہیں سلام کیا۔

"بڑا مغرور ہے رے۔ اپنی شادی میں ہمیں پوچھا بھی نہیں۔"

"میرے باپ سے غلطی ہو گئی ہے سرکار ہمیں معاف کر دیں۔"

"کر سکتا ہوں لیکن ایک شرط پر۔" چودھری کی بے رحم آواز ابھری۔ "حکیم الدین کی بیٹی کو طلاق دے دے ابھی اور اسی وقت۔"

"چودھری صاحب۔" شمشلو کی سخت آواز ابھری۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں چودھری صاحب۔"؟!

"اونچی آواز میں بول رہا ہے بے ایمان۔ جان بچانے کی ترکیب بتا رہے ہیں تجھے۔"

"آپ پاگل ہو گئے ہیں چودھری صاحب۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ آپ یہاں سے چلے جائیے ورنہ۔ ورنہ۔" شمشلو کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"سنا تم لوگوں نے یہ شہر کی تعلیم بول رہی ہے۔ یہ بستی سے بغاوت بول رہی ہے۔ عبد اللہ بیٹے کو شہر تو بھیج دیا۔ اپنے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا۔"

"خدا کے لئے چودھری صاحب چلے جائیے۔ یہاں سے چلے جائیے۔" عبد اللہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

"چودھری صاحب۔ چودھری صاحب۔ معاف کر دیں۔" اس بار بہت سی آوازیں ابھریں۔"

"چلے جائیں گے لیکن بات ہماری آن کی ہے۔ تم سب چودھری صاحب کا وقار بھول رہے ہو لیکن ہم اسے بحال کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ حکیم الدین کی بیٹی کو طلاق دو شمشلو ورنہ۔" چودھری صاحب نے پستول نکال لیا نشانہ عبد اللہ تھا۔

اور شمشلو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دوسرے لمحے اس نے گھوڑے کی باگیں پکڑ کر اسے موڑا گھوڑا ہنہنا کر الٹا ہو گیا۔ چودھری صاحب گھوڑے سے گرے تو انہوں نے ایک فائر کیا اور گولی عبد اللہ کے دماغ میں گھس گئی۔ چاروں طرف چیخ و پکار کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

چودھری صاحب کے لوگوں نے بندوقیں شمشلو کی طرف سیدھی کر لی تھیں اور

شمشاد غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

"میں تجھے قتل کر دوں گا کتے۔ دیوانے کتے۔ میں تجھ سے اپنے باپ کا بدلہ لوں گا۔" وہ چودھری صاحب کی طرف لپکا لیکن بستی والوں نے اسے پکڑ لیا۔

"چھوڑ دو اسے پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں اسے ہوش میں لاؤں گا۔ میں اسے بتاؤں گا چودھری کیا ہے پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ اپنی موت کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ یہ شہر جا کر چودھری نہیں بن سکتا۔ یہ ایک حقیر کسان کا بیٹا ہے اور کوئی کسان چودھری دلاور بیگ کی مرضی کے بغیر آباد نہیں ہو سکتا۔"

"چودھری دلاور میں تجھے برباد کر دوں گا۔ میں تجھے بھی آباد نہیں ہونے دوں گا۔ خدا کی قسم چودھری۔ میں تیری حویلی میں کسی کی روح کو بھی نہ رہنے دوں گا۔ میں۔"

"اوہ۔ بڑی بات کر رہا ہے شمشاد۔ بہت بڑی بات کر رہا ہے۔ میں تجھے ابھی ٹھکانے لگائے دیتا ہوں لیکن تو نے میری آن کو للکارا ہے۔ سنا بستی والو۔ یہ میری حویلی کو ویران کر دیگا۔ میں اسے ضرور موقع دوں گا۔ "جگ سنگھ گھوڑے باندھ لو۔ گھوڑے پر ڈال دو سسرے کو۔ کیا سمجھا ہے اس نے چودھری دلاور بیگ کو۔" چودھری صاحب نے کہا اور بیشمار لوگ شمشاد پر ٹوٹ پڑے۔

شمشاد کے مضبوط اور گھونسوں نے ان میں سے کئی کے حلیے بگاڑ دیئے تھے۔ لیکن وہ کب تک مقابلہ کرتا۔ چودھری صاحب کے کسی ہرکارے کی بندوق کا ایک بٹ اس کے سر پر پڑا اور وہ خون میں نہا گیا۔ سرے کی لڑیوں کے نیچے سے خون کی دھار پھوٹ نکلی۔ شمشاد آہستہ آہستہ نیچے گر پڑا۔

تب چودھری نے اسے گھوڑے پر ڈلوایا اور لے گیا۔ وہ شمشاد سے مزید انتقام لینا چاہتا تھا۔ اور یہ انتقام صرف شمشاد سے لیا گیا بلکہ اس کے پورے خاندان سے لیا گیا جنہوں نے بغاوت کی تھی۔ ایک ایک کو چن چن کر ختم کر دیا گیا۔ شمشاد کو بستی سے دور ایک ویرانے میں پھنکوا دیا گیا تھا لیکن جب اسے ہوش آیا تو سر کی چوٹ کی وجہ سے وہ اپنی یاد داشت کھو بیٹھا تھا اور اس کے بعد اسے کچھ یاد نہ رہا۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ ہاں ایک تصور کبھی کبھی اس کے ذہن میں ابھر آتی تھی ایک دلہن کی تصویر جس کے ہاتھوں میں

مہندی رچی تھی۔ لیکن یہی مہندی اس کے سہاگ کا خون بن گئی۔ ہاں ایسی شادی تو کبھی کسی نے نہ دیکھی ہو گی۔

شمشاد کے ذہن کی چبھن نے اسے مصور بنا دیا۔ اور لوگوں نے نہ جانے کیوں اسے بڑی کہنا شروع کر دیا۔ ایک انوکھا مصور جس کی ہر تصویر میں ایک دوشیزہ ہوتی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ خدو خال سے عاری رہتا تھا۔ یہ خدو خال بڑی کی کھوئی ہوئی یاد داشت میں گم ہو گئے تھے۔۔ اور ساری زندگی وہ انہی خدوخال کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ پھر موت کو اس پر رحم آگیا اور۔ اور موت کا رحم بھی اس کے زخموں کا مداوا نہ بن سکا۔ موت کے بعد اس کا ماضی اس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

لیکن وہ چہرہ' وہ چہرہ آج بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ ہاں بڑی یا شمشاد آج بھی اس چہرے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کاش وہ چہرہ ایک بار اسے مل جائے۔"

بڑی کی آواز رندھ گئی۔ لیکن قدسیہ کے جسم کا لہو خشک ہو گیا تھا۔ وہ سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا مذاق ایسی خوفناک صورتحال اختیار کر جائے گا!

"آؤ۔ میں تمہیں اپنی تصویریں دکھاؤں۔ میرے ساتھ آؤ۔" بڑی نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ لیکن قدسیہ کے قدم جم کر رہ گئے تھے۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔

"آ جاؤ لڑکی۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں ہمیں ایک دوسرے سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"لیکن۔ لیکن تم مر کس طرح گئے۔؟"

"موت۔ ہم جیسوں کی پہلی طلب ہوتی ہے۔ تم نے بھی اس زندگی پر موت کو ترجیح دی اور میں بھی موت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ میں اپنی خالی تصویر کو خدو خال دینے کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ فاقہ کشی اور بیماریوں نے مجھے آ لیا اور پھر ایک وقت میری مشکل آسان ہو گئی۔ لیکن تم میرے ساتھ آئی کیوں نہیں۔ آؤ۔"

اس کی آواز کرخت ہو گئی۔ اور قدسیہ سہمے ہوئے انداز میں چل پڑی۔

اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ ذہن بے قابو ہوا جا رہا تھا نہ جانے کس طرح وہ چل رہی تھی۔ کئی بار سیڑھیوں سے گرتے گرتے بچی۔ بزمی انسان نہیں تھا بھوت تھا۔ وہ زندہ نہیں تھا آہ۔ آہ۔ اب کیا کروں۔"

بزمی اسے لے کر نیچے کے کمرے میں آیا۔ لالٹین جل رہی تھی کمرے میں اس کا بھیگا ہوا سامان موجود تھا۔ اس نے کینوس اس کے سامنے کر دیا۔ ایک حسین اور جواں دلہن۔ لیکن اس کا چہرہ خالی تھا۔

پھر اس نے کئی تصویریں قدسیہ کو دکھائیں۔ انوکھے ویرانے تھے۔ لیکن ہر تصویر میں ایک دوشیزہ ضرور تھی۔ خدوخال سے بے نیاز۔ تب بزمی کی آواز ابھری۔

"لڑکی۔ کیا میں تم سے ایک استدعا کر سکتا ہوں۔" اس کی آواز حد درجہ حسرت ناک تھی۔

"کیا۔؟" قدسیہ کی آواز ڈوبی جا رہی تھی۔

"کیا تم اپنا گھونگھٹ نہیں اٹھاؤ گی۔؟"

"کیوں۔ کیوں۔؟"

"ممکن ہے۔ ممکن ہے تم ہی۔ تم ہی میرے خوابوں کا طلسم توڑ دو۔ ممکن ہے تم وہی ہو جس کی مجھے تلاش ہو۔ آہ اگر تمہارے خدو خال میرے ذہن کو سکون بخش سکیں تو یہ تمہارا میرے اوپر بڑا احسان ہو گا۔ میں تمہیں اپنی تصویر میں اتار لوں گا۔ اور پھر سکون کی آخری سانس لے کر ہمیشہ کے لئے سو جاؤں گا۔

گھونگھٹ الٹ دو میری دلہن۔ آہ۔ گھونگھٹ الٹ دو۔" بزمی نے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ اور قدسیہ کی دلخراش چیخ ابھری اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اگر بزمی اسے سنبھال نہ لیتا تو وہ گر پڑی ہوتی۔

بزمی نے اسے اطمینان سے پلنگ پر لٹا دیا۔ قدسیہ چند لمحات کے بعد ہی ہوش میں آ گئی تھی۔ لیکن ہوش میں آتے ہی وہ پھر چیخ پڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے تھے۔

"لیکن تم خوفزدہ کیوں ہو۔؟" بزمی کی آواز ابھری۔

"چلے جاؤ۔ خدا کے لئے چلے جاؤ۔ میں تمہیں برداشت نہیں کر سکتی۔ آہ بچاؤ۔ بچاؤ۔" وہ چیخی۔

"تم تو زندہ انسانوں کی طرح خوفزدہ ہو رہی ہو لڑکی۔"

"م۔ میں زندہ ہوں۔ خدا کی قسم میں زندہ ہوں۔" قدسیہ نے کہا اور قرآنی آیات پڑھنے لگی جو کچھ اسے یاد آیا اس نے پڑھ ڈالا۔ بزمی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ تعجب سے بولا۔

"تم زندہ ہو۔؟"

"ہاں۔ ہاں۔ میں۔ م۔ میرا نام قدسیہ ربانی ہے۔ میڈیکل اسٹوڈنٹ ہوں۔ احسن پور جا رہی تھی کہ۔ کہ راستے میں بارش ہو گئی اور۔ اور۔"

"لیکن یہ لباس اور یہ کہانی۔؟" بزمی نے پوچھا۔

"یقین کرو۔ سب جھوٹ ہے من گھڑت۔ آہ مجھے یہاں سے جانے دو۔" وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

"آہ۔ کیا تم میری تصویر کو خدوخال نہیں دو گی۔؟" بزمی نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔" قدسیہ گھٹی گھٹی آواز میں چیخی۔ اور بزمی ہنس پڑا۔

"تو آپ روح نہیں ہیں۔" وہ بولا۔

"خدا کی قسم۔ معاف کر دو۔ آہ مجھے معاف کر دو۔ مجھے جانے دو مجھے۔"

"ارے تو میں کونسا آپ کا اچار بنا کر کھا رہا ہوں۔ خواہ مخواہ شور مچا رہی ہوں۔ اب تو میں آپ کی صورت بھی دیکھ چکا ہوں آپ قطعی اس قابل نہیں ہیں کہ میں اپنی ادھوری تصویر کو آپ کے خدوخال دوں۔" بزمی برا سا منہ بنا کر بولا۔ پھر ایک دم ہنس پڑا۔ "لیکن وہ گانا وہ آواز۔"

"ٹیپ ریکارڈ کی تی۔"

"ارے۔ لیکن ٹیپ ریکارڈ کہاں ہے مجھے تو آپ کے کمرے میں نہیں نظر آیا۔"

"میں نے، میں نے اسے کھڑکی میں لٹکا دیا تھا۔"

"اوہ۔ اور وہ کہانی۔؟"

"جھوٹ تھی۔ صرف اختراع۔"

"کمال ہے۔ آپ میڈیکل اسٹوڈنٹ کے بجائے کوئی پر اسرار کہانیوں کی خالق مصنفہ کیوں نہیں ہیں۔ لیکن محترمہ۔ کیا آپ کے خیال میں کہانیاں صرف آپ ہی تخلیق کر سکتی ہیں۔؟"

"ایں۔ معاف کر دو۔ کیا کہا تم نے؟" قدسیہ حواس میں نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"جی ہاں۔ میں نے بھی جواباً کہانی ہی عرض کی تھی۔" بزمی پھر ہنس پڑا۔

"کیا۔؟" قدسیہ کا منہ کھل گیا۔

"عمارت کی پشت پر آپ ہی کی گاڑی کھڑی ہے۔"

"ہاں۔ ہاں۔"

"غالباً بارش کی وجہ سے آپ یہاں رک گئی ہوں گی۔"

"ہاں۔" اس نے جلدی سے گردن ہلا دی۔

"اور پھر آپ نے سوچا کہ کیوں نہ ایک ستم رسیدہ انسان کو خوفزدہ کیا جائے۔ میں بھی بہت زیادہ دلیر نہیں ہوں لیکن آپ کی کار نے آپ کی چغلی کھائی ورنہ شاید میں آپ سے خوفزدہ ہو جاتا۔"

"تو کیا۔ تو کیا۔ تم بھی۔ تم بھی زندہ ہو۔"

"بفضل تعالیٰ۔" بزمی نے گردن جھکا دی۔

"اور وہ کہانی۔؟"

"ایک ڈائجسٹ میں پڑھی تھی۔" بزمی نے لاپرواہی سے کہا اور قدسیہ کی سانسیں اعتدال پر آنے لگیں۔ وہ متعجب نگاہوں سے بزمی کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا واقعی۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"جناب۔ خاکسار کو یونس بزمی کہتے ہیں۔ اپنی تصاویر کے ادھورے خاکے تیار کر لیتا ہوں اور پھر انہیں قریہ قریہ گھوم کر خدوخال دیتا ہوں۔ یہاں کئی دن سے مقیم ہوں۔"

"اوہ۔ خدا کا شکر ہے۔ آپ کو دوش نہ دوں گی۔ قصور میرا ہی ہے۔ میں نے ہی

آپ کو پریشان کیا تھا۔"

"چلئے معاف کر دیا۔ کہیں جا رہی تھیں آپ۔؟"

"دلاور پور۔"

"اور کہاں سے تشریف لائی ہیں۔؟"

"حسن پور سے۔"

"لیکن اس بارش میں یہ خطرناک سفر کرنے کی کیا سوجھی آپکو۔"

"بس حماقت ہو گئی اور کیا کہوں۔" قدسیہ نے گردن جھکا لی اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے سامنے کوئی بھوت نہیں ہے۔"

"بہر حال۔ بعض اوقات شرارت خاصی نقصان دہ ہوتی ہے۔ آئندہ احتیاط رکھیں۔" بزمی نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی اور دونوں چونک پڑے۔

"چائے لایا ہوں۔" چوکیدار نے کہا۔

"اوہ۔ کیا صبح ہو گئی۔؟" بزمی نے چونک کر پوچھا اور چوکیدار اندر آ گیا۔

"صبح کے پانچ بجے ہیں۔" اس نے چائے کی ٹرے سامنے رکھ دی۔ جس میں دو پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"اوہ۔ کیا تمہیں معلوم تھا کہ مس قدسیہ بھی یہاں موجود ہیں۔؟"

"معلوم تھا صاحب۔" چوکیدار نے کہا۔

"بارش بند ہو گئی۔"

"وہ تو رات ہی کو بند ہو گئی تھی۔ چوکیدار واپسی کے لئے مڑ گیا۔ اس کے انداز میں ایک انوکھی بات تھی۔ جس سے دونوں ہی جھینپ رہے تھے۔ پھر وہ خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ کوئی کچھ نہ بول سکا تھا۔

قدسیہ نے جلدی سے چائے ختم کی۔ اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا بزمی صاحب۔ اب میں چلوں گی۔"

"بہتر ہے۔ خدا حافظ۔" بزمی نے لاپرواہی سے کہا اور قدسیہ باہر نکل گئی۔ عجیب

لاابالی نوجوان ہے۔ لیکن کمبخت بڑا ہی کمینہ نکلا۔ کیسا بیوقوف بنایا ہے پہلے ہی سمجھ گیا تھا ذلیل کہیں کا۔ لعنت ہے اس پر۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ پھر جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور نیچے اتر آئی۔

بزمی کھڑا چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا۔ چوکیدار نے اسے دیکھا تو بول پڑا۔ "ناشتہ نہیں کریں گی بی بی۔؟"

"نہیں چوکیدار تمہارا شکریہ۔ یہ رکھ لو۔" قدسیہ نے جیب سے دو سو روپے کے نوٹ نکال کر چوکیدار کی طرف بڑھا دیئے۔

"نہیں بی بی۔ ہم ان کا کیا کریں گے۔"

"رکھ لو چوکیدار۔ تم بہت شریف انسان ہو۔" قدسیہ بولی۔

"میں نے کہا نا بی بی۔ ان چیزوں کی ضرورت آپ کو ہوتی ہے۔ ہمارے لئے یہ کاغذ کے ٹکڑے بیکار ہوتے ہیں۔"

"کیوں۔؟"

"یہ چیزیں تو زندہ انسانوں کے لئے کار آمد ہوتی ہیں یہاں کونسی ضرورت پیش آتی ہے جو ان کا سہارا لیں۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ اور قدسیہ ہنس پڑی۔

"خوب۔ تو بزمی صاحب نے اب تمہیں سکھا دیا۔"؟

"کیا سکھا دیا بی بی۔؟" چوکیدار تعجب سے بولا۔

"تم اب خود کو بھوت کہو گے۔؟" قدسیہ بدستور مسکراتی ہوئی بولی۔

"بھوتوں کی توہین نہ کرو بی بی۔ ہم نے آپ کی خدمت کی ہے۔ سب کی خدمت کرتے ہیں۔"

"تو کیا تم سچ مچ کے بھوت ہو۔؟"

"یقین نہیں ہے آپ کو۔؟" چوکیدار کا لہجہ عجیب ہو گیا۔ بزمی بھی تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اب میں کسی کے چکر میں نہیں آ سکتی بزمی صاحب آپ خود بھوت نہ نکلے تو آپ نے انہیں بھوت بنا دیا۔"

"یہ بات ہے تو دیکھ لیں۔ ہم تو کسی کو بتاتے ہی نہیں لیکن جب لوگ ہماری توہین کرنے لگیں تو ہم کیا کریں۔" بوڑھے چوکیدار نے کہا اور اچانک اس کی گردن شانوں سے بلند ہونے لگی۔ ایک فٹ۔ دو فٹ' تین فٹ' پانچ فٹ' دس فٹ اتنی لمبی گردن ہو گئی کہ ناقابل قیاس تھی۔ اور پھر اس کے دونوں ہاتھ پھیلنے لگے۔ ہاتھ بھی کئی کئی گز لمبے ہو گئے تھے پھر پاؤں۔

قدسیہ کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی تھی۔ لیکن اس چیخ میں بزمی کی چیخ بھی شامل تھی۔ اور پھر اس نے قدسیہ کا ہاتھ پکڑا اور بے تحاشہ دوڑ پڑا۔ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے وہ عمارت سے باہر آ گئے۔

قدسیہ بار بار چیخ رہی تھی لیکن بزمی اس کو سنبھالے ہوئے دوڑا رہا تھا۔ اور پھر وہ کار کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے قدسیہ کے ہاتھ سے کار کی چابی چھینی اور خود اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ پھر وہ اتنی پھرتی سے کار کو اسٹارٹ کر کے آگے لایا کہ قدسیہ حیران رہ گئی۔ دوسرے لمحے کار بے تحاشہ سڑک کی طرف بھاگ رہی تھی۔

قدسیہ نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے ہوئے تھے اور اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اگر وہ خود ڈرائیو کر رہی ہوتی تو یقیناً کسی حادثے کا شکار ہو جاتی۔ لیکن بزمی اس سے زیادہ مضبوط اعصاب کا تھا۔

وہ ڈاک بنگلے سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ اور پھر جب ڈاک بنگلہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو قدسیہ نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹائے اور بزمی کو دیکھ کر پھر چیخ پڑی۔

"اگر آپ اب چیخیں تو میں کار کسی کھڈ میں گرا دوں گا۔ خدا کی پناہ میرے خیال میں تو آپ خود بھوت ہیں۔"

"وہ سچ مچ بھوت تھا۔" قدسیہ بولی۔

"ہاں۔ وہ اصلی بھوت نکلا۔ ہم دونوں تو بھوت ہونے کی اداکاری ہی کرتے رہے۔" بزمی گہری گہری سانسیں لیتا ہوا بولا۔

"تمہیں۔ تمہیں بھی معلوم نہیں تھا۔"؟

"میں پاگل نظر آتا ہوں آپ کو۔؟" بزمی نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیوں۔؟"

"اگر معلوم ہوتا تو میں چار دن تک اس کے ساتھ قیام کرتا خدا کی پناہ وہ ہمیشہ تازہ اور عمدہ کھانے کھلاتا تھا اور میں یہی سوچتا رہ جاتا تھا کہ وہ یہ چیزیں کہاں سے حاصل کرتا ہے۔ مگر اسے کیا کمی تھی۔"

"مجھے اس نے کافی پلائی تھی"! قدسیہ نے کہا۔

"ضرور پلائی ہو گی۔ توبہ توبہ مجھے تو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔"

"بزمی صاحب۔" قدسیہ نے اسے پکارا۔

"جی۔ فرمایئے۔؟"

"آپ کی تصویریں بھی وہاں رہ گئیں۔"

"لعنت بھیجیں۔ زندگی لے آیا یہی کیا کم ہے تصویریں پھر بنالوں گا۔ افوہ۔ میں نے تین دن اس کے ساتھ گزارے ہیں۔" پورے تین دن مجھے ضرور بخار آئے گا۔ میرے اعصاب بھی متاثر ہوتے جارہے ہیں۔" بزمی نے کہا۔

"بزمی صاحب۔ یہ تو کوئی ڈرامہ نہیں ہے۔" قدسیہ نے کہا اور بزمی نے جھلا کر بریک لگادیئے۔

"کیا کہنا چاہتی ہیں آپ۔؟"

"چلئے۔ خدا کے لئے چلتے رہیے۔ میں معافی چاہتی ہوں" قدسیہ سہم کر بولی۔ اور بزمی نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھادی۔ وہ خود بھی خوفزدہ تھا۔

"یہ ڈرامہ آپ کے خیال میں اس کے ذہن کی اختراع ہو گی۔ اس نے بھی کسی ڈائجسٹ میں کوئی کہانی پڑھی ہو گی کیوں۔ لیکن محترمہ آپ کی اطلاع کے لئے کسی بھی ڈائجسٹ میں بھوت بننے کی ترکیب نہیں ہوتی۔ کوئی فارمولا ایسا نہیں ہے جس سے گردن دس فٹ لمبی اور پاؤں گزوں لمبے ہو جائیں۔"

"ہاں۔ یہ تو درست ہے۔" قدسیہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی بولی۔ اور کار برق رفتاری سے دوڑتی رہی۔ پھر دلاور پور کے آثار نظر آنے لگے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ شہر میں داخل ہو گئے۔ سورج پوری طرح نکل آیا تھا۔

تب بزمی نے کار روک دی اور نیچے اتر گیا۔ "اچھا مس قدسیہ خدا حافظ۔ اس بھیانک رات کو میں شاید ساری زندگی نہ بھول سکوں۔"

"آپ۔ آپ کہاں جائیں گے۔؟"

"کسی ہوٹل میں۔ میرا خیال ہے اب میں دس بارہ دن بیمار رہوں گا۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔"

"براہ کرم اگر آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائے تو آپ خان بہادر قدوس احمد کے یہاں مجھے فون کرلیں۔ لیکن آج شام کو آپ ضرور فون کریں۔ تاکہ میں اپنی دوستوں کے سامنے آپ کی گواہی دلوا سکوں۔"

"بشرط زندگی۔"! بزمی نے کہا اور ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ قدسیہ دیر تک اسٹیئرنگ پر بیٹھی اسے جاتے دیکھتی رہی تھی اور پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کار آگے بڑھا دی۔

یونس بزمی۔ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ "تمہیں تلاش کرنا مشکل نہ ہو گا۔"

مسافر

چاند پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی' رات کے ٹھیک بارہ بجے تھے۔ میں اس پسنجر ٹرین میں پہلی بار ہی سفر کر رہا تھا۔ اب تک میرے سفر کے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ ریاست رام پور سے چلے ہوئے ٹرین کو چھ گھنٹے ہوئے تھے اور میں نے اسے مارہرہ سے پکڑا تھا جو رام پور سے تیس میل پر واقع ہے۔

نصف شب کی وجہ سے اسٹیشن بالکل سنسان معلوم ہو رہا تھا۔ عمارت کے چند کمرے روشن ضرور تھے مگر یہ روشنی صرف اندر تک ہی کفالت کر رہی تھی۔ میں نے سر نکال کر نیم پختہ پلیٹ فارم کو غور سے دیکھا۔ چونکہ ایک گھنٹہ پہلے میرا سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔ اور ڈبے میں میرے علاوہ کوئی مسافر بھی نہیں تھا جس سے سگریٹ مستعار مانگ لیتا۔ مگر پلیٹ فارم کی اداسی نے مجھے اور بھی مایوس کیا۔ کوئی خوانچے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے مایوس ہو کر سر اندر کر لیا اور دھندلی روشنی میں تازہ اخبار پڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ گاڑی رک جانے کی وجہ سے لائٹ بہت مدھم تھی تاہم جلی سرخیاں اب بھی پڑھی جا سکتی تھیں۔

کمپارٹ کا دروازہ کسی نے کھولا تو میں ادھر متوجہ ہو گیا ایک اسمارٹ سے نوجوان نے اعتراض کیا تو قلی کو یہ بکس نیچے رکھنا پڑا بکس اتنا بڑا تھا اور چوڑا کہ دو برتھوں کے درمیان والی تمام جگہ اس بکس سے پر ہو گئی۔ ڈبے میں کوئی مسافر علاوہ میرے نہیں تھا اس لئے اس بکس کی وجہ سے کوئی قباحت بھی نہیں تھی پورا ڈبہ اب بھی خالی پڑا تھا۔

نوجوان میرے سامنے والی برتھ پر آ کر بیٹھ گیا اس نے قلی کو اجرت کے علاوہ ٹپ

بھی دی تھی اس کے علاوہ اس کی خوش پوشاکی میرے لئے توجہ کا باعث تھی چار گھنٹے سفر میں منہ باندھے بیٹھا رہا تھا اس لئے ایک ہم سفر مل جانے سے اس وقت مجھے دلی مسرت ہوئی تھی اس کی بھوری آنکھوں سے نسوانیت ٹپک رہی تھی۔ گاڑی روانہ ہوئی تو ہماری اجنبیت بھی ختم ہو گئی میں نے نوجوان کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"غالباً کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔؟"

نوجوان نے نہایت خندہ پیشانی سے مسکرا کر جواب دیا۔ "جی کانپور تک جانا ہے اور یہ گاڑی آپ جانتے ہیں کل شام تک کانپور پہنچے گی۔"

میں حیران رہ گیا۔ اس نوعمر نوجوان کی آواز میں بھی بلا کی نسوانیت تھی جب اس نے جواب دیا تھا میں یہ سمجھ رہا تھا کہ کوئی لڑکی مجھ سے مخاطب ہے اگر وہ پس پردہ کسی سے گفتگو کرتا تو ہرگز کوئی اسے مرد کہنے پر آمادہ نہ ہوتا مجھے خاموش پا کر نوجوان بولا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔؟ میرا خیال ہے آپ بھی" پھر وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔" میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر مصافحہ کیا۔

نوجوان کا ہاتھ بھی نسوانی ہاتھ کی طرح نرم نازک تھا۔ پھر میں نے قدرے تامل کے بعد اپنا نام بتایا۔

"آپ کا اسم شریف؟"

"دیانند ستیارتھی ---- ڈی اے وی کالج کانپور میں فلسفہ کا لیکچرار ہوں۔"

اس تعارف سے مجھے خوشی تو ہوئی لیکن اب نوجوان کے مقابلے میں خود کو ہلکا پا رہا تھا۔ چونکہ میں ایک معمولی سا بزنس مین ہوں۔ کچھ اس قسم کے جذبات کا میں نے اظہار کیا مگر نوجوان نے اس کے برعکس میرے ادب و احترام میں کوئی کمی نہ ہونے دی۔ وہ نہایت خوش گفتار اور لطیفہ گو ثابت ہوا' یہی وجہ تھی کہ اتنی رات گزر جانے کے باوجود میری آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

"میں تو اسی اسٹیشن سے روانہ ہوا ہوں" ---- اس نے اپنا ٹفن کیریئر اٹھا کر کہا۔ "لیکن آپ کافی دور سے سفر کر رہے ہیں یقیناً راستے میں آپ کو بڑی دشواری ہوئی ہو گی اس ذیلی لائن پر نہ تو اسٹیشن ہی اچھے ہیں اور جو ہیں بھی ان پر کوئی انتظام وغیرہ نہیں کیا جاتا

---- یقین جانئے بہت سے اشٹیشن تو پانی اور روشنی جیسی بنیادی ضرورتیں بھی پوری کرنے سے قاصر ہیں۔"

نوجوان نے ٹفن میں سے چند پوریاں نکالیں اور پھر کانچ کے ایک پیالے میں آلو سبزی رکھ کر ڈبہ میری طرف بڑھایا۔ "میرا خیال ہے آپ اس بھینٹ کو ضرور سویکار کریں گے۔" دیانند نے ادب سے کہا۔

"شکریہ ستیار تھی صاحب ---- میں شام کو کھاپی کر چلا ہوں اور اس وقت قطعی بھوک نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بالکل ناممکن بات ہے جناب' میں ہمیشہ گھر سے بھوکا چلتا ہوں اور ڈبے میں بیٹھ کر کھانے میں بڑا آنند ملتا ہے۔ اب آپ کو میرا ساتھ دینا ہی ہوگا۔" اس نے جبراً ڈبہ میرے قریب رکھ دیا۔

"سنئے تو" ---- میں نے کہا ---- "یہ تو بالکل زبردستی والی بات ہے آپ کو بھوک لگی ہے آپ شوق سے کھانا کھائیں۔"

"مگر شریمان جی ---- میں کبھی تنہا نہیں کھاتا ---- گھر میں بھائی جان اور کانپور میں دوستوں کے ساتھ۔ اب آپ زیادہ اعتراض نہ کریں۔ آپ کو ہماری قسم" آخر میں اس کا لہجہ بالکل نسوانی ہو گیا تھا۔

دیانند کا خلوص قابل ستائش تھا اس لئے مجبوراً مجھے اس کی پیش کش قبول کرنی پڑی۔ یوں بھی سفر کی وجہ سے کھانا جلد ہضم ہو گیا تھا پھر اتنے خلوص کو ٹھکرانا میری نگاہ میں ایک برائی سے کم بات نہیں تھی۔

ہم نے ایک ساتھ کھانا ختم کیا ---- پانی کا انتظام میرے پاس بھی تھا مگر پانی بھی مجھے دیانند کے تھرماس کا پینا پڑا وہ مجھ سے پہلے تھرماس کھول چکا تھا۔

چند پوریاں کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر میں فرحت محسوس کر رہا تھا۔ سگریٹ کی طلب میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا میں شاید دیانند سے سگریٹ کے بارے میں کچھ کہتا لیکن اپنی فطری شرم کے باعث نہ کہہ سکا۔ مگر دو منٹ بعد یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔

اس نے اپنی اٹیچی کھولی اور پھر دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں کریون اے کا ڈبہ اور

ماچس موجود تھی۔ میں نے زدیدہ نظروں سے سگریٹ کے ڈبے کو دیکھا مگر پھر فوراً ہی دوسری طرف دیکھنے لگا۔ شاید دیانند میری دلچسپی کا راز پا گیا تھا۔

اس نے سگریٹ کا ڈبہ کھول کر میری طرف بڑھادیا اور مکمل شائستگی سے کہا۔

"آپ شوق فرماتے ہوں تو سگریٹ حاضر ہے۔"

شکریہ ----" میں نے ایک سگریٹ نکال لیا اور جب دیانند بھی اپنی سگریٹ ہونٹوں میں دبا چکا تو اس نے ماچس جلا کر پہلے میری سگریٹ جلائی پھر اپنی سگریٹ سلگانے لگا۔

میں ایک درمیانے درجے کا سگریٹ پیتا ہوں اتنی اعلیٰ سگریٹ بس کبھی کبھار ہی پی ہے شاید اسی لئے چند کش لینے کے بعد میرا جسم سنانے میں آگیا۔ میں نے سوچا۔ یہ شاید اس وجہ سے ہو کہ میں نے بہت دیر سے سگریٹ نہیں پیا ہے۔ دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ اعلیٰ کوالٹی سگریٹ میں نشہ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔

سگریٹ ختم ہونے سے پہلے ہی میری حالت غیر ہو گئی۔ اب میں بالکل مجہول سا ہو گیا تھا ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت بھی نہیں تھی یہاں تک کہ جلتا ہوا سگریٹ بھی برتھ پر ہی گرا دیا جسے دیانند نے بجھا کر باہر پھینک دیا۔ دیانند اسی وقت اٹھ کر کھڑکیاں بند کرنے لگا پھر وہ دروازہ اندر سے بند کر کے واپس آگیا اب اس کے چہرے پر بڑی پراسرار مسکراہٹ تھی میں ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ مگر ہلنے جلنے اور بولنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔

میرے حواس خمسہ پوری طرح بیدار تھے مگر قوت عمل بالکل مفقود ہو چکی تھی۔

اور جب دیانند نے مجھے بانہوں سے پکڑ کر اٹھایا تو میری حالت ایک اپاہج کے مشابہ تھی دیانند نے مجھے سیٹ سے اٹھا کر نچلی برتھ پر لٹا دیا اس کے بعد وہ چابی سے بڑے ٹرنک کا تالا کھولنے لگا میں اس کی تمام حرکات دیکھ رہا تھا۔ ہر آہٹ سن رہا تھا مگر زبان بولنے سے معذور تھی۔ ٹرین اپنی عمومی رفتار سے چھک چھک کرتی چلی جا رہی تھی۔ ان دنوں تمام گاڑیاں کوئلے سے چلا کرتی تھیں اور ایسی گاڑیاں چھوٹے اشٹیشنوں پر بھی کافی دیر رکا کرتی تھیں۔

میل ٹرینوں کے مقابلے میں ان گاڑیوں میں تکلیف تو زیادہ ہوتی تھی۔ مگر گاؤں اور قصبات کے باشندوں کو ایسی گاڑیاں بہت مناسب رہتی تھیں۔ اول تو ہر اشٹیشن پر رکنے

کی وجہ سے سواریاں آرام سے چڑھ اتر سکتی تھیں پھر یہ کہ ان گاڑیوں کی تعداد بھی خاصی تھی جس کی وجہ سے ٹرین میں زیادہ رش بھی نہیں ہوتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ گزر چکے تھے غالباً کوئی اسٹیشن آنے والا تھا گاڑی کی رفتار کچھ کم ہو گئی تھی مگر دیانند نے کمال مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے اسی وقت ٹرنک کا تالا کھول دیا بعد ازاں اس کا بھاری بھرکم ڈھکن اٹھا دیا اب وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ میں حیرت سے اس نوجوان کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے قریب رک کر پہلے تو ایک نظر مسکرا کہ میری جانب دیکھا پھر مجھے دونوں ہاتھوں پر لاش کی مانند اٹھالیا۔

عجیب بے بسی کا عالم تھا وہ بھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اب وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے مگر صرف سوچ کر رہ گیا۔ اس کم بخت سگریٹ نے مجھے زندہ لاش میں منتقل کر دیا تھا۔ دیانند نے مجھے آہستہ سے صندوق میں لٹا دیا یہ صندوق یوں لگتا تھا جیسے میرے ناپ سے ہی بنایا گیا تھا۔ جب نوجوان مجھے لٹا کر ہٹ گیا تو پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میرے برابر کوئی دوسرا جسم بھی موجود ہے۔

میں کسی گوشت پوست کے انسان کے قریب ہی بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا برابر والے جسم کی گرمی اور ساخت کا اندازہ اس قربت سے واضح ہو رہا تھا اور میں یہ جان چکا تھا کہ یہ بھی میری طرح کوئی اس بلا کا شکار ہے۔

”کاش اس وقت میں آزاد ہوتا ----- میرے سامنے اس دبلے پتلے لیکچرار کی کیا حقیقت تھی میں اسے دو ہاتھوں میں سیدھا کر دیتا ---- مگر وائے ناکامی کی کہ ----- میں تو ہل جل بھی نہیں سکتا تھا۔

دیانند نے ٹرنک کا ڈھکنا بند کر کے پھر قفل لگا دیا۔ ٹرین اب کافی آہستہ ہو چکی تھی وہ شاید رکنے والی تھی دھچکے کم ہوتے ہوتے نفی کی حد تک رہ گئے تھے۔ اور اب یوں لگتا جیسے گاڑی پانی پر تیر رہی ہو۔ پھر معمولی سا دھچکا لگا اور زنجیریں بجنے کی آواز پیدا ہوئی گاڑی کسی اسٹیشن پر کھڑی ہو گئی تھی۔

عجیب و غریب صندوق تھا وہ بھی۔ آج بھی سوچتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے۔ حالانکہ میں اس میں بند تھا اور بے حس و حرکت پڑا ہوا

تھا اس کے باوجود کسی قسم کی گھٹن کا احساس نہیں تھا معلوم نہیں کس طرف سے اس اندھیری گور میں تازہ ہوا آ رہی تھی بہرحال تاریکی دل کو ہولائے دے رہی تھی لیکن خوف کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ دوبارہ جب ٹرین آگے روانہ ہوئی تو میں کسی قدر مطمئن ہو چکا تھا۔ میں نے تن بہ تقدیر حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور ہر مصیبت جھیلنے کے لئے خود کو آمادہ کر چکا تھا۔

دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ٹرنک کا تالا آواز کرنے لگا۔ دیانند نے قفل کھول دیا تھا۔

ٹرنک کا دروازہ کھلتے ہی تازہ ہوا اور روشنی بکس میں دوڑ آئی میں نے دیکھا دیانند کے بجائے ایک نہایت حسین جمیل دوشیزہ ٹرنک پر جھکی ہوئی اپنے نازک ہاتھوں سے مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی خوبصورت اور باریک ساڑی میں اس نوجوان لڑکی کا سرخ سپید جسم کندن کی طرح دمک رہا تھا اس نے گلابی ساڑی کے ساتھ گلابی کامدانی کا بلاؤز پہنا ہوا تھا اور دلہن کی طرح زیورات سے آراستہ تھی اس کے جسم سے پھوٹتی ہوئی سوندھی خوشبو میرے دل و دماغ کو تازہ کر رہی تھی وہ دلکش انداز میں مسکراتی جا رہی تھی۔

مجھے اس نے با آسانی اس قبر سے نکال کر پھر سے برتھ پر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ اور ایک بار پھر سے ٹرنک کا قفل لگانے لگی۔ کمپارٹ میں اب بھی میرے اور اس کے علاوہ کوئی تیسرا پسنجر نہیں تھا۔ میں نے دیکھا میرا اور دیانند کا سامان جوں کا توں رکھا تھا۔ بھوری آنکھوں والی یہ دوشیزہ دیانند کی بہن معلوم ہوتی تھی۔

اب میں سخت حیران تھا کہ چند منٹ قبل اسی کمپارٹ میں دیانند موجود تھا اچانک وہ کہاں چلا گیا۔ اور یہ دوشیزہ اتنی جلدی کہاں سے آ گئی؟۔ بالفرض وہ پچھلے اسٹیشن پر سوار ہوئی تھی تو اس کا سامان کہاں ہے اور کیا وہ بالکل تنہا سفر کر رہی ہے؟۔ یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ تنہا سفر کر رہی ہے تو پھر دیانند کہاں گیا؟۔ اگر دیانند کے لئے یہ سوچا جائے کہ وہ پچھلے اسٹیشن پر اتر گیا تھا تو اس کا سامان کمپارٹ میں کیوں ہے؟

پھر میں غور سے اس دوشیزہ کو دیکھنے لگا جو اس سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی جہاں دیانند بیٹھا تھا وہ .... اچانک میرے دل نے کہا ---- یہ تو دیانند ہی ہے بالکل وہی نقش و نگار ہیں

وہی آواز' فرق صرف لباس اور بالوں کا ہے۔ پہلے دیانند سر پر ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا اور سوٹ میں ملبوس تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے سامنے والی بالائی برتھ پر گہرے رنگ کا وہی سوٹ رکھا ہوا دیکھا جو دیانند نے پہن رکھا تھا۔

"کیا سوچ بچار ہو رہا ہے؟" دوشیزہ نے مسکرا کر کہا اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا آواز میں پہلے بھی سن چکا تھا ----- اچھا تو یہ دیانند ہی ہے نہیں' بلکہ یہ وہ عورت ہے جو پہلے دیانند بن کر مجھ سے متعارف ہوئی تھی اور مجھے پوریاں کھلائی تھیں اس کے بعد سگریٹ ----- اوہ کس قدر عجب تھی وہ سگریٹ' میرے لب ہل بھی نہ سکے حالانکہ میں دنیا جہاں کی باتیں سوچ رہا تھا۔ دوشیزہ اب تک میری جانب میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

میری نگاہوں میں ہزاروں سوالات تھے مگر اس کے بشرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ نہیں بتانا چاہتی پھر وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس بار لڑکی نے برتھ پر رکھا ہوا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر میرے قریب آ گئی اس کے دوسرے ہاتھ میں ماچس دبی ہوئی تھی۔

لڑکی نے ایک سگریٹ جبراً میرے ہونٹوں میں دبا دی حالانکہ میں ہرگز دوبارہ مصیبت کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا مگر اس وقت میرا کوئی عمل میرے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔

ڈبہ پھر سے برتھ پر رکھ کر اس نے ماچس جلائی اور میرا سگریٹ سلگا دیا۔ غیر ارادی طور پر میں سگریٹ کے کش لینے لگا اس بار بھی پہلا کش لیتے ہی میرا سارا جسم سنسنا گیا اور تیسرا کش لیتے ہی مجھ سے بیٹھا رہنا دوبھر ہو گیا۔ میں اب تک برتھ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا مگر اب لیٹنے کے سوا چارہ نہ تھا میرا دماغ گھوم رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے پوری گاڑی پھرکنی کی مانند گولائی میں چکر کھا رہی ہے۔

نہ معلوم کب تک یوں ہی بے سدھ پڑا رہا۔ دوبارہ جب آنکھ کھلی تو لڑکی کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کیں۔

"اٹھئے ---- اب صبح ہونے والی ہے" اس نے اپنا نرم و نازک بدن میرے جسم سے

مس کر کے کہا۔

اس وقت میری حالت دیدنی تھی۔ میرے لئے یہ سب کچھ ایک خواب کی کیفیت سے زیادہ نہیں تھا۔ ایسا خواب جس میں کبھی لرزا دینے والے واقعات سامنے آتے ہیں اور کبھی اتنے رومانی مناظر کہ انسان خود پر قابو نہ رکھ سکے۔

یہ منظر اتنا ہی جذباتی تھا کہ میں بے اختیار ہو سکتا تھا مگر ذہن پر گزشتہ واقعات کا غبار چھایا ہوا تھا۔ فی الحقیقت میں اب تک سخت خوفزدہ تھا یہ سارے واقعات میرے نزدیک بالکل غیر فطری تھے اور میں دل ہی دل میں اس کو بد روح سمجھ بیٹھا تھا جس نے اپنی شیطانی طاقت سے مجھے مفلوج کر دیا تھا اور خدا جانے مجھ سے وہ کیا کام لینا چاہتی ہے۔ ضرور کوئی نازیبا حرکات کی مرتکب ہو گی اور مجھے بھی ایسے ہی کسی گورکھ دھندے میں الجھائے گی ---- یہ سوچ کر میں جان چھڑانے کی فکر میں تھا مگر میرے حواس پر اس حسین قربت کا اثر بھی ہو رہا تھا لڑکی کے لباس سے خوشبو کے بھبکے میری ناک میں داخل ہو رہے تھے اس نے اپنے نصف جسم کا سارا بوجھ میرے بدن پر ڈال کر مجھے از خود رفتہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی تاہم میں خود پر جبر کر کے اپنے کو سنبھالے ہوئے تھا۔

اچانک لڑکی نے اپنا خوب صورت منہ میرے قریب لا کر پیار سے کہا۔

"گوتم بابو ---- کیا ابھی اور سونے کا وچار ہے دیکھو صبح ہونے والی ہے پورب میں پو پھٹنے لگی ہے" میں نے ہاتھ اٹھانا چاہا اور یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ اب میرا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے پورے جسم کو ایک دم سے اس لڑکی سے الگ کر لیا۔ اس عجلت کی وجہ سے لڑکی کا سر برتھ سے ٹکرا گیا تھا اور خود میرے بھی ہلکی سی چوٹ آئی تھی۔ مگر پھر سے تندرست ہونے کی خوشی میں مجھے اس چوٹ کا رتی بھر احساس نہیں ہوا۔

"تم کون ہو۔ اور یہ تم مجھے گوتم بابو کیوں کہہ رہی ہو!" پہلی بار میں نے خوفزدہ لہجے میں اس سے کہا۔

"میں تمہاری دھرم پتنی رادھا ہوں۔ راجن گڑھ کے پنڈت رام دیال کی بیٹی۔ اور پھر رک کر بولی۔" اور تم میرے پتی دیو گوتم بابو پنڈت کشن لال کے پتر' راجن گڑھ سے چار میل دور گومتی کے کنارے تمہارا گاؤں اور میری سسرال ہے۔ تم تو اس کا نام بھی

بھول گئے ہو گے۔ خیر میں بتاتی ہوں اس گاؤں کا نام ہے نرائن پور ------ یہ کانپور سے صرف دو میل دور ہے اب تو وہ بھی شہر سے مل گیا ہے۔ یہاں کی آبادی میں بھی زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ گومتی کے کنارے پر آباد ہونے کا کارن یہاں ہر وقت یاتریوں اور اشنان کرنے والوں کا آنا جانا رہتا ہے پھر کنارے پر بنے ہوئے مندر اور شمشان یہ سب گاؤں کو شہر بنانے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

"یہ بکواس ہے فراڈ"۔ میں نے کھڑے ہو کر کہا---- میں گوتم بابو نہیں ہوں۔ اور کچھ بتاؤں یہ کہ میرے گاؤں کا نام نرائن پور نہیں بلکہ میں 'مارہرہ کا باشندہ ہوں"

میں نے نہایت جلے کٹے لہجے میں کہا تھا مگر رادھا مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ برتھ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی' بے اختیار چوڑیاں اور زیورات سے لبریز گوری بانہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں۔

میں نے احتجاج کے طور پر ان بانہوں کو الگ کرنا چاہا مگر نرم نازک ہاتھ اس وقت آہنی سلاخوں کی مانند سخت ہو گئے تھے۔

"تم آخر کیا بلا ہو؟---- میں نے زچ ہو کر کہا "اور مجھ سے کیا چاہتی ہو۔"

"صرف ایک کام کے لئے تم سے چند کام لینے ہیں مگر ایک شرط پر میں تمہیں اس کا معاوضہ دوں گی اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر تم کام کے بدلے معاوضے میں رقم چاہو گے تو دے دی جائے گی اس صورت میں تمہیں میرے جسم سے کوئی مطلب نہیں ہو گا۔"

"لیکن" ---- میں نے اس کی بانہیں ہٹا کر کہا۔ "پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو پھر یہ کہ اس کام کے صلے میں مجھے کیا معاوضہ دیا جائیگا؟ ہاں' میں ایک بات صاف طور سے بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں شادی شدہ آدمی ہوں اور تعلیم یافتہ بھی۔ میری بیوی بہت خوبصورت ہے اور شادی کو صرف ایک سال ہوا ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ تم جان لو میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میں تم سے جسمانی رشتہ ہرگز نہیں رکھنا چاہتا بلکہ میں تو اپنے گھر جانا چاہتا ہوں"

رادھا بڑے اطمینان سے مسکرا رہی تھی پھر اس نے ایک لفظ کہے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور باتھ روم کی طرف چل دی باتھ روم کا دروازہ کھلا تو سامنے لگے ہوئے شیشے میں مجھے

اپنی شکل نظر آئی' اپنی شکل دیکھ کر ایک دلدوز چیخ میرے منہ سے نکل گئی میرے سامنے اپنے وجود کی بجائے ایک دوسرا جسم موجود تھا جس سے میری کوئی مناسبت ہی نہیں تھی اب میرے سر پر ایک چھوٹی سی چوٹی بھی تھی جیسے ہندو رکھتے ہیں اس کے علاوہ چہرے کے نقش و نگار جسمانی ساخت حتیٰ کہ قد میں' بھی فرق آ چکا تھا۔

میرا دماغ اس وقت بھی میرا ہی دماغ تھا مگر جسمانی طور پر میری حالت یکسر بدل گئی تھی۔

"اوہ" میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ رادھا اب تک میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ پھر میں نے اپنے شانوں پر اس کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔ سر اٹھا کر دکھ بھری نظروں سے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اب رادھا کی نگاہوں میں بلا کی شفقت نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور میں دھیرے دھیرے اٹھ کر اس کے برابر ہی کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر محبت پاش نظروں سے میری طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

"سنو جی ------ میں آپ کو زیادہ کشٹ نہیں دوں گی آپ کیول ایک ماہ اپنی زبان بند رکھنے کا وعدہ کریں' اس ایک ماہ میں آپ کے لئے بہت سی عجیب باتیں ہوں گی مگر ان کا سمبندھ آپ کی ذات سے نہیں ہو گا اور نہ آپ کو کوئی کشٹ بھوگنا پڑے گا۔"

"مگر رادھا دیوی" ------ میں نے پہلی بار اس کا نام لیا۔ اس بارہ وہ کھل اٹھی تھی۔ "یہ کیا اسرار ہے کہ میں دماغی طور سے"

"رادھا نے میری طرف بات کاٹ کر کہا۔ "ان باتوں کے لئے ابھی سے من میں اندیشوں کو جگہ مت دو اگر دیکھنا چاہتے ہو تو آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چابیاں سنبھالتی ہوئی ایک بار پھر ان برتنوں کے درمیان آ گئی جہاں پر اسرار بڑا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اس نے قفل کھولا اور جب ڈھکنا اٹھایا تو میرے لئے ایک اور خوفناک منظر موجود تھا۔

بکس میں رکھا ہوا انسانی جسم میرا اپنا جسم تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اسے چھو کر دیکھا۔ مگر وہ جسم تو بالکل ٹھنڈا تھا بالکل مردہ ------ حالانکہ وہ مکمل میرا جسم تھا میرا لباس پہنے ہوئے۔

"یا اللہ" ——— یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں زندہ بھی ہوں اور میرے سامنے میرا فوت شدہ جسم بھی موجود ہے وہ جسم ایک ناقابل تردید حقیقت کے روپ میں میرے سامنے تھا۔

میں نے خوف بھری آنکھوں سے رادھا کی طرف دیکھا۔ مگر رادھا نے اسی وقت مسکرا کر ڈھکنا بند کر دیا اور پھر سے قفل لگا دیا۔ جب ہم واپس اپنی سیٹوں کی طرف آ رہے تھے تو گاڑی آہستہ آہستہ ہو گئی تھی شاید کوئی اسٹیشن نزدیک تھا اس بار بھی ہم کھڑکی کے قریب والی دو سیٹوں پر بیٹھے جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھیں۔

صبح کاذب ہو چکی تھی اندھیرا چھٹنے لگا تھا اور میں سوچ رہا تھا آج کا سورج میرے لئے نہ معلوم کیا کیا مصائب لے کر آ رہا ہے۔

پھر میں نے اپنے دل سے چند سوالات کئے میں نے کہا۔ "کیا میں اس بلا سے بچ سکتا ہوں" جواب میں دماغ نے کہا "ہرگز نہیں"

پھر میں نے سوچا "کیا میں اس خوبصورت بلا کر دھوکا دے کر نکل سکتا ہوں اور اگر نکل گیا تو کیا سعیدہ (میری بیوی) اور دیگر گھر والے مجھے پہچان سکیں گے' اپنا سکیں گے؟۔"

اس بات کا جواب بھی نفی میں تھا۔ پھر میں نے سوچا "اچھا تو اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"قسمت پر بھروسہ کر کے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہئے" ——— دماغ نے جواب دیا۔

میں بے اختیار ہو کر دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگا کہ کیوں کانپور جانے کا قصد کیا۔ خالہ زاد بھائی کی شادی کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں تھا۔ مگر دماغ نے اس کے خلاف بھی مجھے ٹوکا۔

"کیا معلوم تھا کہ ایسے واقعات سے سابقہ پڑے گا اور پھر دماغ کی اس بات کی دل نے بھی تصدیق کر دی۔ یہ کوئی نسبتاً بڑا اسٹیشن تھا یہاں گاڑی نصف گھنٹے تک کھڑی رہی پلیٹ فارم پر کافی چہل پہل تھی اور گاڑی رکتے ہی چند مسافر ہمارے ڈبے' میں بھی آ گئے تھے یہ لوگ ہم سے کافی دور ہٹ کر الگ بیٹھے تھے شاید رادھا کو دیکھ کر ان لوگوں نے یہی

سوچا ہو کہ میں اپنی دلہن کو رخصت کرا کے لا رہا ہوں رادھا لباس اور زیورات کی وجہ سے دلہن معلوم ہو رہی تھی۔

میں نے ایک باوردی چائے والے کو قریب بلا کر چائے اور ناشتا لانے کو کہا۔ بیرا فوراً ہی آرڈر لے کر چلا گیا۔

اب رادھا نے دوسرے لوگوں کی آمد کی وجہ سے تھوڑا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا وہ اس وقت شرمیلی گڑیا سی لگ رہی تھی ذرا دیر پہلے کی رادھا اور اس دلہن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

بیرا چائے اور ناشتا لے آیا۔ میں نے ضد کر کے اپنے ساتھ رادھا کو بھی ناشتا کرایا لیکن وہ بری طرح شرما رہی تھی جب بیرا ترین لے جا رہا تھا تو میں نے اسے نوٹ دے کر سگریٹ منگایا وہ فوراً ہی مطلوبہ سگریٹ کے چند پیکٹ دے گیا۔

کانپور اب بھی بہت دور تھا۔ ایک بار تو میں نے سوچا کیوں نہ کسی بڑے اسٹیشن سے میل گاڑی پکڑ لی جائے تاکہ دن بھر کی جھک جھک سے نجات مل جائے مگر رادھا اس بات پر آمادہ نہیں تھی مجبوراً مجھے اس ٹرین میں سفر جاری رکھنا پڑا۔

اب میرے لمبے چوڑے جسم پر بوسکی کی قمیض اور سفید باریک سی دھوتی تھی۔ کانوں میں راجکمار کی مانند سفید ہیرے بھی پڑے ہوئے تھے۔ اس سجے دھجے میں بلا کی قدامت تھی اور یہ جسم میرے لئے بالکل نیا تھا۔ میں جو کلین شیو رہنے کا عادی تھا اب میرے چہرے پر ٹھاکروں کی مانند بڑی بڑی مونچھیں اگی ہوئیں تھیں۔

فروری کی درمیانی تاریخیں تھیں موسم اتنا خوشگوار تھا کہ خود بخود طبیعت میں امنگیں پیدا ہو رہی تھیں نہ جانے کیوں اب میں اپنی سابقہ زندگی سے دور سا ہو گیا تھا اور پوری طرح رادھا کی طرف راغب نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے رادھا میری جنم جنم کی ساتھی ہے اور یہ حالت ناشتے کے بعد سے شروع ہو گئی تھی۔

دھیرے دھیرے میں سفر سے لطف اندوز ہونے کے لئے رادھا کو چھیڑنے لگا۔ رادھا نئی بیاہی دلہنوں کی طرح حجاب سے کبھی مسکرا دیتی کبھی گرم نگاہوں سے دیکھ لیتی گاہے بہ گاہے پیار کی ایسی میٹھی نظر میرے چہرے پر ڈالتی کہ مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ اس

کے باوجود میں اپنی سیٹ سے چپٹا ہی رہا۔

"اس سوٹ کا کیا کرنا ہے؟" میں نے رادھا سے اس پر اسرار سوٹ کے بارے میں پوچھا جو اب تک بالائی برتھ پر رکھا تھا۔ ایک منٹ تک رادھا نے جواب نہ دیا۔ مگر جب میں نے دوبارہ پوچھا تو وہ بولی۔

"اسے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لو ناتھ" اس کے آواز میں بلا کی خود سپردگی موجود تھی۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی اور تازہ اخبار دیکھنے لگا جو پچھلے اسٹیشن سے خریدا تھا۔

دوپہر سے پہلے ایک ایک کر کے تمام مسافر اتر گئے اور ہم لوگ ایک بار پھر تنہا رہ گئے ——— ہمارا سفر تو شام تک تھا اور یہ مصیبت بہرحال گزارنی ہی تھی۔ تنہائی ملی تو میں نے پہلی بار پیار سے رادھا کا ہاتھ تھاما۔ اس نے روٹھے ہوئے انداز میں میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "بابو جی" ابھی سے وعدہ خلافی شروع کر دی۔

شرمندہ ہو کر میں نے رادھا کی کلائی چھوڑ دی۔ مگر وہ اپنی سیٹ سے اٹھ چکی تھی۔ ہم دونوں قریب والی ایک لمبی برتھ پر ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ گئے اس طرح مجھے کافی سرور سا آ رہا تھا رادھا کے جسم کی گرمی نہایت لطیف تھی۔

"ایک بات بتاؤ گی؟۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کو اٹھا کر کہا۔

شرم سے رادھا کی آنکھیں بند ہو گئیں وہ اس وقت بلا کی حسین لگ رہی تھی مگر میں اپنے وعدے پر قائم تھا۔ "تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو ——— اور میں اپنے بارے میں بھی' تاکہ میں اپنے ذہنی خلفشار سے بھی بچ جاؤں اور تمہارے لئے کار آمد آدمی ثابت ہو سکوں۔"

"آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی بابو جی میں ابھی یہی بات کہنے والی تھی۔"

میں خاموش ہی رہا میری توجہ دیکھ کر ذرا توقف کے بعد رادھا نے کہا۔

"بہت دن پہلے کی بات ہے' یوں سمجھ لو جگ بیت گئے نرائن پور اس سے کانپور سے بیس میل دور ایک بڑا شہر تھا۔ یہ پنڈت رام نرائن کی ریاست تھی اور اس ریاست

میں دو قومیں آباد تھیں پنڈت اور ٹھاکر' چونکہ پنڈتوں کی حکومت تھی اس لئے ریاست کے ٹھاکر ان سے دبے رہتے تھے۔ ریاست میں کبھی جھگڑا فساد نہیں ہوتا تھا۔

ہم نے جس جنم میں اس ریاست میں آنکھ کھولی اس سے تمہارے پتا کشن لال گدی پر براجمان تھے تم ان کے اکلوتے بیٹے اور ریاست کے راج کمار تھے میں نے بھی تمہاری ریاست کے ایک زمیندار پنڈت رام دیال' کے گھر میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کے چار بیٹے تھے اور میں اکلوتی بیٹی۔ بڑے لاڈ پیار سے میری پرورش ہوئی ریاست میں ہمارا بڑا سمان تھا راجہ سے ہماری رشتے داری ہوتی تھی اسی کارن ہمیں ایک جاگیر ملی ہوئی تھی۔

پتا جی بوڑھے ہو گئے تھے اور جاگیر کی دیکھ بھال بھائیوں نے شروع کر دی تھی۔ اب میں بھی سیانی ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ہندو رسم و رواج کے مطابق لڑکیوں کی شادی باہر ہوا کرتی تھی۔ ہندوؤں میں اب بھی یہی طریقہ رائج ہے یہ لوگ ذرا سی بھی رشتے داری' نکل آنے کی صورت میں بیٹی نہیں دیتے۔

لیکن بابو جی۔ میرے ساتھ قسمت نے ایک عجیب مذاق کیا۔ ایک دن جب ریاست میں زبردست میلہ لگا ہوا تھا اور میں سہیلیوں کے ساتھ کھیل تماشے دیکھتی پھر رہی تھی ایک جگہ دور سے آئے ہوئے بہادروں کا دنگل ہو رہا تھا۔ یہ دنگل کشتی کا دنگل نہیں تھا بلکہ ہتھیاروں سے جنگ لڑنے کا دنگل تھا اور اسی دن پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا یعنی راج کمار گوتم بابو کو ——— انہوں نے ایک ایک کر کے تمام یودھاؤں کو شکست دے دی اور بس اسی دن وہ میرا من بھی جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔

میں آخر تک تماشا دیکھتی رہی اور جب راجکمار وجے پاکر محلوں کی طرف جانے لگا تو میں نے انہیں راستے میں روک کر بدھائی دی۔ میری نگاہیں ان کے چوڑے چکلے سینے اور لمبے بازوؤں پر تھی ان کے لمبے بال اور بڑی بڑی آنکھیں میرا من ہر لے گئیں۔ میری کلپنائیں راجکمار سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ وہ میرے بالکل قریب آ کر بولے۔

"سچ بتا رادھا کیا یہ سچ ہے کہ تو نے مجھے بدھائی دی ہے اور یہ جو تیری نظریں ———<

میں نے بات کاٹ کر کہا "مہاراج نظروں کی بات چھوڑو ذرا میرے من سے

پوچھو" اتنا کہہ کر بھاگ کھڑی ہوئی لاج کے مارے اور کوئی شبد منہ سے نہ نکل سکا۔

میری سکھیاں ذرا دور تھیں میں پھران میں جا ملی مگر راج کمار بہت دیر تک وہیں کھڑے میری طرف دیکھتے رہے۔ ہماری حویلی راج محل کے قریب تھی اس دن کے بعد میں اکثر راج کمار سے ملنے محل جانے لگی۔ میرے وہاں جانے میں کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ ہماری قرابت داری پہلے ہی تھی پھر ہم جاگیردار بھی تھے اور پڑوسی بھی۔

محل میں کئی بار ایسا ہوا کہ راجکمار مجھے تنہائی میں مل گئے۔ ایک شام' اف کتنی رنگین تھی وہ شام' دن بھر برکھا ہوتی رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے کسی دکھیارے کے آنسو ہیں جو تھمتے ہی نہیں مگر شام سے پہلے بارش تھم گئی موسم بہت سہانا ہو گیا تھا۔ میرے من میں راج کمار کی یاد کروٹیں لینے لگی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں اسی وقت ان سے ملنے راج محل چلی گئی اتفاق کی بات وہ بھی اپنے محل کے باہر مل گئے۔ اس دن میں نے پیلا بسنتی جوڑا پہنا ہوا تھا اور اس لباس میں میرا شریر سرسوں کے پھولوں کی مانند لگ رہا تھا۔

اس شام پہلی بار میرے ہونٹوں نے امرت رس چکھا تھا اور بس اس رات کے بعد میں راج کمار کے پریم میں دیوانی ہو گئی۔ ہمارا پریم زیادہ دن تک بستی والوں کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ریاست کا ہمارے بعد سب سے بڑا زمیندار ایک ٹھاکر پرتاپ سنگھ تھا۔ پرتاپ سنگھ کی حویلی بھی ہمارے قریب میں تھی۔ اس کی بہنیں میری سکھیاں تھیں اور اکثر ہماری حویلی میں آتی جاتی رہتی تھیں' مگر جب سے میں نے راجکمار کو دیکھا تھا میرا من کہیں نہیں لگتا تھا میں جب بھی موقعہ ملتا راج محل نکل جاتی۔

ایک رات جب میں اپنی حویلی کی طرف آ رہی تھی تو پرتاپ سنگھ راستے میں مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"ارے رادھا ——— اتنی رات گئے کہاں سے آ رہی ہے؟" میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا وہ لپک کر میرے سامنے آ گیا اس طرح میرا راستہ رک گیا۔ میں نے ناراض ہو کر کہا۔

"دیکھ پرتاپ ——— میرے راستے سے ہٹ جا"

"ورنہ اس نے میری بات کاٹ کر طنزیہ کہا "ورنہ کیا ——— راج کمار سے کہہ کر

کولہو میں پلوا دے گی۔؟"

اس کی باتوں پر غصہ تو مجھے بہت آیا تھا مگر میں نے ضبط سے کام لیا اور خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"پرتاپ بھیا ——— مجھے جانے دو ماتا جی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"اچھا جی ہم بھیا ہو گئے" ——— جل بھن کر بولا "اور وہ راج کمار تیرا کون ہے؟ اس کے پاس رات رات بھر رہے تو۔ تیری ماتا جی ناراض نہیں ہوتیں اور ہمارے ذرا روکنے سے ناراض ہو جائیں گی۔؟"

وہ یہ کہتا ہوا میرے بالکل قریب آ گیا تھا اس کی آنکھوں میں شیطان ناچ رہا تھا اور میں دل ہی دل میں سہمی جا رہی تھی۔ اتفاق سے کچھ دور پر آہٹ ہوئی تو پرتاپ سنگھ چلا گیا ورنہ اس دن رام جانے وہ پاپی کیا کر گزرتا۔

میں نے یہ بات کسی سے نہیں کہی۔ میں نے سوچا اگر کہوں گی تو میری بدنامی ہو گی ہاں! اب میں بہت احتیاط کرنے لگی تھی میں زیادہ دیر تک راج محل میں بھی نہیں رکتی تھی کئی بار راجکمار نے مجھ سے شکایت کی مگر میں ہنس کر ٹال گئی۔

پرتاپ سنگھ میرے پیچھے پڑ گیا تھا نہ معلوم کیسے وہ سمجھ لیتا تھا کہ آج میں راج کمار سے ملنے جاؤں گی کئی بار اس نے میرا پیچھا کیا مگر ہر دفعہ بھگوان نے میری آبرو بچائی۔

ماتا پتا کو میری شادی کی چنتا لگ گئی تھی پھر ایک دن ہماری حویلی میں بہت سے مہمان اکٹھے ہوئے۔ میں نے ان لوگوں میں پرتاپ سنگھ کو بھی دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ غرور سے مونچھوں کو بل دینے لگا تھا۔

میری سکھیوں نے بتایا "پگلی جانتی ہے یہ مہاشے کیوں آئے ہیں۔؟" "اب تیرے گھر والے تجھے بھاری سمجھنے لگے ہیں تجھے گھر سے نکالنا چاہتے ہیں یہ لوگ تجھے دلہن بنا کر ڈولی میں بٹھا کر دور لے جانے کے آئے ہیں۔"

میں نے ان باتوں کو سکھیوں کا مذاق سمجھا مگر یہ مذاق کی بات نہیں تھی ان لوگوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ماتا جی نے ان باتوں کی تصدیق کر دی انہوں نے مجھے ایک روز گلے لگا کر کہا۔

"میری بیٹی تو جانتی ہے' بیٹی کسی کی سدا گھر نہیں رہتی اس کا اصل گھر سسرال ہی ہوتی ہے اب تو جوان ہو گئی ہے ہم نے تیرے لئے ایک چاند کا ٹکڑا تلاش کیا ہے لڑکا ملک سے باہر ہے لیکن ہم تگن دینے والے ہیں تگن میں لڑکے کی تصویر بھی ضرور آئے گی۔"

اس خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا اب تک میں نے راجکمار سے بچھڑنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا مگر اب ایسی صورت سامنے آ گئی تھی کہ نہ کچھ کہتے بنتی تھی اور نہ چپ رہتے۔ تنہائی میں رو رو کر میں ہلکان ہو گئی دوسرے دن راجکمار سے بات کی۔ اسے بھی اس رشتے کا پتا چل گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ رشتہ پرتاپ سنگھ کی کوشش سے ہو رہا ہے اس دن پہلی بار میں نے راجکمار کو پرتاپ سنگھ کی حرکتوں کے بارے میں بتایا۔ وہ بہت ناراض ہوا کہ یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی پھر ہم بہت دیر تک اس مصیبت سے بچنے کے لئے تدبیریں سوچتے رہے لیکن بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی راجکمار اپنے رشتے کی بات اس لئے نہیں کر سکتا تھا کہ ہماری اس سے رشتے داری تھی ایسی صورت میں شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے اپنے پریمی سے صاف شبدوں میں کہہ دیا تھا "میں جان دے دوں گی مگر اپنے شریر کو کسی غیر مرد کا ہاتھ نہیں لگنے دوں گی۔"

مگر تقدیر کی خوبی میرے ارادوں کا مذاق اڑا رہی تھی۔

ایک ماہ بعد تگن طے ہوا۔ اتفاق سے میرا ہونے والا پتی تگن کے سمے وطن واپس آ گیا۔ ابھی تک ہمارے خاندان والوں نے بر نہیں دیکھا تھا اس لئے دولہا کو تگن کے سمے ریاست میں طلب کیا گیا مگر قاعدے کے مطابق وہ ہمارے گھر نہیں ٹھہر سکتا تھا اس لئے پرتاپ سنگھ نے دولہا والوں کو' اپنی حویلی میں ٹھہرایا پرتاب سنگھ کی ان لوگوں سے پرانی جان پہچان تھی۔

میں نے رو رو کر اپنی جان ہلکان کر لی تھی میرا شریر پیلا پڑ گیا تھا مگر گھر والوں نے اس بات کو عام لڑکیوں کا دکھ سمجھا۔ ادھر راجکمار غم سے دہرا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی زبان سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا مگر اپنے سامنے اپنی ریاست سے میری ڈولی اٹھتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہہ دیا تھا ——— "میں ضرور کوئی تدبیر کروں گا" بس اسی بات سے میری ہمت بندھی ہوئی تھی۔ تگن کا سمے آ گیا تھا۔ دولہا والے کافی دور سے آئے تھے وہ

لوگ دوپہر کو آ کر پرتاپ سنگھ کی حویلی میں ٹھہر گئے شام کو سب لوگ اکٹھے ہوئے اور بڑی دھوم دھام سے تگن ہو گئی قاعدے کی رو سے ایک رات کے لئے میری رخصت کر دی گئی۔ دولہا والوں نے پرتاپ سنگھ کی حویلی کو ہی میری سہاگ رات کے لئے مناسب سمجھا۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ اس میں ایک کمرہ میرے لئے سجایا گیا۔ رات کو بہت دیر تک پرتاپ سنگھ کی بہنیں اور گاؤں کی دوسری لڑکیاں مجھے چھیڑتی رہیں میری آنکھ کے آنسو بند نہ ہوتے' تھے۔ بات بہت آگے بڑھ چکی تھی اب راجکمار کی طرف سے بھی مایوس ہو گئی تھی اب ہو بھی کیا سکتا تھا میں پرائی ہو گئی تھی اور آج رات کے بعد ——— میں اس قابل ہی کہاں رہونگی کہ راجکمار کو منہ دکھا سکوں" میں نے اپنے من میں سوچا پھر میں نے ایک بھیانک فیصلہ کر لیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ صبح کو گھر جا کر خود کشی کر لوں گی۔ اگر اس وقت میں دلہن بنا کر کمرے میں بند نہ کر دی گئی ہوتی تو اس سمے خود کشی کر گزرتی۔

میرا پتی واقعی بہت سندر تھا میں نے تگن کے سمے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی اس وقت مجھے تو آنسو بہانے سے فرصت ہی کہاں تھی بس ایک دو منٹ کی تھک کر چپ ہو گئی تھی۔

باہر ولایت میں رہ کر پتی کو شراب پینے کی عادت پڑ گئی تھی اور یہاں جب پرتاپ سنگھ سے ان کی ملاقات ہوئی تو وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ انہیں ایک بہترین ساتھی مل گیا ہے پرتاپ سنگھ ان سے چار ہاتھ لمبا نکلا۔ یہ دونوں حجلہ عروسی کے برابر والے کمرے میں بیٹھ کر شراب پی رہے تھے دولہا نے یہ کمرہ اسی لئے چنا تھا کہ بارات والوں کو اس کی برائی کا پتہ نہ چل سکے پھر اس نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ وہاں سے چپ چاپ دلہن کے پاس جاؤں گا۔ تمام دن اور آدھی رات تک بیٹھے بیٹھے میرا شریر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا مجبوراً ذرا دیر کے لئے مسہری پر لیٹ گئی زیورات بھاری کپڑوں اور پھولوں کی وجہ سے میں بہت تھک گئی تھی لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

نہ معلوم کس وقت میری آنکھ کھلی مگر اتنا معلوم تھا کہ رات کافی بیت چکی ہے کمرے میں گھپ اندھیرا ہے اور کوئی میرے شریر پر جھکا ہوا ہے میں نے سوچا "پتی دیو کو اب موقعہ ملا ہے اور وہ میری دنیا برباد کرنے آ گئے ہیں۔"

جب میں بالکل ہی بے بس ہو گئی تو روہانسو ہو کر بولی۔

"بھگوان کے لئے میری دو باتیں سن لو ——— میں تمہارے سامنے اپنے پاپ کا اقرار کرتی ہوں حالانکہ میرا شریر گنگا کی طرح پوتر ہے مگر میری آتما گندی ہو چکی ہے۔ اب میں ایک آتما دو آدمیوں کو کیسے دے سکتی ہوں میں راجکمار کو تم سے محبت کرتی ہوں اس کا پریم میری نس نس میں رچ بس چکا ہے میں اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔

میں چاہتی تو یہ شریر بھی گندہ ہو جاتا مگر ہم نے پریم کیا ہے۔ سچا پریم ہمارے پیار میں گندگی نہیں تھی راجکمار نے کبھی میرے شریر کو چھونے کی کوشش نہیں کی مگر اپنی آتما کی طرح میں اس شریر کو بھی ان کی امانت سمجھتی ہوں کیا تم اس بات پر بھی مجھے سویکار کر لو گے؟" یہ میرا آخری ہتھیار تھا اس سے اس نے پھر سے کمرے میں روشنی کر دی اور میں اپنے دولہا کو دیکھ کر چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ یہ پرتاپ سنگھ تھا۔

جب میں ہوش میں آئی تو اس پاکھنڈی نے بڑے گھمنڈ سے کہا۔

"دیکھا رادھا رانی ——— ہم نہ کہتے تھے ہم سے بچ کر کہاں جاؤ گی' جاؤ اپنے راجکمار کو بلا لاؤ اور مجھے سولی پر چڑھا دیا اپنے شرابی پتی سے شکایت کر دو جو برابر والے کمرے میں بے سدھ پڑا ہے"

میری اوپر سے قیامت گزر گئی۔ شاید میرے پتی دیو کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ صبح ہی ناشتا کئے بغیر چلا گیا۔ اس کے یکایک چلے جانے سے ریاست میں بڑا چرچا ہوا۔ اس کے ساتھ بھی فوراً ہی چلے گئے۔

تیسرے دن ہمارے گھر میں کہرام مچ گیا اس دن اطلاع آئی تھی کہ پتی دیو نے گنگا میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔

روتا پیٹنا رات تک ہوتا رہا اور جب سب لوگ تھک ہار کر سو گئے۔ تو میں نے اسی رات کو زہر کا پیالہ پی لیا۔"

رادھا اپنی داستان سنا کر رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا "لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ تم لوگ مر گئے اور اب پھر زندہ ہو؟۔

"سب کچھ ممکن ہے بابو جی" رادھا نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

"اب تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو؟۔ وہ بھی بتا دو" میں نے دوسرا پہلو اختیار کیا۔

"ان باتوں کا جواب آنے والا وقت دے گا۔" پراسرار انداز میں رادھا نے کہا۔

گاڑی پھر سے رکنے کے لئے آہستہ ہو رہی تھی اس لئے میں نے بھی اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

گاڑی ایک جنکشن پر رکی پہلی بار بڑا اسٹیشن دیکھ کر مجھے قدرے مسرت ہوئی' پلیٹ فارم پر اتر کر میں نے بک اسٹال کا رخ کیا اور چند کتابیں اور میگزین خرید لایا۔

ٹرین یہاں جم کر رہ گئی تھی اب دوپہر ہو چکی تھی اس لئے ہم نے کھانے سے فراغت پالی تاکہ کوئی پریشانی نہ ہو۔ ڈبے میں اب کافی رش ہو گیا تھا تاہم یہ کافی بڑی بوگی تھی اس لئے ہمارے قریب کوئی نہیں تھا ہم آزادی سے بات چیت کر سکتے تھے۔ لیکن اس وقت باتوں سے زیادہ مطالعے میں لطف آ رہا تھا۔

رادھا کے لئے میں ہندی کا رسالہ لے آیا تھا وہ اس میں لگ گئی تھی۔

ٹرین اس جنکشن سے چلی تو واقعی پسنجر بن گئی ہر اسٹیشن پر آنے جانے والوں کی بھیڑ لگی رہی اس لئے کانپور تک میں رادھا سے کوئی بات نہ کر سکا ہم لوگ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر رہ گئے۔

کانپور ابھی دور تھا کہ ایک بار پھر ڈبے میں ہم تنہا رہ گئے ذرا دیر بعد میں نے بدلی ہوئی رادھا کو دیکھا اب وہ تمام لباس اور زیورات اتار کر مغربی طرز کا لباس زیب تن کر چکی تھی پہلی بار میں نے اس کے ماڈرن بال دیکھ کر انتہائی حیرت کا مظاہرہ کیا یہ اس کا تیسرا روپ تھا۔

کانپور اسٹیشن پر ٹرین رات کو نو بجے لگی چونکہ دو گھنٹے لیٹ ہو گئی تھی۔ قلیوں سے سامان اتروا کر ہم باہر آئے رادھا اسٹیشن کے باہر غور سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ جب ہم ٹکٹ دے کر گیٹ سے باہر آئے تو ایک لمبا پل پار کر کے اس طرف آ نکلے جہاں رکشے اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں اب رادھا کے اختیار میں تھا اس لئے اپنی طرف سے میں نے کوئی پہل نہیں کی' دو منٹ گزرے تھے کہ ایک لمبی سی سیاہ رنگ کی شیور لیٹ ہمارے قریب آ کر رکی۔

بوڑھا ڈرائیور باہر آیا "رادھا بٹی" کہہ کر ہماری طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر رادھا کے چہرے پر رونق آگئی تھی اس نے آگے بڑھ کر کہا "آگئے بنواری چاچا؟"

"ہاں بٹی ——— راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ "بھلا کنور صاحب کی موجودگی میں ہماری بٹی کو کیا کشٹ ہو سکتا ہے"

"گھر پر تو سب راضی خوش ہیں" رادھا نے کار میں بیٹھ کر پوچھا میں اس سے پہلے بیٹھ چکا تھا۔

"ہاں ہاں بٹیا ——— سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اس دن تمہارے پتا جی کہہ رہے تھے رادھا بس آنے ہی والی ہے۔ اس کا تار تو آگیا ہے فنی کون بس ختم ہو گیا۔

"فنی کون" میں نے اور رادھا نے ایک ساتھ کہا۔ بوڑھا ڈرائیور ذرا سا سٹپٹا گیا پھر بولا۔

"کم بخت یاداشت بہت خراب ہو گئی ہے بڑھاپا ہے نا ——— شاید یہی کہا تھا یا کچھ اور بھئی وہ تم لوگ شادی کے بعد کیا مناتے ہو؟"

اب ہم سمجھے کہ یہ بڑے میاں ہنی مون کو فنی کون کہہ رہے تھے ہم دونوں ان کی سادگی پر بے اختیار ہنس دیئے۔

کار بازاروں سے گزر رہی تھی اور بھیڑ ہونے کی وجہ سے رفتار بہت سست تھی۔ اسی دوران رادھا نے سرگوشی میں کہا "دیکھو وہاں کسی سے زیادہ باتیں مت کرنا۔ میں اپنے بارے میں بتاؤں میں کچھ دن پہلے لندن سے تعلیم پا کر لوٹی ہوں اور ہماری شادی کو صرف دو ہفتے ہوئے ہیں۔ یہاں میرا میکہ اور تمہاری سسرال ہے اس جنم میں تمہاری دو سالیاں اور دو سالے ہیں تم رام پور کے رہنے والے ہو۔ اور تمہارا نام گوتم بابو ہے تمہاری ساس کا انتقال ہو چکا ہے۔ دونوں سالوں کی شادی ہو چکی ہے اور بڑی سالی شیلا کی منگنی طے پا چکی ہے۔"

میں نے تفصیلات ذہن نشین کر لیں اور پھر ہم لوگ خاموشی سے سفر طے کرتے رہے۔

شہر سے کچھ دور نکلتے ہی گومتی ندی کا خوبصورت اور لمبا پل آگیا اس پل کو پار

کرتے ہوئے میں نے گومتی کے کنارے مندر اور شمشان بنے ہوئے دیکھے ادھر بہت سے اشنان گھاٹ بھی تھے جہاں پختہ سیڑھیاں اور فرش بنے ہوئے تھے آبادی کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا مگر دس پندرہ منٹ تک موٹر فراٹے بھرتی رہی یہاں تک کہ بڑی بڑی کوٹھیوں کا علاقہ آگیا مگر اس طرف آبادی گھنی نہیں تھی کوٹھیوں کے درمیان کافی قطعات خالی پڑے تھے ان کوٹھیوں کے سامنے جنگلات کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا بہت سے کھیتوں میں مختلف قسم کی فصل کھڑی تھی ایک طرف پختہ اور نیم پختہ چھوٹے مکانات کا سلسلہ بھی تھا۔

رادھا کے گھر والوں سے ملاقات ہوئی تو دل خوش ہو گیا سب ہی تعلیم یافتہ اور بلند اخلاق لوگ تھے۔ ہر شخص گھل مل کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اپنے اپنے طور پر خاطر مدارت کر رہے تھے رادھا کی بہنیں رادھا کی طرح خوبصورت اور سلیقہ مند تھیں وہ بڑے ادب احترام سے ملیں مختصر یہ کہ اپنی معنوی سسرال کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

یہ کوٹھی جس میں رادھا کے والدین رہتے تھے اچھی خاصی قلعہ نما تھی دس بارہ کمروں اور کئی ورانڈوں پر مشتمل ہونے کے علاوہ لان، باغیچہ اور گیم کورٹ وغیرہ سبھی کچھ تھا۔

ہمیں کوٹھی کے ایک حصے میں دو کمرے جو نسبتاً الگ تھے دے دیئے گئے دن میں ہم الگ رہتے تھے مگر ہم نے سونے کے لئے ایک کمرہ منتخب کر لیا تھا۔ لیکن پہلی ہی رات میرے سامنے رادھا کی ایک عجیب و غریب شخصیت ابھر کر آئی۔

سب کو خدا حافظ اور شب بخیر کہہ کر جب ہم اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئے تو رادھا نے کہا۔ "بابو جی ---- اب ہمیں اپنا کام شروع کرنا ہے اس کی تفصیل سن لیجئے۔"

"یہاں ہمیں کئی آدمیوں کا خون کرنا ہے نہایت اطمینان سے" رادھا نے کہا ----" تمہیں حیرت ہو رہی ہے حالانکہ یہ بالکل سچ ہے۔ دراصل پرتاپ سنگھ ٹھاکر کے رشتے دار سب کے سب یہیں رہتے ہیں۔ انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے میں نے ایک جدید طریقہ کار اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔" ماڈرن لباس میں ملبوس رادھا اس وقت اینگلو انڈین لگ رہی تھی۔ اس نے ذرا سے توقف کے بعد کہا "ہمارا شکار ایک آدمی ہوا کرے گا۔ اس شخص کو پھانس کر ایک خاص جگہ تک لانا میرا کام ہو گا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی

ہو گی۔ اس کے بعد میں جو کچھ کہوں آپ کو اس پر عمل کرنا ہے اس طرح ہم ان ظالموں کا کام تمام بھی کر سکیں گے اور قانون کے سنگین ہاتھوں سے بھی بچ جائیں گے۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔" میں نے کہا---- "بہرحال میں تمہارے ساتھ ہوں جو کہو گی وہی کروں گا لیکن ایک درخواست ہے کہ مجھے جلدی چھٹی دے دینا۔"

"میں اس کا وعدہ کرتی ہوں۔ تمہارا شریر تمہارے کمرے میں محفوظ ہے بس جیسے ہی کام ختم ہوا تمہیں مکت کر دیا جائے گا۔"

"اچھا--- تو پھر آج کیا کرنا ہے؟" میں نے تیار ہو کر کہا۔

"آج تو صرف آرام کرنا ہے رادھا نے مسکرا کر کہا ہم دونوں خواب گاہ میں چلے گئے یہاں پہلے سے دو مسہریوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ حسب وعدہ میں نے رادھا سے کسی خواہش کا اظہار نہ کیا ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گئے۔

دوسرے دن رادھا اور اس کی بہنیں مجھے کانپور گھمانے لے گئیں مگر ہم دوپہر تک لوٹ آئے۔ طعام سے فارغ ہو کر میں آرام کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا مگر رادھا مجھ سے اجازت لے کر اپنے شکار کی تلاش میں نکل گئی۔

تیسرے پہر ہم نے چائے اپنے کمرے میں پی اس کے بعد وہ مجھے آج کے شکار کی تفصیل بتانے لگی۔

"ہمارا آج کا شکار پرتاپ سنگھ کا پوتا انوپ ہے حالانکہ یہ بوڑھا آدمی ہے اور پوتی پوتوں والا مگر میں نے اپنے جذبہ انتقام کو تسکین دینے کے لئے آج اس کا انتخاب کیا ہے۔"

"لیکن وہ رات کے وقت تنہا کھیتوں کی طرف کیسے آئے گا؟" میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

رادھا بے اختیار مسکرا دی پھر بولی "میں نے اس کی فطرت کا اندازہ کر لیا ہے اسے کیمیا بنانے کا شوق ہے بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے۔ میں نے جب اس سے کہا کہ سادھو مہاراج ہمیشہ رات کو ملا کرتے ہیں میں یہ کر سکتی ہوں کہ ان کھیتوں کے قریب

تک انہیں لے آؤں پھر تم خود ان سے بات کر لینا مگر وہ ایک وقت میں صرف ایک آدمی سے بات کرتے ہیں اور اگر کوئی پاس کھڑا ہو تو ہرگز منہ نہیں کھولتے۔ ان کا استھان' ایک جوہڑ کے کنارے ہے تو بوڑھا یہ سن کر میری خوشامد کرنے لگا اور رات کو اکیلے آنے پر تیار ہو گیا اس نے مجھے ہدایت کر دی کہ یہ بات کسی کو نہ بتاؤں کیونکہ ان کے بیٹے اور پوتے ان باتوں سے بہت ناخوش ہوتے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ کام بس بنا ہی سمجھو۔" میں نے مسکرا کر کہا اور جواباً رادھا بھی مسکرا دی۔

نصف رات گذری تھی کہ میں اور رادھا کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئے اس طرف بالکل سناٹا تھا چاند چھپ چکا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں راستہ بمشکل نظر آ رہا تھا۔

مجھے کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر تنہا چھوڑ کر رادھا کچھ دیر کے لئے ایک طرف چلی گئی۔ یہ پگڈنڈی جوہڑ کے کنارے پر تھی۔ رادھا کا رخ دوسری جانب بنی ہوئی عمارتوں کی طرف تھا۔ میں دس بارہ منٹ تک بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ میں اسے اپنے کام کے لئے بالکل تیار تھا۔ جب میں ایک سیاہ کپڑے کی پٹی موجود تھی۔ جس کو شکار کی آنکھوں پر باندھنا تھا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ میں نے ایک سایہ پگڈنڈی پر آتے ہوئے دیکھا۔ یہ رادھا تھی میں بعجلت قریب کے کھیت میں چلا گیا اور جب رادھا کے ساتھ چلتا ہوا ایک بوڑھا آدمی میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے باہر نکل کر اسے پیچھے سے دبوچ لیا آن واحد میں جیب میں رکھی ہوئی پٹی اس شخص کی آنکھوں پر بندھ چکی تھی۔

ہلکے پھلکے بوڑھے پر قابو پانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ رادھا میرے ساتھ تھی ہم جوہڑ کے کنارے آ کھڑے ہوئے تھے۔ بوڑھے آدمی کو بے بس کر کے کھڑا کر دیا گیا اسے حکم دیا گیا کہ بے حس و حرکت کھڑا رہے۔ پھر رادھا اسکیم کے بقیہ حصے پر عمل کرنے کے لئے انتظام کرنے لگی اس نے مجھے بھی مختصراً بتا دیا تھا اور میں اس کا طریقہ کار سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ واقعی یہ وہی بات تھی کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

رادھا کے اشارے پر میں نے گرم پانی کی بوتل اٹھالی اور ایک لمبے پھل کا چاقو نکال

لیا۔

رادھا مجھے اشارہ کرکے بوڑھے کے عقب میں چلی گئی میں نے حسب پلان چاقو کا الٹا کند حصہ اس کے گلے سے لگا کر کہا۔ "اب تو اپنی موت کے لئے تیار ہو جا---- او لالچی بوڑھے کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ بھگوان دنیا بھر کی دولت تجھے ہی دے دے گا؟"

بوڑھا خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ اور اس کی سٹی گم ہو چکی تھی ایک لمحے کو مجھے اس پر ترس بھی آیا مگر رادھا کی پراسرار شخصیت نے میرے اس جذبہ رحم کو فوراً ہی کافور کر دیا۔

چند ساعتوں کے بعد راھا نے چینی کے پیالے میں ابلتا ہوا پانی انڈیلا۔ اب اسکیم کا آخری حصہ شروع ہو رہا تھا۔

اچانک میری بدلی ہوئی آواز گونجی "آخری وقت میں بھگوان کو یاد کر لے بڈھے کھوسٹ' لے اب تیرا سمے آ پہنچا۔"

یہ کہہ کر جونہی چاقو کی الٹی دھار ذرا طاقت سے بوڑھے کے گلے پر پھیری گئی اور اس وقت تھوڑا سا گرم پانی رادھا نے اس کے سینے پر ڈال دیا۔ بوڑھا خوف سے تھرتھرایا اور پھر دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

میں نے جھک کر اس کی نبضیں ٹٹولیں ---- مگر وہ تو زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔

ہم نے اطمینان کرنے کے بعد سامان کو جوں کا توں رکھا اور نہایت ہوشیاری سے بوڑھے کی لاش اٹھا کر کھیتوں میں ڈال آئے۔

دوسرے دن بوڑھے انوپ کی لاش ایک کسان نے کھیت میں دیکھی فوراً ہی اس کے بیٹوں کو اطلاع کر دی گئی عام خیال یہ تھا کہ رات کے وقت انوپ کھیتوں کی طرف آیا ہو گا اور کسی جانور نے اسے ہلاک کر دیا ہو گا۔ مگر اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا یہ دیکھ کر لوگوں نے کہا۔ ضرور انوپ سنگھ کو کسی زہریلے ناگ نے ڈس لیا ہے۔

بوڑھے کی موت کا اس کے خاندان پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا اسی دن شام کو انوپ سنگھ پھونک دیا گیا۔ تیسری رات ہمارا شکار انوپ سنگھ کا بڑا بیٹا سروپ سنگھ تھا یہ ساٹھ کے

پیٹے میں تھا مگر بازو اب بھی مضبوط تھے۔ اسے بھی رادھا نے جانے کس بہانے سے جوہڑ تک لائی تھی اسے دبوچنے کے لئے مجھے کافی زور آزمائی کرنی پڑی تھی۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ رادھا کا فارمولا کس قدر کامیاب ہو رہا تھا۔

وقوعہ کی صبح جب سروپ کی لاش کھیتوں میں پائی گئی تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے کچھ لوگوں نے کہا۔ "یہ محض اتفاقی حادثات نہیں ہو سکتے ضرور اس میں کوئی راز ہے۔"

پولیس کو وقوعہ کی اطلاع کی گئی۔ کچھ فاصلے پر تھانہ واقع تھا۔ پولیس دوپہر کو آئی اس وقت تک لاش اسی جگہ پڑی تھی۔ کسی طرح اخباری رپورٹرس کو بھی اطلاع مل گئی اور اسی دن پریس کو یہ عجیب و غریب خبر دے دی گئی کہ مضافاتی علاقے میں ایک ایسی لاش پائی گئی ہے جس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہے صرف سینے پر بٹنوں والا حصہ بھیگا ہوا ہے۔

پولیس کی ابتدائی کارروائی کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دی گئی تیسرے دن اخبارات میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی شائع ہو گئی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ موت حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی ہے۔ رپورٹ کی اشاعت کے بعد لوگوں نے یہی رائے زنی کی کہ سروپ سنگھ شاید گھر والوں سے بدظن ہو گیا تھا اور زیادہ غم کرنے کی وجہ سے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

لیکن تیسرے دن بعد پھر ایک لاش منظر عام پر آئی یہ سروپ سنگھ کا چھوٹا بھائی دلیپ تھا۔

پچاس سالہ دلیپ کی لاش بھی بالکل ایسی ہی حالت میں پائی گئی تھی۔ ابھی اس کی انکوائری ہی ہو رہی تھی کہ اس خاندان کا آخری بزرگ چالیس سالہ کلدیپ سنگھ بھی ایک دن کھیتوں میں مردہ پایا گیا اس کی موت بھی حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی۔

ایک ہی انداز میں چار اموات ہو چکی تھیں لیکن اخبارات میں تین کا تذکرہ چل رہا تھا انوپ کی موت پردہ راز میں جا پڑی تھی۔ حکومت کے ذمے داران بوکھلا گئے تھے اخبارات نے پولیس اور انتظامیہ پر کافی کیچڑ اچھالی تھی۔ اس لئے متعلقہ تھانوں سے باقاعدہ ایک گارڈ اس علاقے میں تعینار کر دیا گیا۔

پولیس تعینات رہی مگر ایک ہفتے بعد پھر اسی خاندان کا ایک نوجوان سلطان سنگھ کھیتوں میں مردہ پایا گیا۔ سلطان، سروپ سنگھ کا واحد بیٹا تھا۔ اس کی موت بھی حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی اس کے جسم پر بھی کوئی زخم نہیں تھا اس کا گریبان بھی نم پایا گیا تھا۔

ایک ماہ کے اندر ایک ہی خاندان کے بارہ افراد اسی طرح موت کے گھاٹ اتارے جا چکے تھے اب انوپ کے خاندان میں بیوہ عورتیں اور کنواری لڑکیاں رہ گئیں تھیں۔ اس خاندان کی کسمپرسی پر پورا ملک افسوس کر رہا تھا۔ حکومت کی طرف سے نااہل پولیس والے ہٹا دیئے گئے تھے اور تھانوں میں نیا اسٹاف تعینات کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ تجربہ کار جاسوس بھی مقرر کر دیئے گئے تھے۔

عوامی حلقوں نے انوپ سنگھ کے خاندان کے ساتھ نہایت ہمدردی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہزاروں آدمی ان بیواؤں سے ملنے بھی گئے تھے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس خاندانکو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ان کا دشمن کون ہے؟ اب تک جتنے واقعات ہوئے تھے وہ صرف اسی خاندان تک محدود تھے اس علاقے میں دوسرے لوگ اب بھی خیریت سے تھے لیکن پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا اخبار والے دھڑا دھڑ اس خاندان کی بیواؤں کے انٹرویو چھاپ رہے تھے۔

ایک شام جب ہم چائے سے فارغ ہو کر تنہا بیٹھے تھے تو میں نے رادھا سے کہا۔ "ہمارا معاہدہ پورا ہو چکا ہے ---- تم اپنے دشمنوں کا صفایا کرنے میں کامیاب ہو گئیں اب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"میں آپ کی بے حد احسان مند ہوں۔ جو آپ حکم دیں گے میرے لئے اس میں کوئی عذر یا تامل نہ ہو گا" رادھا نے خلوص سے کہا۔

دوسرے دن ہم پھر بائی ٹرین رامپور روانہ ہو گئے۔ رادھا کا شوہر اپنی دولہن کو گھر لے جا رہا تھا ہمارے ساتھ وہ پراسرار صندوق موجود تھا۔ سفر کی رات نہایت خوشگوار تھی۔ ہم فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے اس لئے بوگی میں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا مسافر نہیں تھا۔

آج رادھا بہترین ماڈرن لباس پہنے ہوئے تھی۔ جدید طرز میں کٹے ہوئے بال اور خوبصورت سینے کو نیم عریاں کرنے والا اسکرٹ پہنے ہوئے وہ جاپانی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے اور مجھے نیند آ رہی تھی۔ یہی حال رادھا کا تھا۔

اچانک میں نے رادھا سے ایک بے تکا سوال کر دیا۔ "کیا ہم دوبارہ کبھی نہ مل سکیں گے؟"

اس نے شفیق نظروں سے میری طرف دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔ "میرا کام ختم ہو چکا ہے اب میں اپنے راج کمار کے پاس ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں مگر---- یہ سچ ہے کہ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

"صرف یاد رکھو گی" میں اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ رادھا اسی طرح بیٹھی رہی آج وہ جذبات سے بالکل عاری نظر آ رہی تھی۔ خشک باتوں سے تنگ آ کر میں نے سونے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ایک بار پھر رادھا نے وہی پراسرار سگریٹ کا ڈبہ نکال کر ایک سگریٹ مجھے پیش کیا۔ رادھا کے معنی خیز اصرار پر مجھے پھر وہی سگریٹ پینی پڑی اور سگریٹ پیتے ہی ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔ لیکن میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

ایک بار پھر رادھا نے مجھے اس بکس میں لاش کے قریب لٹا دیا۔ صندوق کا دروازہ بند کر کے قفل لگا دیا، نہ معلوم کب تک میں اسمیں پڑا رہا۔

صندوق پھر سے کھولا گیا۔ اور مجھے لاش کی طرح نکال کر برتھ پر ٹیک لگا کر بٹھا دیا گیا اس بار پھر رادھا نے میرے منہ میں سگریٹ دبا دی اور ماچس جلا کر سلگا دی۔ تین کش لے کر میں بے ہوش ہو گیا دوبارہ آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ کمپارٹ میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ رادھا اور اس کا سامان نہ جانے کہاں غائب تھا۔ ہاں میری اٹیچی موجود تھی اور جب میں نے گھر پہنچ کر اپنی اٹیچی کھولی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پوری اٹیچی کرنسی نوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ اوپر ہی ایک پرچا رکھا ہوا تھا۔ خط ہندی تحریر میں لکھا گیا تھا۔

"شریمان جی"

میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں اپنے وعدے کے مطابق یہ حقیر سا نذرانہ حاضر

ہے آشنا ہے آپ اسے سوئیکار کرلیں گے۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی فقط آپ کی
دوست ...... رادھا۔

میں نے جب سعیدہ کو یہ واقعہ سنایا تو اس نے سچ ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر اس بات پر وہ بھی الجھ گئی کہ اگر یہ سب کچھ غلط تھا تو میری اٹیچی کو نوٹوں سے کس نے بھر دیا تھا؟۔ مجھے پرچا کس نے لکھا تھا اور میں ایک ماہ تک کہاں غائب رہا تھا۔ جب کانپور والوں نے پہلے ہی سعیدہ کو مطلع کر دیا تھا کہ تمہارا شوہر یہاں نہیں پہنچا۔

واقعات اتنے پراسرار تھے کہ نہ کسی سے کہتے بنتی اور نہ ہضم ہو سکتے تھے۔ تجسس اپنی انتہاء کو پہنچا تو میں نے ان واقعات کی اصلیت جاننے کا عزم کر لیا۔ سب سے پہلے میں نے گزشتہ ماہ کے اخبارات اکٹھے کئے اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تمام واقعات اور انٹرویو موجود تھے۔

پھر ایک دن میں اور سعیدہ کانپور روانہ ہو گئے اس بار سعیدہ نے مجھے تنہا جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کے علاوہ ہم نے یہ سفر میل ٹرین سے کیا تھا۔

اپنے خالہ زاد بھائی کے گھر پہنچا تو اس نے جاتے ہی ٹانگ لی۔ اس کی شکایت بے جا نہ تھی مگر میں نے دولہا دلہن سے معذرت کر لی اور شادی کا ایک خوبصورت تحفہ ان کی نذر کر دیا اس طرح گلوخلاصی ہو گئی۔

سعیدہ میرے ساتھ شہر کے مضافاتی علاقے میں جہاں اخبارات کی نشاندہی کے مطابق وہ پراسرار اموات ہوئیں تھیں جانے پر بضد تھی مگر یہ بات میں نے نہیں مانی اور ایک دن میں تنہا اس علاقے میں پہنچ گیا۔

سب کچھ وہی تھا وہی راستے وہی کوٹھیاں' وہی ایک طرف بنے ہوئے چھوٹے مکانات کا سلسلہ اور ان کے سامنے کھیتوں کا طویل حصہ انہی کھیتوں کے قریب ایک جوہڑ واقع تھی۔ میں نے اس علاقے کے ایک بوڑھے سے ملاقات کی اور پھر میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

رادھا کی کوٹھی اسی جگہ موجود تھی۔ میں نے اس کوٹھی میں ایک ماہ گزارا تھا اور جب میں نے اس کوٹھی پر جا کر ملازم کو پکارا تو بوڑھے ڈرائیور نے مجھے اجنبی نگاہوں سے

دیکھ کر کہا۔

"بابو جی کس سے ملنا ہے؟۔"

"رادھا دیوی رہتی ہیں۔ انکی بہن شیلا دیوی" .....

"رادھا بیٹا رہا کرتی تھی۔ مگر ان کی شادی کو اب ڈیڑھ ماہ سے اوپر ہو گیا وہ تو کل لندن چلی گئیں اپنے دولہا کے ساتھ" میں نے بمشکل تمام بوڑھے کو اس بات پر راضی کر کیا کہ وہ شیلا سے ملا دے ہماری یہ ملاقات اس کمرے میں ہوئی جہاں میں ایک ماہ تک چین کی بنسی بجا چکا تھا۔ یہ وہی شیلا تھی میں نے اسے خوب پہچان لیا تھا۔ مگر وہ مجھے بالکل اجنبی سمجھ رہی تھی میں نے شیلا کو رادھا کا کلاس فیلو کہہ کر تعارف کرایا تھا اس لئے وہ ملاقات پر آمادہ ہو گئی۔

باتوں کے دوران شیلا نے کہا۔

"دیدھی آٹھ سال سے لندن میں تھیں تعلیم مکمل کر کے انہوں نے وہیں ایک ہندوستانی "گوتم بابو" سے شادی کر لی اور ابھی ایک ماہ دولہا کے ساتھ یہاں رہ کر گئیں ہیں انہوں نے درسی تعلیم کے علاوہ پامسٹری اور مسمریزم وغیرہ بھی باقاعدہ سیکھی ہے دیدھی نے بتایا کہ انہیں اس علم کو حاصل کرنے میں پورے تین سال لگے تھے۔ اب وہ کچھ عرصہ سے ہپناٹائز کے کمالات سیکھ رہی ہیں۔ یہ ان کی ہابی ہے۔ ویسے ہمارے دولہابھائی بہت بڑے آدمی ہیں لندن میں ان کا بہت بڑا بزنس ہے دیدی نے اپنے شوق کی وجہ سے یہ علوم سیکھے ہیں۔" آخر میں اس نے کہا "تعجب ہے کہ میں نے آپ کو کبھی دیدھی کے ساتھ نہیں دیکھا آٹھ سال پہلے انہوں نے کانپور ڈی اے وی کالج سے بی اے کیا تھا اس کے بعد لندن چلی گئیں۔"

"تم مجھے نہیں جانتی ہو شیلا دیوی لیکن میں تمہیں رادھا اور تمہارے سارے خاندان سے واقف ہوں میں رادھا کا پرانا دوست ہوں۔"

شیلا کے چہرے پر اپنائیت بھری حیرت چھوڑ کر میں چلا آیا۔ وہ دروازے تک مجھے رکنے کو کہنے آئی مگر اب میرے ذہن کی تمام گتھیاں سلجھ چکی تھیں دراصل برسہا برس پہلے یہاں دو خاندانوں میں پرانی رنجش تھی اور رادھا نے اسی جذبے کو تسکین کے لئے اپنے علوم سے کام لیا تھا اور میں اس کی شعبدے بازی سے اس کا دست راست بن گیا تھا۔

خیال قاتل

اگر لوگ اجنبی ہوں' ماحول اجنبی ہو تب ماضی کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ دیا جائے' کون تحقیق کرے گا ----- اور کون یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ درست ہی ہے -----

ہاں البتہ ذہین لوگ اس بات کا خیال ضرور رکھتے ہیں کہ کم از کم ان لوگوں کے سامنے کچھ نہ کہیں' جو ان کا ماضی اچھی طرح جانتے ہوں۔

تمہید اس لئے باندھنی پڑی کہ میں خود کو حالات کا شکار سمجھتا رہا' پہلے میں نے اپنے بارے میں یہ سوچا تھا کہ کسی سے کچھ کہنا حماقت ہے کہ میرا ماضی کیا تھا۔ لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ کہاں کے رہنے والے ہو' تب میں اپنے وطن کا نام بتا دیا کرتا تھا' کسی نے اگر اصرار کیا کہ میرے خاندانی حالات کیا تھے تو تھوڑا بہت بتا دیا لیکن عام طور سے کوشش یہی کرتا تھا کہ تفصیلات بتانے سے گریز کروں۔

ویسے یوں بھی ماضی میرے نزدیک بے جان چیز ہے' ممکن ہے آپ اس سے اتفاق نہ کریں' لیکن میرے نزدیک یہ ٹھوس حقیقت ہے' ماضی گذرا ہوا وقت ہے' جو اپنا نہیں ہوتا۔ اور ہاتھ سے نکلی ہوئی چیز کے بارے میں کیا سوچنا یا گزرے ہوئے لمحات کو دہرانے سے کیا فائدہ۔

حال سب سے قیمتی شے ہے اور حال ہی سے مستقبل کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ ماضی صرف ایک یاد ہوتا ہے اور یادیں ذہن کو سوائے افسوس کے کچھ نہیں دیتیں' اب آپ سوچیں گے کہ کیوں؟ تو سنئے -----

آپ کا ماضی بے حد شاندار رہا ہے' آپ کے ماضی میں بے شمار خوشگوار یادیں ہیں۔ گزرا ہوا بچپن ہے۔ ہنستی ہوئی جوانی ہے۔ یا پھر -----

اگر آپ کا ماضی غیر مطمئن رہا ہے' آپ افلاس کا شکار رہے ہیں ایسی صورت میں ماضی دونوں صورتوں میں غمناک ہے -----

خوشگوار یادیں بے شک ذہن و دل پر خوشگوار تاثر چھوڑتی ہیں۔ لیکن جب وہ گھڑیاں ہاتھ سے نکل جاتی ہیں تو انسان سوائے کف افسوس ملنے کے کچھ نہیں کر سکتا ----- اور غم ناک ماضی یا غیر مطمئن ماضی کسی بھی شخص کے لئے دلکش نہیں ہوتا۔

یہ تو تھی ماضی کی بات' اب اگر میں بر سبیل تذکرہ آپ کو یہ بات بتا دوں کہ زندگی کے ابتدائی سال بہت اچھے انداز میں گزرے تھے' والد صاحب اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ اس لئے اس قسم کے لوگوں کی اولادیں جس انداز میں پروان چڑھتی ہیں' وہ فطری چیز ہے' اس کے بارے میں تفصیلات بتانا حماقت ہی ہے۔

جوانی آئی ----- تو بہت ساری مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اس وقت میری عمر تقریباً اکیس سال تھی' جب والد صاحب نے میری شادی کا منصوبہ بنایا -----

شادی کر دی گئی' ثریا میرے لئے کسی روایتی محبوب کا درجہ نہیں رکھتی تھی۔ بس خاندان ہی کی لڑکی تھی' صورت شکل کی اچھی خاصی تھی ----- اور چونکہ میں نے اس وقت تک عورت کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا' لوگ شادی کرتے تھے' والدین کرا دیتے تھے۔ یہی طریقہ کار تھا اور یہی روایت' چنانچہ میں نے بھی شادی کر لی۔

ہاں ثریا کے آنے کے بعد میرے ذہن میں کچھ تبدیلیاں ضرور پیدا ہوئیں وہ مجھے اچھی لگنے لگی' ظاہر ہے تنہائیوں کی ساتھی تھی' ہر دکھ درد کی شریک اور یوں بھی وہ بہت اچھی عورت تھی۔

چنانچہ والدین کی خواہش میں میری پسند بھی شامل ہو گئی۔ ثریا کے ساتھ شادی کئے ہوئے دو یا ڈھائی سال ہی گزرے تھے کہ حالات نے اچانک پلٹا کھایا۔ تقسیم کے فسادات شروع ہو گئے اور ہمارا علاقہ بھی فسادات سے محفوظ نہ رہ سکا' جو لوگ بچپن سے لے کر اب تک مجھ سے پیار کرتے آئے تھے۔ جن کو میں کسی کو چاچا' کسی کو تاؤ' کسی کو ماموں'

کسی کو ملا کما کرتا تھا۔ وہی چھریاں نیزے اور تلواریں لے کر آ گئے اور قتل و غارت گری شروع کر دی۔

نجانے کون سے جذبے نے اپنی پرانی تمام باتیں بھلا دی تھیں۔ میرے والد کو جس شخص نے قتل کیا اسے میں چاچا کما کرتا تھا۔ ہمیشہ وہ ہمارے گھر آتا تھا اور بہت ہی پیار و محبت سے ملتا تھا اور میرے پورے گھر والوں سے بھی اس کا رویہ بہت ہی خوب تھا۔

وہ خود بھی چھوٹا سا زمین دار تھا۔ اکثر اپنی زمینوں سے اناج لے کر ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ حالانکہ اللہ کا دیا سب کچھ تھا لیکن ہم اسے چاچا کہتے تھے اس کے لئے والد صاحب کا حکم تھا کہ ہمیشہ اس کی اچھے انداز میں پذیرائی کی جائے اور یوں اس کے جذبات کا مکمل طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ اور پھر اس نے میری نگاہوں کے سامنے ہندو مسلم تعصب میں سمٹ کر میرے والد صاحب کو قتل کر دیا۔

مجھے بھی زخمی کر دیا گیا تھا اور جب میں بے ہوشی سے ہوش میں آیا تو ثریا میرے سر اپنے زانو پہ رکھے رو رہی تھی۔ میرے سر میں پٹی بندھی ہوئی تھی' تب میں نے کراہ کر ثریا سے پانی مانگا۔

ثریا جلدی سے پانی بھر کر گلاس لے آئی۔ پانی پینے کے بعد میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے اس سے حملہ آوروں کے بارے میں پوچھا۔

ثریا نے بتایا کہ وہ لوگ آ کر جا چکے ہیں خود اس نے ایک گندی نالی میں چھپ کر جان بچائی تھی جس کے نشانات اس کے چہرے اور بدن پر موجود تھے۔ میں غم و غصہ سے پاگل ہو گیا تب میں نے اپنے دیگر اعزاء کے بارے میں پوچھا تو علم ہوا کہ سب کے سب شہید ہو چکے ہیں۔ صرف میں بچ گیا تھا جسے وہ لوگ مردہ سمجھ کر ہی چھوڑ گئے تھے۔ ورنہ مجھے بھی ہلاک کر دیتے۔

ان حالات میں ذہن کی جو بھی کیفیت ہوتی کم تھی لیکن ثریا جیسی غمگسار عورت نے مجھے سہارا دیا۔ گھر میں کافی لوٹ مار کی گئی تھی جو کچھ بچا تھا اسے سمیٹا اور دیگر لوگوں کی طرح اس طرف چل پڑے جو ہماری آخری پناہ گاہ تھی یعنی پاکستان.....

پاکستان میں داخل ہونے کے بعد وحشت و بربریت کے ان پیکروں سے جان بچ گئی

تھی۔ جنہوں نے سب کچھ بھلا دیا تھا جن کے لئے انسانیت کا کوئی تصور نہیں رہا تھا لیکن بہرصورت یہاں بھی زندگی بے حد کٹھن تھی۔

حالانکہ جس دور کی میں بات کر رہا ہوں اس دور میں مصوری کو کوئی اعلیٰ حیثیت حاصل نہیں تھی۔ لیکن زمیندار کے بیٹے کا شوق اس وقت سے پورا ہونا شروع ہو گیا تھا جس وقت سے اس نے شوق کا اظہار کیا تھا۔

ہاں مجھے بچپن ہی سے فن مصوری سے دلچسپی تھی' چھوٹی موٹی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ والد صاحب نے تصویریں دیکھیں' میرے ذوق کو سراہا اور میرے لئے باقاعدہ بندوبست کر دیا۔

ایک آرٹسٹ کو دہلی سے بلوایا گیا تھا اور انہیں باقاعدہ ملازمت دی گئی۔ اچھی خاصی رقم دی جاتی تھی اور وہ آرٹسٹ مجھے تصویر کشی سکھاتا تھا۔ یوں رنگوں اور برشوں کے کھیل میں میں تھوڑے عرصے میں کافی مہارت حاصل کر گیا۔ لیکن میں نے ذہن میں کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ یہ شوق کبھی پیشہ بھی بن سکتا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد حالات چونکہ بہت خراب تھی' جسم پر موجود لباس کے علاوہ کوئی ایسی خاص چیز نہیں تھی جس سے زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا جا سکے' لیکن یہاں بھی ثریا نے اپنی ذہانت اور محبت کا مظاہرہ کیا اس نے بتایا کہ وہ اپنے زیورات یہاں تک لانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ گو ان زیورات کو یہاں تک لانے میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن زیورات دیکھ کر جو ڈھارس بندھی اس کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتا' یوں لگا تھا جیسے نئی زندگی مل گئی ہو۔

میں نے کبھی کسمپرسی کا دور نہیں دیکھا تھا' ہمیشہ خوشگوار طریقے سے زندگی گزاری تھی۔ لیکن یہاں آنے کے بعد یہ خیال ذہن میں ضرور پیدا ہوا تھا کہ ثریا کو کیا کھلاؤں گا خود کس طرح زندگی گزاروں گا۔ ظاہر ہے پاکستان ابھی خود بے حد پسماندہ تھا اور ظاہر ہے وہ لوگ جو 1947ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں اس بارے میں سوچ سکتے ہیں کہ اس وقت پاکستان اس قابل نہیں تھا کہ اس پر بوجھ بنا جائے۔

ثریا کے زیورات میری آنکھوں میں چمک بن گئے اور پھر ہم نے بہت ہی احتیاط کے

ساتھ زندگی کا آغاز کیا۔

چھوٹی سی جگہ ایک چھوٹا سا مکان لے لیا۔ ہم صرف دو افراد تھے ہمارے علاوہ اور کوئی تو تھا نہیں جو ہمیں بڑے مکان کی ضرورت ہوتی اور پھر اس کے بعد ایک چھوٹی سی دکان کا بھی بندوبست کیا گیا۔

میں نے اور ثریا نے زندگی گزارنے کے بے شمار پروگرام بنائے تھے اور اب ہم ان پروگراموں پر قدم بہ قدم چلنا چاہتے تھے ہم نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہمارے پاس کیا ہے اور ہم نے اسے کس طرح خرچ کرنا ہے۔ ثریا ہی کے ایما پر میں نے اپنے فن دست کشی کے شوق کو پیشہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ رنگ' برش اور کینوس خریدے گئے۔ اور میں اپنی دکان میں بیٹھ کر مختلف تصویریں بنانے لگا۔ میری دکان پر موجود بورڈ پر PAINTER لکھا ہوا تھا۔

بے شمار تختیاں' پلیٹیں اور اس قسم کی چیزیں میرے پاس لکھنے کے لئے آتیں اور مجھے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔

میں اور ثریا خوش تھے۔ فن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ میں یہاں تک محدود ہوں لیکن ایک بار میں نے فرصت کے لمحات میں ایک تصویر بنائی اور وہ تصویر اپنی دکان میں سجا دی۔

منہ سے بولتی ہوئی جاندار تصویر جسے دیکھ کر چلتے لوگ رک جایا کرتے تھے۔ پھر ایک فن مصوری کے دلدادہ شخص نے اسے دیکھ کر گاڑی روکی اور پھر وہ میرے پاس پہنچ گیا۔

"مسٹر..... یہ تصویر کیا آپ نے بنائی ہے؟" نوجوان نے پوچھا' صورت ہی سے شوقین معلوم ہوتا تھا۔

"جی ہاں..... یہ میری اپنی کاوش ہے"۔

"لیکن آپ کی دوکان تو....."

"ہاں..... اس میں کوئی کمال نہیں ہے' بے شمار لوگ ایسے ہیں جو بہت کچھ ہیں لیکن پیٹ بھرنے کے لئے وہ' وہ کچھ کر رہے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہئے۔ بہر صورت

تصویر میں نے یہاں لگا کر اپنے ذوق کی تسکین کی ہے اور چاہتا ہوں کہ اس فن کو کچھ اور آگے بڑھاؤں۔"

"بہت ہی حسین تصویر ہے' اگر تم چاہو تو اسے میرے ہاتھ فروخت کر دو" نوجوان شخص نے کہا۔

"ہاں اس میں کوئی حرج نہیں ہے" میں نے دل میں ہنستے ہوئے کہا۔ مصوری تو میرا شوق تھا' لیکن میں اتنا بڑا نہیں ہوں کہ کسی بھی چیز کو اپنی انا کا سوال بنا دوں۔ ٹھیک ہے جب پیسہ تھا تو یہ شوق تھا۔ اور یہ پیسہ نہیں ہے تو یہ پیشہ ہے' جب میں شوقین تھا اس وقت اس کی دوسری کیفیت تھی اور آج اگر یہ میری زندگی کا سہارا بن رہا ہے اور میرے گزارے کے لئے ایک اچھا ماحول فراہم کر سکتا ہے تو پھر آج میں اس سے پہلوتہی کیوں کروں؟۔

میں نے انتہائی مہنگے داموں یہ تصویر بیچی' خریدنے والا اتنا شوقین تھا کہ میں نے جو کچھ مانگا اس نے نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اور میں حیران رہ گیا۔ یہ تو بہت ہی عمدہ بات تھی۔

جو کچھ ملا تھا اسے میں نے احتیاط سے رکھا۔ ثریا بھی اس سے بہت خوش ہوئی تھی۔ اور پھر ہم نے باقاعدگی کے ساتھ یہ کام شروع کر دیا۔

میں خوبصورت تصویریں بناتا' انہیں دکان میں رکھتا اور وہ کسی نہ کسی طرح بکتی چلی جاتیں۔

اب میرے تعلقات کچھ اور بڑھنے لگے تھے' چنانچہ میں نے اپنی جمع کی ہوئی رقم خرچ کر کے اسی جگہ دو اور دکانیں حاصل کر لیں۔ اس طرح میرا اسٹوڈیو کافی بڑا ہو گیا تھا میں اب گاڑیوں کی پلیٹیں' اور بورڈ وغیرہ لکھنے کی بجائے تصویر کشی کرتا تھا' شوقین لوگ میرے اسٹوڈیو میں آتے' ماڈل بنتے اور اپنی تصویریں بنواتے اور مجھے اچھی خاصی منہ مانگی قیمت دے کر جاتے تھے۔

چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں ہمارے حالات بدلنے لگے' ہم لوگوں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ اور جو کچھ کھو چکے تھے اسے آہستہ آہستہ بھولتے جا رہے تھے۔ ہاں اب اس

نئی زندگی میں کچھ نئی تبدیلیاں لانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہم نے ایک اور بڑا مکان حاصل کر لیا اور ہمارا طرز زندگی کچھ اور آگے بڑھا۔ گویا اب ہم یعنی میں اور میری بیوی ترقی کی جانب گامزن تھے اور ایک حسین زندگی میں جا رہے تھے۔

لیکن جناب یہ بھی کہا ہے کسی نے کہ یہ آسمان بڑی عجیب و غریب چیز ہے میں نہیں سمجھتا کہ لوگ آسمان وغیرہ کے چکر میں کیوں پڑ گئے ہیں۔ لیکن کہا ضرور جاتا ہے' خواہ اس کی وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو' لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

چنانچہ حضرات آسمان نے میرے اوپر اپنی گردش کا سایہ ڈالا' بات بہت عجیب تھی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھ جیسا سنجیدہ پڑھا لکھا آدمی کسی ایسے عجیب سے چکر میں گرفتار بھی ہو سکتا ہے۔

میرا اسٹوڈیو شہر کے کسی بہت زیادہ بارونق حصے میں نہیں تھا۔ بلکہ ایک چھوٹی سی گلی میں تھا۔ جہاں اور بھی دوکانیں تھیں جو سرشام ہی بند ہو جاتی تھیں۔ میں عموماً رات کو دیر تک کام کیا کرتا تھا۔

اکثر لوگوں کو میرے بارے میں علم ہو گیا اور یوں شوقین لوگ بعض اوقات چلے آیا کرتے تھے۔ کیونکہ میری تصویریں خاصی پسند کی جاتی تھیں' خاص طور سے وہ لوگ جو میری تصویریں خرید کر لے گئے تھے' مجھ سے واقفیت رکھتے تھے اور ان کے اپنے حلقے میں' میں بہت مقبول تھا۔ بہت سے لوگ اپنی اپنی تصویریں بنوانے آتے تھے' جن میں خواتین بھی تھیں اور مرد بھی تھے۔

میں نے ان سب کو مطمئن کر دیا تھا اور اس طرح وہ میرے مستقل گاہک بن گئے تھے۔ خواتین تنہا بھی میرے پاس آیا کرتی تھیں۔

حالانکہ میری عمر زیادہ نہیں تھی لیکن حالات و حوادث نے مجھے سنجیدہ اور متین فطرت کر دیا تھا چنانچہ کسی قسم کی شکایت کسی کو نہ ہوئی جس سے میری نیک نامی پر حرف آتا۔

اس شام میں فارغ تھا جو تصویر فریم پر لگی ہوئی تھی اسے مکمل کرنے کے بعد میں

نے آخری ٹچ دیئے تھے۔ لیکن یہ تقریباً ساڑھے گیارہ یا بارہ بجے کی بات ہے۔ کوئی تصویر میرے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اور نہ ہی کوئی تصویر شروع کرنے کا ارادہ تھا اس کی وجہ شاید آسمان پر چھائے ہوئے بادل تھے لیکن کیونکہ جس شخص کی میں نے تصویر بنائی تھی اس سے وعدہ کیا تھا کہ آج اسے یہ تصویر دے دوں گا۔ اس لئے میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے اگر میں چاہتا تو اسٹوڈیو بند بھی کر سکتا تھا' ظاہر ہے کسی کی پابندی تو تھی نہیں۔ لیکن یہ میرے اصول کے خلاف تھا۔

بہرحال شام ہو گئی اور وہ شخص تصویر لینے نہ آیا۔ تب میں نے سوچا کہ حسب معمول جب تک دکان کھولتا ہوں اس وقت تک تو انتظار کروں گا ہی' کیونکہ یہ میرا کاروباری اصول تھا اور جلدی دکان بند کر کے چلے جانا اچھی بات نہیں تھی کیونکہ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ ممکن ہے وہ شخص آ ہی جائے اور اگر اسے وقت پر اپنی تصویر نہیں ملی تو اسے کافی مایوسی ہو گی۔ چنانچہ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔

چار بجے کے بعد ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی تھی میں نے اپنے ملازم غفور سے اپنے لئے چائے منگوائی اور اسٹوڈیو میں اندر ہی بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

ذہن خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند ساعت کے بعد غفور آیا اور بولا۔

"صاحب جی۔ ایک بی بی جی آئی ہیں۔"

"اوہو —— بی بی ہیں یا صاحب بھی ہیں؟"

"نہیں جی' صرف بی بی ہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں' کیا کہتی ہیں؟"

"آپ کو پوچھ رہی ہیں" غفور نے جواب دیا۔

"بھیج دو" میں نے کہا اور چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی ایک طرف رکھ دی۔ پھر سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں پر رکھا اور اسے سلگانے لگا' اور اسی وقت وہ اندر داخل ہوئی۔

شاعرانہ باتیں کرنا میرے لئے مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ مصوری اور شاعری خاصی نزدیکی چیزیں ہیں۔ عورت کے حسن کی تعریف میں برش لے کر کرتا ہوں جب کہ

شاعر حضرات قلم سے لکھتے ہیں۔ مجھ میں اور ان شاعروں میں فرق صرف یہی ہے کہ وہ الفاظ میں شاعری کرتے ہیں اور میں لکیروں میں۔

لیکن وہ عورت جو اندر آئی تھی ایک مجسم غزل تھی۔ سلک کا سادہ سا سفید لباس پہنے' بال کھولے ہوئے' مجموعی طور پر حسن و پاکیزگی کا ایک اعلیٰ شاہکار تھی' شکل صورت سے ایک عجیب سی پراسرار کیفیت ٹپکتی تھی ویسے میرے خیال کے مطابق وہ کسی اچھے گھرانے ہی کی تھی۔ اور یقیناً کسی لمبی کار میں آئی ہو گی۔

بہرحال میں نے اٹھ کر اس کی پذیرائی کی لیکن وہ دروازے میں کھڑی ہو گئی اور غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہی اس کا انداز خاصا پراسرار تھا۔ میں خجالت سی محسوس کرنے لگا۔

چند ساعت اس طرح گزر گئے تب میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "تشریف لایئے خاتون' آپ کس سوچ میں ڈوب گئیں۔"

"آں ---- " وہ چونک پڑی پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی تب مجھے احساس ہوا کہ اس کی چال بھی بے حد عجیب ہے' کھوئی کھوئی مست مست سی چال' جیسے قدم نہ اٹھا رہی ہو یا جیسے اس کے پاؤں میں اسکیٹنگ شوز بندھے ہوں یا پھر وہ ہوا میں تیر رہی ہو۔

آگے بڑھ کر وہ ایک جگہ پہنچی' میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا' تب میں اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے اب بھی اسی انداز میں دیکھے جا رہی تھی عجیب کھویا کھویا سا انداز تھا' آنکھیں میری جانب نگراں تھیں۔

اس کے اس عجیب رویے سے میں خاصا الجھ گیا تھا۔ پھر میں نے اس سے دوسرا سوال کیا۔

"آپ جس کام سے تشریف لائی ہیں براہ کرم آپ مجھے اس کام سے آگاہ کریں اور ہاں آپ کیا پئیں گی؟۔ ویسے میرا خیال ہے اس خنک موسم میں آپ کے لئے چائے بہتر ہو گی۔"

"جی نہیں شکریہ"۔ اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ اور میں نے گہرے سانس لیتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

" تکلف کی ضرورت نہیں' خاتون اگر آپ چائے کی ضرورت محسوس کر رہی ہیں تو میں ملازم کو آواز دوں۔"

"جی نہیں' میں نے کہا نا شکریہ" اس نے جواب دیا اور میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

پھر آہستہ سے بولا "جی میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"؟

"آپ ---" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"جی' ظاہر ہے آپ کسی کام سے میرے پاس تشریف لائی ہوں گی۔ میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ حکم دیجئے۔"

لڑکی جتنی خوبصورت تھی اسے دیکھ کر کسی مصور کے ذہن کی جو کیفیت ہو سکتی تھی وہی میری بھی تھی۔ لیکن بہرصورت میں اپنے فن سے مخلص تھا۔ اپنے پیشے سے مخلص تھا اور اپنے حالات کے بارے میں بہتر طور پر جانتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنی بیوی کی امانت تھا۔ جانتا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں اور ثریا میری زندگی کی بہترین ساتھی ہے۔ میرے لئے ایثار کرنے والی ہر قدم کی ساتھی' جلوتوں کی رفیق' خلوتوں کی امین' میری زندگی کی ابتدا و انتہا اب اس کے دم سے تھی۔

یہ لڑکی بے شک ثریا سے بے حد حسین تھی اس میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اب میں اس سے عشق شروع کر دوں' اس کے علاوہ یہ بات بھی میرے لئے تعجب خیز تھی کہ لڑکی جانے بوجھے بغیر میرے پاس آ گئی اور اب مجھے اس انداز سے دیکھ رہی ہے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہے' مگر خود کو روکے رکھے ہوئے ہے۔ اس کی غیر منتشر سوچیں مجھے غلط فہمی کا شکار کر سکتی تھیں۔

چند ساعت لڑکی خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ شاید اس کی سوچیں سمٹ گئی تھیں تب وہ آہستہ سے بولی۔

"میں اپنی تصویر بنوانا چاہتی ہوں۔"

"بہت خوب۔ اب آئیں آپ مطلب پر' میرا خیال ہے باہر کی بارش نے آپ کو الجھا دیا تھا۔ آپ ذہنی طور پر غیر مطمئن تھیں۔ اور وہ نہیں کہہ پا رہی تھیں جو کہنا چاہتی تھیں۔ بہرصورت مصوری میرا شوق ہے اور فن مصوری میرا پیشہ' میں یقیناً آپ کی

تصویر بناؤں گا جو آپ کو پسند بھی آئے گی۔ اس سلسلے میں ہمیں ضروری امور پر گفتگو کر لینی چاہئے کیا آپ میری اس صاف گوئی کو پسند کریں گی؟"

"جی ہاں" اس نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹکتے ہوئے کہا۔

"خاتون آپ کچھ تھکی سی محسوس ہوتی ہیں' اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میں پھر آپ سے عرض کروں کہ آپ کچھ پی لیں۔ ہمارے سامنے والے ہوٹل میں چائے بہت اچھی ملتی ہے۔ میرا ملازم غفور ابھی چند ساعت کے بعد آپ کو چائے پلائے گا' اس دوران ہم گفتگو بھی کریں گے اور دوسرے امور بھی طے ہو جائیں گے۔"

"جی نہیں شکریہ میں چائے نہیں پیتی۔"

"کچھ اور ——"

"کچھ بھی نہیں" اس نے ناز بھرے انداز میں اپنے جملوں پر زور دیتے ہوئے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی "ضدی معلوم ہوتی ہیں آپ" میں نے کہا اور پھر معذرت آمیز انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

مجھے اس قدر جرات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں نے سوچا' لیکن لڑکی کے چہرے پر ناگواری کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کئے کرسی کی پشت سے ٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے خدوخال کو دیکھا اس کے حسین سراپے کو دیکھا اور میری نظریں اس کے جسم کے مرمریں حصوں پر جا ٹکیں۔

واقعی بے حد حسین لڑکی تھی اور بلاشبہ میں اس کی خوبصورت ترین تصویر بنا سکتا تھا۔ پھر گفتگو شروع کرنے کی خاطر کہا۔

"خاتون آپ کو میرا پتا کہاں سے معلوم ہوا؟" میرے سوال پر لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ دیر تک یک ٹک مجھے دیکھتی رہی' پھر اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی تیر گئی۔

"تمہارا پتا ——" اس نے آہستہ سے کہا۔

"جی یقیناً آپ کی کسی دوست نے مجھ سے تصویر بنوائی ہو گی۔ اتفاق سے خاتون میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ اگر آپ ان خاتون کا نام لے لیں جنھوں نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے تو میں یقیناً انہیں پہچان لوں گا۔ ان کے خدوخال تک آپ کو بتا دوں گا۔"

"تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے؟" اسنے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں میرا یہی خیال ہے اور شاید صحیح بھی ہے" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر مجھے پہچانو ——"

"جی" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں مجھے پہچانو ——"

"لل —— لیکن ——" میں گڑبڑا سا گیا۔

"تمہارا نام شکیل ہے نا؟ ——"

"جی ہاں —— جی ہاں! لیکن' لیکن —— کیا آپ مجھے جانتی ہیں؟ ——"

"جی ہاں میں آپ کو اچھی طرح لیکن اس حیثیت سے نہیں۔"

"کیا مطلب؟ ——" میں نے تعجب سے پوچھا۔

اور وہ جیسے چونک پڑی پھر آہستہ سے ترنم ریز لہجے میں ہنس پڑی۔ "کوئی مطلب نہیں آرٹسٹ' ہاں تم باتیں بہت کرتے ہو۔"

"دراصل باہر بارش ہو رہی ہے اور موسم کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ ذہنی طور پر میں کاروبار کے لئے تیار نہ تھا۔ اب آپ تشریف لائی ہیں تو جس قسم کی گفتگو آپ پسند فرمائیں۔ دراصل یہ گفتگو کاروبار سے ہٹ گئی تھی۔ ذاتی طور پر میں نے آپ سے بہت سی باتیں کیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہ باتیں آپ کو ناگوار گزر رہی تھیں۔"

"ارے نہیں —— اس انداز میں مت سوچو آرٹسٹ' اس انداز میں مت سوچو شکیل' دراصل میں بھی بے تکلفی کی عادی ہوں۔"

"جی ——" میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ عورت کے الفاظ مجھے ناگوار گزرے تھے۔ ظاہر ہے فطرتاً" تو میں کاروباری آدمی نہیں تھا۔ میری اپنی بھی کوئی شخصیت تھی

میں خود کو کوئی زیادہ حیثیت نہیں دے سکا تھا کیونکہ حالات ہی ایسے تھے' لیکن کسی زمانے
میں میں بھی اپنی پسند کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اپنی مرضی سے بولتا اور سنتا تھا' لیکن اب ----
بہر صورت میں نے ان تمام خیالات کو ذہن سے نکال دیا اور پھر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے خاتون' تو میری خواہش ہے کہ آپ اس سلسلے میں کاروباری معاملات
طے کر لیں۔"

"کاروبار --- کاروبار --- کاروبار -- کیا تمہارے ذہن پر کاروبار بہت زیادہ سوار
ہے" اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہونا بھی چاہئے --- ظاہر ہے آپ میرے پاس تشریف لائی ہیں" میرے گاہک کی
حیثیت سے --- اس صورت میں' میں اگر آپ سے کاروبار کی باتیں نہ کروں تو کیسی باتیں
کروں اور اگر دوسری صورت میں دوسری باتیں کروں بھی تو یقیناً وہ آپ کو پسند نہیں
آئیں گی۔ آپ بھی کسی ایسے آدمی سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کریں گی جو آپ کا کوئی
بھی نہ ہو' ایسی صورت میں خاتون مجھے ان باتوں کے علاوہ کیا کرنا چاہئے؟ ---"

"افوہ --- ذرا سی بات کو افسانہ بنا دیتے ہو' ہمیشہ کی عادت ہے تمہاری۔"

"جی --- " میں تعجب سے چونک پڑا' وہ تو ایسے بات کر رہی تھی جیسے وہ برسوں کی
شناسا ہو میری' میری ساری فطرت سے اچھی طرح واقف ہو لیکن میں اسے نہیں پہچان رہا
تھا اور پھر اس کی عمر' سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اس کا میری زندگی سے کوئی تعلق ہو۔
وہ بالکل نوجوان تھی اس کی زیادہ سے زیادہ عمر انیس یا بیس سال ہو گی۔ یا ممکن ہے اس
سے کچھ زیادہ ہو' خدوخال سے کوئی خاص اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں
نے اسے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

"کیا آپ مجھے ذاتی طور پر جانتی ہیں؟"

"ہاں ---" اس نے جواب دیا ---

اور یہ لمحہ میرے لئے پھر چونکنے کا تھا۔ میرے ذہن کے کسی خانے میں اس لڑکی کا
تصور کوشش کے باوجود ابھر نہ پا رہا تھا میں نے اس کی جانب دیکھا' اس کی آنکھوں میں
ع یہ کیفیت ہمیشہ آئی تھی اور یہ کیفیت پھر مجھے الجھن میں مبتلا کرنے لگی۔

میں مصور تھا' چہرے کی لکیروں سے' آنکھوں کے رنگوں سے ہونٹوں کی لرزش
سے' کانوں کی لوؤں سے' ہونٹ ہلنے کے انداز سے جذبات کی عکاسی کیا کرتا تھا' چنانچہ ان
آنکھوں کی کیفیت کو میں کیوں نہ سمجھتا اور یہ کیفیت بڑی حد تک الجھا دینے والی کیفیت
تھی' خود سپردگی تھی اس کیفیت میں' دعوت تھی اسی کیفیت میں جو میرے لئے بظاہر غیر
پسندیدہ تھی۔

اس کی آنکھوں کے ڈورے رنگین ہو رہے تھے اور چمکتی ہوئی آنکھوں میں پیار کا
سا انداز تھا۔ ..... میں بوکھلا کر رہ گیا.... دوسرے لمحے میں نگاہیں نیچے کر چکا تھا۔ تب میں
آہستہ سے بولا....

"آپ اپنی تصویر کب بنوائیں گی؟....."

"جب تم بنا دو ---- " اس نے جواب دیا۔

"دیکھیں خاتون میرا تو پیشہ ہی یہ ہے' میں دوسرے لوگوں کی مانند اپنے گھر بھی جا
سکتا تھا۔ لیکن میرے حالات مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ میں اس لئے یہاں بیٹھا ہوا
تھا کہ گاہک آئے اور مجھ سے کاروباری گفتگو کرے' تاکہ میرا کاروبار چلے' جانتی ہیں کیوں'
اس لئے کہ میں نے زندہ رہنا ہے اور اب آپ تشریف لائی ہیں' آپ حکم دیں میں بنانا
شروع کر دوں' اور ہاں کس قسم کی تصویر بنوائیں گی آپ۔"

"اس کا فیصلہ بھی تم خود ہی کر لو" اس نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔

"جی بہت بہتر' تو باقی معاملات ..... " میں اس سے سوالات کر رہا تھا اور وہ بدستور
مجھے گھورے جا رہی تھی۔ اب اس نے آنکھیں دوبارہ کھول لی تھیں البتہ گردن کرسی کی
پشت سے بدستور ٹکی ہوئی تھی' اس انداز میں تکنے سے اس کے دونوں ہونٹ خفیف سے
کھل گئے تھے جس سے وہ دانت باہر جھانک رہے تھے اور اس انداز میں بڑی ہی دلکش لگ
رہی تھی۔ لیکن میں اسے صرف ایک مصور کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا کسی عاشق کی نگاہ سے
نہیں' یا کسی ایسے بوالہوس مرد کی نگاہ سے نہیں جو عورتوں کو دیکھ کر دیوانے ہو جایا کرتے
ہیں۔

ہاں جناب میں دعوے سے کہتا ہوں کہ عورت کو دیکھ کر جنسی فطرت میرے اندر

کہیں نہیں ابھری۔ ثریا ہر طور میرے لئے بھرپور عورت تھی اور میں اس کے علاوہ کسی اور کو اس انداز میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہی سنبھل کر بیٹھ گئی اور بولی "معاف کرنا مصور میں نے تمہیں تکلیف دی۔ دراصل تمہارا سوچنا ہی درست ہے' باہر کے موسم نے اور تمہارے اس اسٹوڈیو کی خوابناک سی فضا نے مجھے بڑا متاثر کر دیا تھا اور میرے اندر اضمحلال سا پیدا ہو گیا تھا۔ بہرصورت اب میں ٹھیک ہوں ہاں تو تم ایک تصویر بنانے کا کیا معاوضہ لیتے ہو؟"

"خاتون ظاہر ہے آپ شوقین فن کے قدر دان بھی ہوتے ہیں۔ اگر میری بنائی ہوئی تصویر آپ کو پسند آ جائے تو آپ کے حالات آپ کو جس قدر بھی اجازت دیں آپ مجھے معاوضہ ادا کر دیجئے گا البتہ میں پہلے سے کسی معاوضہ کا تعین نہیں کروں گا" میں نے کہا۔

"آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں مصور۔"

"نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ انسانوں کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض لوگوں سے کاروباری گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اس میں بعض اوقات اپنا بھی گھاٹا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کچھ زیادہ دینا چاہیں اور میں ازراہ اخلاق آپ کو کم بتاؤں اور بعد میں مجھے یہ احساس ہو جائے کہ میں آپ سے جو مانگتا آپ دے دیتیں تو پھر اس گھاٹے کا بہرطور افسوس رہتا ہے۔ چنانچہ آپ تصویر دیکھ لیں اور بعد میں آپ جو کچھ عنایت فرمائیں گی مجھے قبول ہو گا۔"

"واہ تم تو انسان شناس ہو۔"

"ہاں دعویٰ تو یہی کرتا ہوں۔"

"غلط دعویٰ ہے" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیوں؟ ......" میں نے پوچھا۔

وہ ہنس دی۔ پھر بولی "خیر چلو معاوضے کی بات تو چھوڑو' ہاں یہ بتاؤ کب سے بناؤ گے میری تصویر؟" میری بات کو صاف ٹال گئی تھی۔

"جب آپ حکم دیں۔"

"کل سے"۔

"جی بہتر' کل سے بنانا شروع کر دوں گا' ہاں میں اپنے رجسٹر میں آپ کا نام درج کر لوں۔"

"جی ہاں۔"

"تب ٹھیک ہے' آپ مجھے وقت بتا دیں' جس وقت آپ تشریف لائیں میں اس وقت میں آپ کو بک کر لوں۔"

"کیا پورا دن کام کرتے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں۔ بعض اوقات جب زیادہ کام ہوتا ہے۔"

"فرض کرو میں روزانہ تمہارے پاس ایک گھنٹے کے لئے آیا کروں تو کیا تمہارے کاروباری معاملے میں کوئی حرج ہو گا؟"

"بالکل نہیں' ظاہر ہے وہ گھنٹہ آپ کے لئے مخصوص ہو گا۔"

"کتنے دن میں بن جائے گی میری تصویر۔"

"بس زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگ جائے گا۔"

"گویا ایک ہفتہ' آٹھ گھنٹے' مجھے تمہارے ساتھ صرف آٹھ گھنٹے ملیں گے۔ اس کے بعد میں کیا کروں گی۔"

"جی ---- جی ---- میں نہیں سمجھا ----"

"ٹھیک ہے مصور تو پھر کل کوئی وقت طے کر لو۔ ہاں کیا یہ ممکن ہے کہ میں کسی مخصوص وقت پر تمہارے پاس نہ آیا کروں۔ ہاں جب مجھے فرصت نہ ہو تو میں اوقات بدل لوں۔"

"خاتون یہ مناسب تو نہ ہو گا۔ ویسے میں آپ کو ایک پیش کش بھی کر سکتا ہوں" میں نے کہا۔

"کیا؟ ......"

"وہ یہ کہ اگر آپ کو خود آنے میں تکلیف ہو یا آنا آپ کے لئے غیرپسندیدہ ہو تو آپ کوئی اپنا خوبصورت سا فوٹوگراف مجھے دے دیں' میں اس سے آپ کی تصویر بنا دوں گا" میں نے کہا۔

"نہیں میں آنا چاہتی ہوں اور آتے رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تشریف لایا کریں آپ کا اسٹوڈیو ہے۔ دراصل آپ جیسے کرم فرماؤں کی وجہ سے ہی ہماری زندگی چلتی ہے۔"

"نہایت باتیں کرنے لگے ہو' ہریش"۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"جی شکیل" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں شکیل' خیر تو پھر کل سے کونسا وقت دو گے؟"

"جو آپ پسند فرمائیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے دوپہر کو دو بجے۔"

"جی بہتر میں اس وقت فارغ ہوں۔" میں نے کہا اور اپنا رجسٹر نکال لیا اور اس کا نام پوچھا۔

"پدما ----!"

"جی ----"

"پدماوتی ----" اس نے کہا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ گویا وہ مذہبا" ہندو تھی ---- بہرصورت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ پاکستان میں اب بھی بے شمار ہندو موجود ہیں اور بڑے اچھے انداز میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ان کا بھی وطن ہے یہ لوگ یہاں رہتے ہیں اور اس لحاظ سے زندگی کی آسائشیں حاصل کرنا ان کے لئے بھی ضروری ہے اور میرے نزدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ وہ ہندو ہے۔

بہرصورت میں نے اس کا نام لکھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے اس کے باپ کا نام پوچھا۔ تو اس نے کہا" جانے دیں' اس سے آپ کو کیا لینا ہے۔"

"ٹھیک ہے پدماوتی' میں نے آپ کا نام درج کر لیا ہے کل ، سے آپ تشریف لے آیا کریں" میں نے کہا۔

"بہت اچھا گویا تمہارا مقصد ہے کہ میں جاؤں۔"

"جی نہیں بیٹھیں۔ لیکن خالی بیٹھنا تو مجھے اچھا نہیں لگتا' اگر آپ چائے پی لیتیں تو

چائے کے دوران کچھ گفتگو ہو جاتی۔"

"نہیں بس اب میں جاؤں گی۔" اس نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس نے اپنا پرس کھولا اور سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میرے سامنے ڈال دی۔

"دس ہزار ----" میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے نوٹوں کی طرف دیکھا۔ آج تک جو میری سب سے مہنگی تصویر بکی تھی وہ تین ہزار کی تھی جو تصاویر میں نے بنائی تھیں وہ پانچ سو سے لے کر دو ہزار تک کی تھیں۔ لیکن یہ دس ہزار میرے لئے بڑی تعجب خیز تھے۔

جناب اعلیٰ میں اپنے آپ کو اس دور سے ہٹ کر کوئی فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ جو کچھ بیتا ہے جو کچھ ذہن میں ہے جو کچھ سوچتا تھا وہ سامنے بے کم و کاست آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

دس ہزار کی یہ گڈی میرے ہاتھوں میں آگئی۔ گو میرے پورے بدن میں لرزش تھی' میں انتہائی کوشش کر کے اس لرزش کو چھپا رہا تھا۔ لیکن میرے دل میں مسرتوں کے سوتے ابل رہے تھے۔ تب میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ رقم -----"

"ہاں اسے بطور ایڈوانس قبول کر لو اور باقی تصویر کے مکمل ہونے کے بعد" اس نے کہا ---- اور آپ یقین کریں میری ٹانگیں بے کار ہونے لگیں' گویا اس کے بعد بھی کچھ ملنے کی امید تھی ----

ممکن ہے وہ کسی بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہو۔ اپنی خوشی سے دے رہی تھی تو پھر مجھے قبول کر لینا چاہئے تھا اگر بعد میں واپس مانگا تو واپس بھی دیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ کاروباری اصول کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے میں نے تو اس سے نہیں مانگا تھا۔ اور صرف اپنے مقصد کی بات کی تھی اور اگر وہ مجھے اتنی بڑی رقم دینے پر تیار تھی تو میں اسے کیا کہہ سکتا تھا۔ بہرصورت میں نے نوٹوں کی گڈی جیب میں رکھ لی اور پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اسے چھوڑنے باہر تک نہ آتا۔

بارش اب رک چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں کبھی کبھی آسمان سے ٹپک پڑتی تھیں لیکن میں نے دیکھا کہ باہر کوئی کار نہیں ہے۔ اس نے آہستہ سے میری جانب دیکھا اور

الوداعی نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میں تعجب سے اس کو دیکھتا رہا تھا بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی کہ خاتون آپ کی گاڑی کہاں ہے' یا میں آپ کے لئے ٹیکسی وغیرہ کا بندوبست کردوں' یہ تو حد سے آگے بڑھنے والی بات تھی اور میں حد سے آگے بڑھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی نگاہوں سے جو کچھ میں نے محسوس کیا تھا وہ اب بھی میرے ذہن میں خلش بن کر چپکا ہوا تھا۔ وہ سیدھی جاتی رہی اور تھوڑی دیر بعد میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

میں جلدی سے اندر آگیا تھا' اس کا پیار بھرا انداز' اس کی اپنائیت آمیز گفتگو میرے ذہن میں ابھر آئی۔ بہرصورت میں نے سر کو جھٹکا اور کرسی پر گر کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

جو کچھ ہوا تھا وہ میرے لئے تعجب خیز تھا۔ لڑکی بلاشبہ پراسرار تھی۔ لیکن مجھے اس کی پراسراریت سے کیا واسطہ' وہ تو مجھے دس ہزار روپے کی رقم دے گئی تھی اور یہ رقم میری زندگی بدلنے کے لئے کافی تھی۔ ٹھیک ہے میرے حالات اتنے برے نہ رہے تھے' میں مہینے میں پانچ چھ ہزار آرام سے کما لیا کرتا تھا اکثر اس سے بھی زیادہ ہو جاتا تھا' چنانچہ زندگی بہتری کی طرف گامزن تھی۔ یہ دس ہزار ---- اور اس کے بعد ----

آہا ---- میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اگر ایسے ہی کچھ کرم فرما اور مل جائیں تو میرا خیال ہے میں اپنی پرانی زندگی پھر حاصل کر لوں گا۔ ثریا کی قسمت جاگ اٹھے گی اور ہم دونوں بہت خوبصورت سے مکان میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے ہاں ممکن ہو سکا تو ایک چھوٹی سی کار بھی خریدی جائے گی۔ جس میں میں شام کو ثریا کو بٹھا کر شہر کے مختلف علاقوں کی سیر کرایا کروں گا۔ میں نے تصور میں بہت سارے خواب دیکھ ڈالے۔

اب دکان میں بیٹھنے کی ہمت بھی نہ رہی تھی۔ اس رقم کو ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا اور پھر بار بار یہ تصور بھی آ رہا تھا کہ اس کے بعد اور رقم بھی ملے گی۔ چنانچہ میں نے کاروباری اصول کو بالائے طاق رکھا اور جلدی جلدی' دکان بند کرنے لگا۔

ثریا نے اتنی بڑی رقم دیکھی تو وہ بھی خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے تفصیل بتائی لیکن ذرا سی ردوبدل کر کے میں نے اس حسین سی لڑکی کا تذکرہ ضرور کیا لیکن

اس کے انداز کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔

ظاہر ہے ثریا بھی عورت تھی اور میں بھی اتنا ناتجربہ کار نہیں تھا کہ اس کے ذہن میں کسی شک و شبہ کو جنم دیتا جبکہ عورت بذات خود ہی بہت شکی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے مسکرا کر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں کوئی اور معاملہ تو نہیں ہے؟"

"کیا مطلب؟ ---" میں چونک پڑا ---

"کیا سمجھتے ہو خود کو' میری آنکھوں سے دیکھو' اب بھی بہت سی نثار ہونے کو تیار ہوں گی۔"

"کیا میں میں لگا رکھی ہے ثریا۔ بجائے اس کے کہ تم رقم کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرو تم اس قسم کی باتیں کر رہی ہو۔" میں نے کسی قدر برا ماننے والے انداز میں کہا۔

' ارے ارے آپ برا کیوں مان رہے ہیں' اس میں تو آپ کی تعریف کا ہی پہلو ہے۔"

"نہیں مجھے ایسی تعریف نہیں چاہئے' میرے سامنے اگر کوئی آسمان سے حور بھی اتر آئے تو میں اسے نگاہ بھر کر نہ دیکھوں گا۔ کیا سمجھتی ہیں آپ مجھے ---- میرا اپنا بھی تو کوئی کردار ہے۔"

"میں جانتی ہوں شکیل' مذاق کر رہی تھی اس میں آپ برا مان گئے۔" ثریا نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"جی نہیں ---- میں تو آپ کو آزما رہا تھا۔ اچھا ثریا ایک بات تو بتاؤ کہ اگر میری زندگی میں کوئی ایسی عورت داخل ہو جائے تو تم کیا کرو گی۔"

"کچھ نہیں کروں گی۔ شکیل۔ میرا شکیل ہے ہی اتنا شکیل کہ ہر کوئی اسے چاہ سکتا ہے۔" ثریا نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن مجھے بام ثریا پر پہنچانے والی ثریا ہی ہے اور اس کے علاوہ مجھے کسی کی چاہت کی فرصت نہیں ہے۔" میں نے اسے بانہوں میں بھر کر کہا اور ثریا ہنسنے لگی۔

بہرصورت وہ دن ہمارے لئے کافی خوشی کا دن تھا۔ بلکہ ایک طرح سے تو میں یہ

کہوں گا کہ ابر رحمت واقعی میرے لئے ابر رحمت بن کر آیا تھا جو اتنا اچھا گاہک مل گیا لیکن رات کو جب ثریا سو گئی تو میں نے اس لڑکی پر غور کیا۔

ثریا کی تصویر ایک حقیقت بھی رکھتی تھی میں نے جو کچھ محسوس کیا تھا اس کا لب لباب یہی تھا کہ لڑکی کے ذہن میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی ایسی بگڑی ہوئی رئیس زادی ہو جس کے نزدیک دس' پانچ پچاس ہزار روپے خرچ کر دینا کوئی بات نہ ہو' وہ اتفاقیہ ہی بارش سے گھبرا کر میرے اسٹوڈیو میں چلی آئی ہو اور پھر مجھے دیکھ کر اسے فلمی رومان کا شوق ہو گیا ہو۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ وہ پیدل کیوں گئی تھی' اگر وہ کسی بڑے آدمی کی بیٹی ہوتی تو کار میں آئی ہوتی' لیکن ممکن ہے کوئی واقعہ کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہو کہ وہ چند ساعت کے لئے پناہ لینے کے لئے میرے پاس آئی ہو اور اس نے سوچا ہو کہ اسٹوڈیو ہے چلو تصاویر ہی بنوا ڈالوں۔ لیکن ---- لیکن وہ میرا نام کیسے جانتی تھی ---- میرے خیالات بہت الجھے ہوئے تھے۔ اگر وہ میرا نام جانتی تھی تو پھر ظاہر ہے اس نے کہیں سے سنا ہو گا اور باقاعدہ میرے پاس آئی ہو گی۔ لیکن اس موسم میں اور اس انداز میں' وہ الجھی الجھی سی' ہونہہ' ہو گا' کچھ جب میں پریشان ہو گیا تو میں نے اپنے خیالات کو جھٹکا۔

ہاں مجھے تو تصویر بنانے سے غرض تھی۔ کل دو بجے وہ آئے گی اور میرا خیال تھا کہ میں ذاتی قسم کی گفتگو اس سے جس قدر ہو سکے کم کروں' وہ کافی بے تکلف لڑکی معلوم ہوتی ہے اگر گلے پڑ گئی تو خواہ مخواہ کی مصیبت بن جائے گی۔ بس تصویر بناؤں گا اور خشک رویہ اختیار کروں گا اور اب تو چائے کے لئے بھی نہیں پوچھوں گا بے وقوف سے' اس وقت میں نے پوچھا تھا تو کتنی صفائی سے ٹل گئی تھی ----

نجانے کیسی لڑکی تھی' دیر تک میں اسی کے خیالات میں الجھا رہا اور جب نیند نے پلکیں جوڑ دیں تب وہ میرے ذہن سے نکلی۔

دوسری صبح میں ہشاش بشاش تھا۔ آدمی کے جاگنے کے بعد کچھ اچھی باتیں ذہن میں آ جائیں تو دن خوشگوار گزرتا ہے۔ ثریا سے خاصی نوک جھونک چلتی رہی' بڑی پیاری بیوی تھی لیکن ابھی تک میری محبوبہ تھی۔ حالانکہ میری شادی کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔

بہرصورت میں وقت مقررہ پر اپنے اسٹوڈیو پر چل پڑا۔

اسٹوڈیو پہنچ کر میں نے دوکان کھولی' کل کی بارش سے سڑکوں پر کچھ گندگی ہو گئی تھی لیکن بہرصورت موسم میں خاصی خوشگوار کیفیت تھی۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی اور بھی گاہک آ جاتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ حالانکہ میں یکسوئی سے کام کرنے کا عادی تھا لیکن جب اس لڑکی نے مجھے اتنی بڑی رقم دی تھی تو میں سوچ رہا تھا کہ اسے بنا کر بھی کوئی شاہکار ہی دوں۔

دن کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے وہ شخص بھی آ گیا جس کی تصویر بنا کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے ادائیگی کی اور اپنی تصویر دیکھ کر خوش ہو گیا کچھ معمولی سی ردوبدل بھی کرائی تھی اس نے جسے میں نے اسی وقت ٹھیک کر دیا اور ان سارے کاموں سے میں تقریباً ایک بجے تک فارغ ہو گیا۔

اس کے بعد غفور ایک بجے کھانا لے آیا۔ میں نے کھانا کھایا اور کھانا کھانے کے بعد چند ساعت کے لئے آرام کرنے کی غرض سے کرسی میں دراز ہو گیا۔ دو تین سگریٹ پئے اور اس کے بعد گھڑی دیکھنے لگا۔

دو بجنے میں صرف دو منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اور ابھی میں نے گھڑی پر سے نگاہیں ہٹائی بھی نہ تھیں کہ دروازہ کھول کر وہ اندر آ گئی۔ آج وہ سیاہ رنگ کی ایک خوبصورت سی ساڑھی میں ملبوس تھی۔

کل کی نسبت آج اس کے چہرے پر زیادہ خوشگواریت تھی۔ بال بھی خوبصورت انداز میں بنے ہوئے تھے۔ بہرصورت وہ تصویر کے لئے موزوں نظر آ رہی تھی اور اگر میں اسے کسی مرد کی نگاہ سے دیکھتا تو بلاشبہ دل تھامنے والی بات تھی۔ لیکن وہاں تو صاحب دل تھامنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ ذہن میں کسی دوسرے کے لئے گنجائش ہی نہ تھی چنانچہ میں نے پرجوش انداز میں اسے خوش آمدید کہا ----

اس کے لئے کرسی کی گرد بھی صاف کی اور اسے بیٹھنے کی پیش کش بھی کی' وہ بیٹھ گئی۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی' حسین مسکراہٹ' میں کہتا ہوں کوئی جواب نہیں

تھا اس مسکراہٹ کا بہرصورت میں نے اسے بڑے پرتپاک انداز میں خوش آمدید کہا تھا۔

"جی مسٹر شکیل آپ تیار ہیں۔"

"ہاں خاتون میں نے ساری تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔"

"تو پھر آیئے چلیں۔" اس نے کہا۔

"چلیں" میں نے جواب دیا اور اسے ساتھ لے کر اسٹوڈیو کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں دوسرے لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر میں کام کرتا تھا تو غفور باہر ضرور موجود ہوتا تھا۔ تاکہ دوسرے لوگوں کو اندر نہ آنے دے۔ کچھ کاروباری اصول تھے جن پر میں سختی سے عمل کرتا تھا اور ان کا پابند تھا۔

میں نے اسے اپنی منتخب کی ہوئی جگہ پر بٹھایا' سامنے ہی ایزل پر بہت بڑا کینوس لگا ہوا تھا میں نے اس سے تصویر کے سائز کے بارے میں پوچھا۔

"دیکھو مصور یہ تمہارا کام ہے۔ کتنی بڑی تصویر بناؤ گے۔ کیسی بناؤ گے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں' بس تم مجھے کینوس پر منتقل کر دو" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے بھی گردن کو خفیف سا ہلا دیا۔

"بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ لیکن کیا یہ تصویر آپ اپنے ڈرائنگ روم میں لگائیں گی۔ اگر میں آپ کا ڈرائنگ روم کا منظر دیکھ سکتا تو آپ یقین کریں میں اس کے لئے کوئی بہت ہی موزوں جگہ تلاش کر لیتا اور پھر اس کی مناسبت سے تصویر کا سائز بھی رکھتا۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں' بس اپنی پسند سے کسی بھی سائز کی تصویر بنا دو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں اسے کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کر لوں گی" لڑکی نے جواب دیا۔

"بہتر" میں نے کہا اور پھر میں نے اسے مختلف انداز میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ بڑے بڑے آئینے اس کے نزدیک کھسکا دیئے تاکہ وہ اس پوز کو دیکھ لے جس کی وہ تصویر بنانا چاہتی ہے۔ لیکن لڑکی نے تمام باتوں سے غیر دلچسپی کا اظہار کیا تھا' بس یوں لگتا تھا جیسے وہ تصویر سے' کوئی دلچسپی نہ رکھتی ہو۔ بلکہ صرف میری قربت کی خواہش مند ہو۔

یہ تصور میرے لئے بڑا احمقانہ تھا' بھلا مجھ جیسا آدمی اپنے آپ کو اس قدر افلاطون

کیسے سمجھ سکتا تھا۔ روزی کمانے کے لئے دن رات محنت کرنا پڑتی تھی۔ اور سوچتا کسی ایسی لڑکی کے لئے جو بہرصورت مجھے ایک تصویر کی قیمت دس ہزار سے زیادہ ادا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ ایسی لڑکی سے عشق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا چاہے وہ کوئی کنوارہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے اپنی پسند کا پوز بنایا اور پھر پنسل لے کر اس کا اسکیچ بنانے لگا۔ آؤٹ لائن بناتے وقت میں نے کئی بار اس کی جانب دیکھا اس کی نگاہوں میں بڑا ہی میٹھا پن تھا' وہ بڑے انداز میں مسکراتی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اور یہ مسکراہٹ عجیب سا سحر رکھتی تھی۔ تب اس نے آہستہ سے پہلو بدلا اور میں نے اسے ٹوک دیا۔

"دیکھئے خاتون' ہاں کیا آپ مجھے اپنا نام نہیں بتائیں گی۔"

"بھول گئے مصور' تم تو کہتے تھے کہ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔"

"پدماوتی" اس نے تصحیح کی۔

"ہاں پدماوتی میرا کہنے کا مقصد یہ ہے مس پدماوتی کہ آپ براہ کرم اپنے انداز میں تبدیلی نہ کریں۔"

"اس طرح تو بیٹھے بیٹھے تھک جاؤں گی میں۔"

"بس چند ساعت' میرا خیال ہے کم از کم آپ مجھے پانچ منٹ ضرور دیں۔ اور اس کے بعد پہلو بدل لیا کریں۔ پانچ منٹ میں کام کروں گا اور اس کے بعد دس منٹ آپ کو آرام کرنے کی اجازت ہو گی۔"

"ٹھیک ....." اس نے مجھ سے تعاون کرتے ہوئے کہا اور میں اس کا ادھورا اسکیچ مکمل کرنے لگا۔

پھر وہ پانچ منٹ اس انداز میں پوز دیتی رہی جیسا کہ میں نے اسے بتایا تھا۔ اور میرا ہاتھ تیزی سے کینوس پر چلتا رہا۔ میں اسے لکیروں میں منتقل کر رہا تھا۔

کافی دیر تک میں اس کی تصویر بناتا رہا اور اس دوران میں نے صاف محسوس کیا کہ بلا شبہ اسے تصویر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس وہ مجھ سے باتیں کرنے کی خواہش مند تھی پھر ٹھیک تین بجے میں نے اس سے معذرت چاہی۔

"مس پدماوتی' مجھے افسوس ہے میں نے ابھی دوسرے گاہکوں کو بھی ٹریٹ کرنا ہے

اور اب آپ سے کل ملاقات ہوگی۔"

"بڑے ہی کاروباری ہو گئے ہو" اس نے پیار بھرے انداز میں کہا اور چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اسے بھول گیا تھا جس بورڈ پر میں نے کینوس لگایا ہوا تھا اسے میں نے محفوظ کرلیا اور دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا۔

آج شام کو میرے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں تھی' ثریا کے ساتھ کافی دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ رات ہوئی سو گیا۔

دوسرے دن کا کام حسب معمول تھا۔ ٹھیک دو بجے وہ پہنچ گئی۔ اور پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔

اسے آتے ہوئے آج پانچواں دن تھا تصویر تیزی سے مکمل ہو رہی تھی میں اس کا اسکیچ تقریباً مکمل کر چکا تھا اب صرف اسے رنگ دینا تھے۔ میں نے اسکیچ اسے دکھایا اور اس نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتی کہ فن مصوری کیا ہے۔ اور میں یہ بھی نہیں جانتی کہ تم نے ان لکیروں کا کھیل کیوں اپنا لیا ہے۔ لیکن بہرصورت جو کچھ تم بناؤ گے وہ اچھا ہی ہو گا۔ یہ تو تمہاری فطرت ہے ہریش" اس نے آہستہ سے کہا۔

اور میں چونک پڑا تھا۔ تب میں نے کہا۔

"مس پدما' آپ پہلے بھی ایک بار مجھے ہریش کہہ چکی ہیں" میں نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ابھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔ پہلے میری تصویر مکمل کر لو۔"

"کیوں۔ کوئی خاص بات ہے کیا" میں نے سوال کیا اور وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"تین بج گئے ہیں اب مجھے چلنا چاہئے" اور اس کے بعد وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر واپسی کے لئے مڑ گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں پیچھے سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ کیا یہ لڑکی کسی غلط فہمی کا

شکار ہے۔ میں نے سوچا' ہندو ہے اور ہاں ہریش —— ہریش بھی تو ہندو نام ہی ہے لیکن اس نے مجھے ہریش کہہ کر کیوں مخاطب کیا' ممکن ہے اس کا کوئی دوست' ساتھی' عزیز رشتہ دار میری شکل سے ملتا جلتا ہو۔

اوہ --- یہ ہی وجہ ہو سکتی ہے' وہ تصویر بنوانے میں اتنی دلچسپی نہیں رکھتی بس میرے پاس آتی ہے۔ مجھ سے باتیں کرتی ہے' انوکھی باتیں جن کا کوئی سرپاؤں نہیں ہوتا' لیکن وہ ایک گھنٹہ بڑی ہنسی خوشی گزارتی ہے ہاں کبھی کبھی مغموم بھی ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے اس کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ ہوا ہو۔ ممکن ہے اس کا کوئی قریبی عزیز؟ کوئی دوست اس سے بچھڑ گیا ہے اور وہ میری شکل میں اسے دیکھنے آ جاتی ہو' ممکن ہے اس کا نام ہریش ہی ہو۔

بہرصورت احتیاط شرط ہوتی ہے جناب' چنانچہ ثریا سے میں نے اس بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ میں ساری باتیں اسے بتا دیا کرتا تھا لیکن اگر یہ بات اسے بتا دیتا تو یقینی طور پر ثریا پریشانیوں کا شکار ہو جاتی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک بے مقصد بات پر میری پیاری بیوی پریشانیوں کا شکار ہو جائے۔

آٹھویں دن حسب وعدہ میں نے اس کی تصویر مکمل کر دی میرے پاس کچھ اور نامکمل تصویریں بھی تھیں جو اس دوران میں نے مختلف لوگوں کے لئے شروع کی تھیں' کچھ اور لوگ بھی تھے جن کا میں کام کر رہا تھا۔ لیکن بہرصورت میں وقت پر کام کرنے کا عادی تھا۔

اس دن میں نے اس کی تصویر کو آخری رنگ دیا۔ اب مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اور اس کے لئے میں نے اسے کہہ بھی دیا اس کے باوجود وہ آتی رہتی تھی اور مجھے تصویر بناتے ہوئے دیکھتی رہتی تھی۔ کئی بار اس نے مجھ سے عجیب سے سوالات کئے تھے۔

"تم اس تصویر کو جو رنگ دے رہے ہو کیا ان کا تمہارے ذہن سے بھی کوئی تعلق ہے مصور ----" اس نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے گہرا تعلق ہے" میں نے جواب دیا۔

"یعنی"۔

"خاتون میری خواہش ہے کہ میں اسے ایک ایسی تصویر بنا کر آپ کو پیش کروں جس کا کوئی ثانی نہ ہو' اس کے لئے میں اس میں خوبصورت سے خوبصورت رنگ بھرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ ---- تو کیا صرف اس تصور نے تمہیں اتنی حسین تصویر بنانے پر مجبور کر دیا ہے" اس نے پوچھا

"ظاہر ہے یہ میرا فن ہے"۔

"میں سمجھی تھی کچھ اور ----"

"کیا مطلب؟"

"میں سمجھی تھی تم ان رنگوں کو اپنے دل میں سجا رہے ہو۔"

"آپ اس بات سے انکار تو نہیں کر سکتیں۔ ظاہر ہے جس چیز سے دل نہ لگایا جائے وہ کبھی من پسند نہیں بن سکتی۔"

"ٹھیک ہے' اس دوران ایک بار بھی تمہیں میری صورت یاد نہیں آئی" اس بار اس نے ایک انوکھا سوال کیا۔

"کیا مطلب؟ ----"

"تم مجھے مستقل دیکھتے رہے ہو ہریش۔"

"پدما دیوی کیا آپ مجھے یہ بات نہیں بتائیں گی کہ آپ بار بار مجھے ہریش کہہ کر کیوں مخاطب کرتی ہیں۔"

اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس مسکرا کر رہ گئی اور پھر اس دن بھی چلی گئی۔

بہرصورت تصویر قطعی طور پر مکمل ہو چکی تھی۔ میں نے اسے بورڈ سے اتار دیا اور پیک کر کے رکھ دیا۔

دوسرے دن وہ آئی اور حسب معمول مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی میں نے بھی مسکرا کر اس کا استقبال کیا تھا۔ تب اس نے مسکراتے ہوئے بورڈ کی جانب دیکھا اور چونک

کر بولی۔

"ارے میری تصویر کہاں گئی یہاں سے ---"

"مکمل ہو گئی" میں نے جواب دیا۔

"تو تم نے اسے کینوس بورڈ سے اتار دیا۔"

"ہاں۔ ظاہر ہے۔"

"کیوں؟"

"بھئی مکمل تصویر کو لگائے رکھنے سے کیا فائدہ۔"

"ہوں" وہ بے خیالی میں عجیب سے انداز میں بولی جسے میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا آپ اسے لے نہیں جائیں گی۔"

"کہاں ہے ----" اس نے میرے سوال کا جواب دیئے بغیر کہا اور میں پیک شدہ تصویر اٹھا لایا۔

میں نے تصویر کھول کر اس کی نگاہوں کے سامنے کر دی اور وہ تصویر دیکھنے کی بجائے میری صورت دیکھنے لگی۔ آج اس کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی پھر اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

"گویا یہ تصویر مکمل ہو گئی۔"

"ہاں --- آپ دیکھیں اگر اس میں کوئی خامی یا کمی رہ گئی ہو تو مجھے بتا دیں میں مکمل کر دوں۔"

"ہاں اس تصویر میں ایک بہت بڑی خامی ہے" اس نے سنجیدگی سے کہا اور میں سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"جی فرمایئے۔ میرا خیال ہے اگر آپ اس کی نشاندہی کر دیں تو میں آپ کی شکایت دور کر سکتا ہوں۔"

"اس تصویر میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ تمہیں تمہارا ماضی یاد نہیں دلا سکی۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا ماضی؟ —"

"ہاں ---!"

"کون سا ماضی۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ ماضی جو تمہارے ذہن سے اوجھل ہے' وہ ماضی جو تمہارے پچھلے جنم کی یاد ہے۔"

"خاتون آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں ہریش' بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں" وہ جذباتی لہجے میں بولی "میں نے یہ تصویر صرف اس لئے بنوائی تھی کہ تمہیں تمہارا ماضی یاد دلاؤں' تم اس کے بارے میں سوچو' یہ خدوخال تمہارے ذہن میں ابھریں۔ اور میں تمہیں یاد آ جاؤں۔ لیکن افسوس صد افسوس تمہارا ذہن سو چکا ہے' تمہارے ذہن پر اتنی گرد پڑی ہوئی ہے کہ تم کچھ بھی یاد نہیں کر سکتے۔ تم سو چکے ہو ہریش' تم سو چکے ہو جاگو' میں کہتی ہوں جاگو' مجھے اس تصویر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں جگانا چاہتی تھی کیا تم کبھی نہیں جاگو گے۔ کیا تم خود کو بیدار نہیں کرو گے۔ ہریش سوچو میں کہتی ہوں کچھ تو سوچنے کی کوشش کرو" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"پدما دیوی' نجانے آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں تو آپ کی ایک بات بھی نہیں سمجھ سکا۔"

"اوہ ٹھہرو" اس نے آہستہ آہستہ سے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

"تو تمہیں کبھی کچھ یاد نہیں آئے گا۔"

"آپ مجھے کیا یاد دلانا چاہتی ہیں' یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے کسی قدر جھنجلا کر کہا۔

"ہاں" اس نے ایک گہری سانس لی "میں تمہیں صرف یہ یاد دلانا چاہتی ہوں کہ تم کبھی ہریش تھے۔"

"پدما دیوی کیا آپ آواگون کے کسی مسئلہ کو چھیڑنا چاہتی ہیں۔"

"نہیں۔ لیکن میں تمہیں یہ یاد دلانا چاہتی ہوں کہ تم ہریش ہو۔"

"پدما دیوی' میں جانتا ہوں کہ میں ہریش نہیں شکیل ہوں' اور آپ آواگون کے مسئلہ کو چھیڑ رہی ہیں۔ لیکن میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آواگون آپ کا عقیدہ ہے۔ ہمارا نہیں۔ میرا مذہب دوسرا ہے آپ کا مذہب دوسرا ہے۔ اور اس لحاظ سے آپ اگر آواگون کے سلسلے میں مجھے متاثر کرنا چاہتی ہیں تو میں آپ سے معذرت کروں گا کہ ایسی بات نہیں ہے میں بچہ نہیں ہوں۔ مضبوط عقیدوں پر میری زندگی کی اساس رکھی گئی ہے۔ ایسی صورت میں جب میں اس قدر پختہ ہوں تو آپ مجھے میری عقیدے سے کیسے متزلزل کر سکتی ہیں۔ اور پھر اگر ایک عورت کی حیثیت سے آپ مجھ پر کوئی تاثر چھوڑنا چاہتی ہیں' تو میں اس کے لئے بھی معافی کا خواستگار ہوں کیونکہ میں شادی شدہ ہوں۔ میں اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ اس صورت میں میری درخواست ہے کہ آپ اس سلسلے کو ختم کر دیں۔" وہ میری باتیں سنتی رہی اور اس کے چہرے پر مایوسیاں امنڈتی رہیں۔

"ہریش ہریش مجھے اتنا مایوس نہ کرو' مجھے اتنا مایوس نہ کرو' مجھے اتنا مایوس نہ کرو' ہریش کہ میں خود کشی کر لوں' میں یہ سنسار چھوڑ دوں' ہمیشہ کے لئے اور پھر بھگوان سے پرارتھنا کروں کہ وہ مجھے کوئی دوسرا جنم دے میں اس کے بعد جنم لے کر کیا کروں گی' میں تمہاری دیوانی ہوں ہریش میرا نام پدما ہے پدما اور تم پدما کے ہریش ہو میں تمہیں وہ ماضی یاد دلانا چاہتی ہوں۔ جس میں ہم تم دونوں پریم جوت جگاتے تھے ہم ایک دوسرے کے بنا سانس تک لینا پسند نہیں کرتے تھے' لیکن آج تم مجھ سے اتنے دور ہو چکے ہو میں تو تمہیں نجانے کہاں کہاں تلاش کرتی پھری ہوں ہریش۔" وہ مضمحل انداز میں بولی۔

"پدما دیوی۔ میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں یہ آپ کا عقیدہ ہے میرا نہیں' ہم لوگ دوسرے انداز میں سوچتے ہیں ہم صرف ایک بار پیدا ہوتے ہیں اور مرجاتے ہیں' فنا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کسی دوسرے جنم کا تصور نہیں ہے۔ اس لئے مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی باتوں سے متاثر نہیں ہو سکا۔ اور براہ کرم آپ ان خیالات کو ذہن سے نکال دیں میں آپ کو ہمدردی کے سوا کیا دے سکتا ہوں۔"

"نہیں ہریش تم مجھے اپنا پریم دو گے' تم مجھے اپنا پریم دو گے ہریش' تم میرے ساتھ

چلو گے ہم دونوں ساتھ ساتھ مرجائیں گے' اس امید میں کہ جب دوسرے جنم میں ہم اس سنسار میں آئیں گے تو یکجا ہو جائیں گے میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں ہریش تمہاری قربت چاہتی ہوں تم ---- تم میرا ساتھ دو گے ہریش دو گے نا؟"

"جی معاف کیجئے میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے مجھے اپنی بیوی بہت عزیز ہے ویسے پدما دیوی اگر آپ کو یہ تصویر پسند نہیں ہے اور آپ اسے نہیں لے جانا چاہتیں تو نہ لے جائیں میرا فن میرے اوپر بوجھ نہیں ہو گا میں آپ کی رقم بھی واپس کرنے کو تیار ہوں لیکن اللہ کے واسطے اب آپ کچھ نہ کہئے گا' اس لئے کہ میں معروف آدمی ہوں اس چھوٹی سی دوکان میں اپنی روزی کمانے کے لئے بیٹھا ہوں کہانیاں سننے کے لئے نہیں۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"ہریش' اتنے کٹھور نہ بنو ----" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"میں آپ سے عرض کر چکا ہوں پدما دیوی کہ میں ان باتوں کو پسند نہیں کرتا اور نا ہی میں اس قسم کی باتیں سننے کا عادی ہوں براہ کرم آپ کا کام مکمل ہو چکا ہے ہاں اگر آپ چاہیں تو مجھے میری رقم کی ادائیگی کر دیں اور یہ تصویر لے جائیں۔"

وہ دیر تک مجھے دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے تھے پھر اس نے اپنا پرس کھولا اور نوٹوں کی ایک بڑی گڈی نکال کر میرے سامنے رکھ دی کافی بڑی رقم تھی میں حیران ہو گیا۔ دس ہزار پہلے اور اب تقریباً اس سے گنا روپیہ ایک لمحے کے لئے دنگ سا رہ گیا۔

چنانچہ میں نے تصویر دوبارہ پیک کر دی اور اسے اس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"یہ آپ کی امانت۔"

"نہیں ہریش میں اسے نہیں لے جاؤں گی۔" وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی اور میں نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"جی؟ -----"

"ہاں اسے اپنے پاس رکھ لو' اسے اپنے پاس رکھو اور اسے دیکھ کر کبھی یاد آؤں تو اپنا ماضی یاد کر لینا۔ اور اگر میں تمہیں یاد آ جاؤں تو مجھے آواز دے لینا' میں تم سے زیادہ

دور نہ رہوں گی۔" اس نے کہا اور واپس جانے کے لئے مڑ گئی۔

"دیکھئے پدما دیوی یہ میرے اوپر بوجھ بن جائے گی میں چاہتا ہوں کہ جس چیز کے پیسے وصول کر چکا ہوں' وہ اس کے مالک کے حوالے کر دوں۔" اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور باہر نکل گئی میرے سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

میں' پریشانی سے شانے ہلائے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں بہر صورت حالات جس انداز میں میرے سامنے آئے تھے وہ سمجھ میں نہ آنے والے تھے لیکن مجھے کیا' رقم وصول ہو گئی تھی۔ اور اگر وہ پاگل ہے اور دیوانگی کی حرکتیں کر رہی ہے تو میرا بگڑتا بھی کیا ہے چنانچہ میں نے تصویر کو پیک کر کے احتیاط سے رکھ دیا۔

رقم میں نے جیب میں ڈال لی تھی اور اب میرے حواس قابو میں نہیں تھے اتنی بڑی رقم تھی کہ اس سے میں بے شمار کام نکال سکتا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ وہ رقم میرے مستقبل کے لئے بہت بڑا سہارا تھی۔

میں نے بڑے بڑے منصوبے بنائے اور اپنے اسٹوڈیو کی نئی تعمیر شروع کر دی' میرا اسٹوڈیو توسیع پا رہا تھا تب میں نے کچھ اور زمین خرید لی اور اس کی تعمیر شروع کرا دی روزانہ پدما کا انتظار کرتا کہ ممکن ہے وہ اب آئے۔ اب آئے لیکن وہ نہ آئی تصویر میں نے احتیاط سے رکھ دی تھی ایک بار بھی میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔ جب مجھے اس سے دلچسپی نہیں تھی تو میں بار بار اسے دیکھنے کی کوشش کیوں کرتا؟

میرا کام کچھ اور توسیع پا گیا تھا۔ اسٹوڈیو میں نے کافی بڑا کروا لیا تھا اور اب اس میں کچھ اور شعبے بھی قائم کر لئے تھے جن میں فوٹوگرافی بھی شامل تھی' اس طرح میرا کاروبار وسعت پانے لگا۔ بلا شبہ اس میں پدما کی اعانت بھی شامل تھی لیکن وہ لڑکی جو کچھ چاہتی تھی میں وہ نہیں کر سکتا تھا البتہ جب مجھے اس کا خیال آتا تو میں سخت حیران ہو جایا کرتا تھا۔ اس واقعہ کے تقریباً چھ ماہ بعد ایک شام جب میں اسٹوڈیو کے کمرے میں بیٹھا تھا تو کسی نے بیل بجائی اور چپراسی نے اندر جھانکا۔

"صاحب ایک بی بی جی ملنے آئی ہیں۔" اس نے کہا۔

"بھیج دو ----" میں نے جواب دیا۔

اور چند ساعت کے بعد وہ ایک خوبصورت ساڑھی میں ملبوس اندر آگئی' ناممکن تھا کہ میں پدما کو نہ پہچان سکتا البتہ اتنے دن کے بعد اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی وہ اندر آکر کھڑی ہو گئی۔

"تشریف رکھئے۔"

"پہچانے بھی نہیں۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیوں نہیں۔"

"پر تمہارے لہجے میں اتنی اجنبیت ہے۔"

"آپ کا احساس ہے پدما دیوی ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ہوں پورے چھ مہینے ہو گئے۔"

"ہاں آپ کی امانت میرے پاس موجود ہے۔"

"تم نے اسے پھر کبھی دیکھا؟"

"اتنی مصروفیت ہے کہ اس کی فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"بڑے کٹھور ہو لیکن کیا یہ میرے ساتھ انیائے نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ روز اول ہی میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ میں آپ کے جذبات کی پذیرائی نہیں کر سکتا میرے اپنے مسائل ہیں۔"

"لیکن یہ میرا ایمان ہے میں نے تمہیں موقع دیا تھا۔" اس بار اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"زبردستی تو کوئی کسی کو پیار نہیں کر سکتا۔"

"تم نے میرے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔"

"میں تو خود بھی یہ بات آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"یہ نہ بھولو ہریش کہ میں اس اپمان کا بدلہ بھی لے سکتی ہوں۔"

"براہ کرم آپ مجھے پریشان نہ کریں۔"

"مان جاؤ ہریش مجھے غصہ نہ دلاؤ۔"

"خاتون میرا وقت بہت قیمتی ہے میں چاہتا ہوں آپ اپنی امانت لے جائیں اگر میرے لئے اور کوئی خدمت ہو تو۔"

"ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں لیکن میں تمہیں محبت کرنے پر مجبور کر دوں گی میں تمہیں سب کچھ یاد دلا دوں گی اب یہ میری آن کا سوال ہے۔"

"میں تیار ہوں۔"

"تو سنو مصور' تم ایک مصور کی حیثیت سے خاصی شہرت پا چکے ہو لیکن اب تمہاری یہ شہرت گمنامی کے گڑھوں میں جا پڑے گی —— سنو تم تصویر ضرور بناؤ گے لیکن آج کے بعد تم صرف میری تصویر بناؤ گے صرف میری" اسنے کہا اور باہر نکل گئی۔

میں استہزائیہ انداز میں مسکرانے لگا نہ جانے کیا سمجھتی ہے خود کو احمق کہیں کی لیکن ذہن بھی تھوڑا سا مکدر ضرور تھا۔

اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ واقعی پریشان کن تھا۔ ایک بہت بڑے سیٹھ صاحب کی صاحبزادی اپنا اسکیچ بنوانے تشریف لائیں بہت بڑی اسامی تھی بڑی رقم کی پیش کش کر گئی اور میں کام کے لئے تیار ہو گیا۔

ان کا نام عظمیٰ تھا پہلے دن میں نے ان کا پنسل اسکیچ بنایا اور اس سے پوری طرح مطمئن ہو گیا۔ دوسرے دن میں نے باقی کام شروع کر دیا کوئی خاص بات نہیں تھی تیسرے دن خاتون کا کام ختم ہو گیا۔ اور میں نے اپنا کام شروع کر دیا لیکن کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی اور پھر پانچ دن کی مسلسل محنت کے بعد میں نے اس شاہکار کو آخری ٹچ دیئے اور اپنے کام سے فارغ ہو گیا مکمل طور سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے تصویر کو ڈھک دیا اور فون پر عظمیٰ سے کہا اس کی تصویر تیار ہے۔

عظمیٰ بڑی دلچسپی اور اشتیاق سے آئی تھی اس کے ساتھ اس کی تین سہیلیاں بھی تھیں' عظمیٰ نے ان سے میرا تعارف کرایا اور میرے لئے تین اور آرڈر بک ہو گئے میں نے ان کی خاطر مدارت کی تھی۔

عظمیٰ نے کہا "شکیل صاحب! اب براہ کرم اشتیاق نہ بڑھائیں تصویر دکھائیں۔"

"تشریف لایئے۔" میں نے جواب دیا اور عظمیٰ اور اس کی سہیلیوں کو لئے اندر پہنچ گیا تب میں نے کینوس سے پردہ اٹھایا اور خود میں نروس ہو گیا یہ --- یہ وہ تصویر تو نہیں تھی جو میں نے تیار کی تھی۔

یہ تو --- پدما کی شکل تھی پدما جو عظمیٰ کے بدن پر سوار طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

میرا سر چکرا گیا' عظمیٰ اور اس کی سہیلیاں بھی حیران تھیں۔

"آپ نے کوئی غلط تصویر دکھائی ہے --- " عظمیٰ نے کہا لیکن میری زبان گنگ تھی۔

"یہ عظمیٰ کی شکل تو نہیں ہے۔"

"باقی سب کچھ وہی ہے۔"

"معاف کیجئے گا شکیل صاحب یہ کیا مذاق ہے؟"

"مس عظمیٰ ---- میں معافی چاہتا ہوں۔ براہ کرم آپ انتظار کریں' صرف دو دن کی مہلت چاہتا ہوں۔" میں نے پیشانی سے پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔

یہ تو کاروباری اصول کے خلاف ہے یہ آپ نے میرے بدن پر چہرہ کسی اور کا کیوں سجا دیا ہے؟"عظمیٰ نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔

"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں مس عظمیٰ صرف دو دن اور دے دیں۔"

"بہتر ہے اگر آپ فرمائیں تو میں حاضر ہو جاؤں ممکن ہے میرے خدوخال آپ کو یاد نہ رہیں۔"عظمیٰ نے کہا۔

"یہ بہتر ہو گا کل آپ تشریف لے آئیں۔" میں نے کہا وہ چلی گئی اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا یہ کیا ہوا' یہ اچھا نہیں ہوا بہرحال دوسرے دو دن میں اسٹوڈیو میں ہی گزارے تھے عظمیٰ حسب وعدہ آئی میں نے صرف اس کا چہرہ اسکیچ کیا تھا اور پھر دن بھر بہت مصروف تھا آخر فنشنگ کرنے کے بعد میں نے اس پر مطمئن نگاہ ڈالی دوسری تصویر بھی قریب ہی تھی پھر میں سو گیا اور عظمیٰ حسب وعدہ پہنچ گئی میں نے خوفزدہ نگاہوں سے تصویر کو دیکھا اور پھر عظمیٰ کے پاس آ گیا۔

"تشریف لایئے۔" میں نے کہا اور عظمیٰ اندر آ گئی لیکن اندر قدم رکھتے ہی مجھے زور کا چکر آ گیا چہرہ پھر بدل گیا تھا عظمیٰ نے مجھ سے کیا کہا میں نے کچھ نہیں سنا تھا بس میں تو بے جان سا ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

بہرحال اس کے بعد عظمیٰ تیار نہ ہوئی اس کا ایڈوانس واپس کرنا پڑا اس کی سہیلیوں کے آرڈر بھی کینسل ہو گئے اور اس کے بعد میری بربادی کا دور شروع ہو گیا کوئی تصویر بنائی اس میں پدما نمایاں ہو جاتی تھی بات صرف زنانہ تصویر کی نہیں تھی کئی مردوں کی تصویریں بنائیں ان کی بھی ایسی ہی کیفیت ہوئی کئی بار جھگڑے تک نوبت آ گئی۔

مجھے پدما کے وجود سے نفرت ہو گئی اسٹوڈیو میں کھیاں بھنکنے لگیں اب کوئی ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا مجھے پدما کا انگ لگ گیا تھا۔

حالات جس انداز سے بنے تھے اسی رفتار سے بگڑنے لگے کوئی کام ہی نہیں آتا تھا کئی اشتہاری کمپنیوں کے لئے کام کیا لیکن وہی ایک چہرہ' ایک آرڈر منظور ہو گیا اس کے بعد جواب مل گیا بڑی کسمپرسی کا عالم ہو گیا تھا۔

اس دوران ایک نمائش لگی مجھے بھی دعوت دی گئی مقابلے کا معاملہ تھا دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن بہرحال ایک تصویر بنائی اس تصویر میں میں نے اپنا انتقام سمو دیا تھا میں نے ایک کوڑھ بدن بھکارن کی تصویر بنائی جسے دیکھ کر گھن آتی تھی جس کا بدن جگہ جگہ سے عریاں تھا لیکن اس پر چہرہ پدما کا سجایا جتنی تذلیل میں اس کی کر سکتا تھا کی اور اس کے بعد اس تصویر کو نمائش میں بھیج دیا۔

پچیس ہزار روپے کا ایوارڈ اس تصویر کو ملا تھا اور اس وقت یہ رقم میری زندگی کے لئے بہت بڑا سہارا بن گئی میں نے نئے سرے سے دوسرا کاروبار کر لیا اسٹوڈیو بند کر دیا گیا تھا۔ اس کاروبار نے میری حالت پھر بہتر کر دی لیکن یہ اسراف بھی پدما کی تصویر سے ہی ہوا تھا لیکن مجھے پدما سے بے انتہا نفرت ہو گئی تھی وہ میرے فن کی قاتل تھی۔

اسی دوران ثریا حاملہ ہو گئی اور پھر نو ماہ بعد اس نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا اور مر گئی ثریا کی موت میرے لئے ایک ایسا سانحہ تھی جو ناقابل برداشت تھا۔ میں دیوانہ ہو گیا میرا تو کوئی نہیں تھا ساری دنیا میں صرف ثریا میری مونس تھی لیکن اب میں تنہا رہ گیا۔

بہت عرصہ کے بعد میں اعتدال پہ آ سکا۔

اس دوران میں نے اپنی بچی کی صورت بھی نہ دیکھی تھی وہ ملازمہ کے ہاتھوں پرورش پا رہی تھی پہلی بار میں نے اسے دیکھا ایک بار پھر میرا دل خون ہو گیا یہ --- سخت صدمہ تھا۔

میری بچی کا نام نہ جانے کس نے عذرا رکھ دیا تھا پدما کی صورت تھی ہو بہو پدما اور میرے ذہن میں انگارے بھر گئے۔

"لے جاؤ اسے میرے سامنے سے میں اس سے نفرت کرتا ہوں بے پناہ نفرت پھر اسے میرے سامنے کبھی نہ لانا۔"

ملازمہ سہم کر بچی کو اٹھا لے گئی لیکن میری کیفیت اب ٹھیک نہیں تھی اب رہ رہ کر پدما کا خیال آتا تھا کاش ایک بار صرف ایک بار میرے سامنے آ جائے فنا کر دوں اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں کمبخت جادوگرنی کے' میں اس سے بے پناہ نفرت کرتا تھا شدید نفرت۔ اس ذلیل عورت نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا عذرا غریب میری نفرت کے درمیان پرورش پانے لگی گھر میں کبھی کبھی وہ سامنے آ ہی جاتی لیکن اس وقت میرے غضب کی انتہا نہ رہتی بچی کو شروع ہی سے یہ احساس تھا کہ اس کا باپ مجھ سے نفرت کرتا ہے ماں کی محبت کو تو وہ جانتی ہی نہیں تھی۔

حالات یونہی آگے بڑھتے رہے میں نے زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا دنیا کی کسی چیز میں میرے لئے کوئی دلکشی نہیں تھی دماغ ناکارہ ہو گیا تھا اس کے بعد میں نے کبھی کوئی تصویر نہیں بنائی تھی۔

خوش بختی سے کاروبار چل رہا تھا جس کی وجہ سے مالی پریشانی نہیں تھی لیکن خود میری زندگی ایک مستقل دکھ بن کر رہ گئی تھی عذرا سے بھی کوئی خاص محبت نہیں تھی بس اگر کبھی وہ سامنے آ جاتی تو ساری محبت خاک میں مل جایا کرتی تھی ہاں ذہن میں محبت کا احساس ابھرتا تھا لیکن جب اس کے خدوخال دیکھتا تو ساری محبت نفرت میں تبدیل ہو جاتی تھی وہ بنی بنائی پدما تھی۔

جوں جوں وہ بڑھتی جا رہی تھی اس کے خدوخال پدما کی شکل اختیار کرتے جا رہے

تھے اور مجھے پدما سے بے حد نفرت تھی اس خبیث روح سے جس نے میرا سب کچھ چھین لیا مجھ سے میری ثریا چھین لی تھی۔ ثریا میری عمر بھر کی ساتھی تھی میری مونس و غم خوار' ثریا کے بارے میں جب بھی سوچتا تو پدماوتی سے میری نفرت شدید تر ہو جاتی تھی۔

لیکن جب کچھ تنہائیوں میں سوچتا تھا تو مجھے احساس ہوتا تھا کہ بے چاری عذرا کا کیا قصور ہے یہ تو میرے ذہن کا قصور تھا یہ تو میری نفرت تھی جو پدما کے لئے تھی پھر یہ نفرت عذرا کو کیوں ملے۔

لیکن میں مجبور تھا جب بھی عذرا میرے سامنے آتی تو مجھے پدما یاد آ جاتی اور میری مٹھیاں بھنچ جاتیں مجھے اس سے بے پناہ نفرت کا احساس ہوتا تھا اور اب تو عذرا تین سال کی ہو چکی تھی۔

اس کی معصوم زندگی میں محرومیاں ہی محرومیاں تھیں اس لئے وہ بہت زیادہ حساس تھی اور اس چھوٹی سی عمر میں وہ بڑی سنجیدہ باتیں کرتی تھی۔

ایک شام کو میں لان پر خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ عذرا ایک خوبصورت سی فراک میں ملبوس دوڑتی ہوئی میرے پاس آ گئی شاید اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا وہ بس یونہی ایک تتلی کے پیچھے دوڑ رہی تھی اور اس طرح وہ اچانک میرے سامنے پہنچ گئی تھی۔

معصوم چہرے پر ایک لمحے کے لئے خوف کے تاثرات امنڈ آئے اور مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔

خوف --- یہ خوف اس کے چہرے پر کیوں' میری بچی میری بیٹی اور باپ سے اس طرح خوفزدہ ---

ایک لمحے کے لئے میرے دل میں ایک عجیب سا تاثر ابھرا لیکن پھر عذرا کے خدوخال اس کی نگاہیں اس کے ہونٹ اس کے چہرے پر مجھے پدما کی جھلکیاں محسوس ہوئیں اور میں سنبھل گیا وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

"ابو!" اس نے آہستہ سے کہا لیکن فاصلہ کافی رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"ابو ہم غلطی سے آپ کے سامنے آ گئے۔" اس نے معصومیت سے کہا اور میرے

دل کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔

"ابو آپ --- آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟"

"نہیں۔"

"ابو آپ کو تتلی پکڑنی آتی ہے؟"

"نہیں۔"

"ہمیں آتی ہے۔" اس نے کہا اور ایک عجیب سا احساس اس کے چہرے سے ٹپکنے لگا جیسے اسے شدید خواہش ہو کہ وہ مجھ سے باتیں کرے حالانکہ اس کے مواقع بہت کم نصیب ہوئے تھے لیکن بہرصورت اسے جب بھی موقع ملتا تھا وہ میرے قریب آنے کی کوشش کرتی تھی اور میری نفرت کا شکار ہو کر پیچھے ہٹ جاتی تھی۔

"ابو کیا میں آپ کے لئے تتلی پکڑوں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں عذرا۔"

"کیوں؟"

"عذرا" میں نے اسے سرزنش کی اور وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گئی وہ چہرہ جو کھل اٹھا تھا ایک دم سے مرجھا گیا تھا اور اس کی یہ مرجھاہٹ مجھے پسند نہ آئی' اسنے گردن جھکا لی اور واپس پلٹ پڑی۔ تب میں نے اسے آہستہ سے آواز دی۔

"عذرا!!"

"جی ابو۔" وہ جلدی سے چونک کر پلٹی چہرے پر امید و بیم کی کیفیت تھی جیسے میں اسے بلا لوں گا اور شاید سینے سے لگا لوں گا وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا میرے ذہن میں عجیب سے جوار بھاٹے اٹھ رہے تھے بلا شبہ وہ پدما کی شکل تھی لیکن پدما تو نہیں تھی پھر اس کے ساتھ یہ رویہ مناسب نہیں تھا ثریا کی روح کو کس قدر تکلیف ہوتی ہو گی۔ ثریا جس نے زندگی کے ہر کٹھن راستے پر میرا ساتھ دیا تھا وہ جو میری زندگی کی راز دار تھی اور میں نے اس کی ایک ننھی سی امانت کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

میرے جذبات پھٹ پڑے کیسی سنگدلی کا مظاہرہ کرتا رہا ہوں میں اب تک یہ کوئی

اچھی بات تو نہیں تھی۔

"ابو ---" عذرا میری خاموشی سے تنگ آ کر بولی۔

"یہاں آؤ عذرا۔" میں نے کہا اور وہ جھجکتے ہوئے قدموں سے میرے نزدیک پہنچ گئی۔

"جی ابو۔"

"بیٹے میں تمہارا کون ہوں؟"

"ابو۔"

"میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟"

"بہت اچھے لگتے ہیں ابو' سب سے اچھے لگتے ہیں۔" اس نے کہا اور میں نے اسے آغوش میں لے لیا اتنا بھینچا' اتنا پیار کیا کہ عذرا نڈھال ہو گئی اس نے اپنی ننھی ننھی سفید باہیں میری گردن میں ڈال کر خود بھی مجھے بھینچ لیا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا عذرا میری بچی مجھے معاف کر دینا میں نے تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔" میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"ابو --- کیا بات ہے ابو؟"

"کچھ نہیں بیٹے بس کچھ نہیں تم بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہو ساری دنیا میں سب سے زیادہ اچھی میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اور اب --- میں میں ساری کسر پوری کر دوں گا دیکھوں گا وہ کمبخت میرا کیا بگاڑتی ہے۔"

اور بلا شبہ اس دن کے بعد میں نے اپنی زندگی عذرا کے لئے وقف کر دی سارے ملازم حیران رہ گئے تھے اور عذرا' خوشی اس کی آنکھوں سے پھوٹتی تھی اسے جیسے کوئی بڑی نعمت مل گئی ہو ان حالات کا جمود توڑنے کے لئے میں نے سیرو سیاحت کا پروگرام بنایا تیاریاں کیں اور پھر نکل گیا معصوم روح میرے ساتھ تھی اور زندگی کے انبساط سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"ابو۔" ایک دن اس نے پوچھا۔

"ہوں۔"

"ایک بات بتایئے۔"

"جی بیٹے۔"

"پہلے آپ ہم سے بولتے ہی نہیں تھے۔"

"بس پاگل ہو گیا تھا بیٹے۔"

"اوہ ---- اب تو آپ ٹھیک ہو گئے۔"

"ہاں بیٹے اب تو ٹھیک ہو گیا۔" میں نے جواب دیا اور اسے سینے سے لگا لیا ایک انوکھا سکون تھا اس لمس میں۔

مری میں میری ملاقات ڈاکٹر کپاڑیا سے ہوئی ایک خوش اخلاق اور جلد بے تکلف ہو جانے والا نوجوان تھا جو اپنی منگیتر کے ساتھ سیر کرنے آیا ہوا تھا اس کی منگیتر مریم نے عذرا سے بہت زیادہ محبت کا اظہار کیا بلکہ عذرا ہی ہم لوگوں میں تعلقات کا باعث بن گئی تھی۔

بڑی پیاری بچی ہے مسٹر شکیل اس سے جدا ہونے کو دل ہی نہیں چاہتا۔" ایک دن اس نے کہا تھا اور میں مسکرا دیا تھا۔

بہر حال بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کپاڑیا نے جرمنی میں پلاسٹک سرجری کا کورس بھی کیا ہے اور یہ سن کر میرے ذہن میں عجیب سی کلبلاہٹیں ہونے لگیں۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔

"ڈاکٹر کپاڑیا میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمایئے۔"

"آپ کو یقیناً تعجب ہو گا ڈاکٹر لیکن میری زندگی سے ایک بڑا المیہ وابستہ ہے اور اتفاق سے آپ سے ملاقات ہو گئی ہے۔"

"فرمایئے مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہو گی۔"

"بس آپ کو تفصیل نہیں بتا سکوں گا ڈاکٹر لیکن یوں سمجھیں کہ یہ میری بچی تین سال تک میری نفرت کا شکار رہی ہے۔"

"نفرت کا شکار؟"

"ہاں اپنی پیدائش سے لے کر اب تک' اور اس کی وجہ اس کے خدوخال ہیں۔"

"اوہ" ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر یہ خدوخال ایک ایسی شخصیت کے ہیں جس سے میں بے انتہا نفرت کرتا ہوں اور اس نفرت کا شکار یہ بچی رہی ہے یہ صورت اب بھی میرے ذہن میں پن کرتی ہے ڈاکٹر کیا آپ اس کے خدوخال بدل سکتے ہیں۔"

"ارے" ڈاکٹر حیران رہ گیا تھا۔

"یہ بہت ضروری ہے ڈاکٹر ورنہ کبھی کسی وقت میری نفرت عود کر نہ آئے براہ کرم آپ میری مدد کریں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بڑی پیاری شکل و صورت ہے اس کی آپ یقین کریں مجھے انتہائی دکھ ہو گا اگر میں اس کے خدوخال بدل دوں۔"

"ڈاکٹر یہ آپ کے ہاتھ کی بات ہے آپ چاہیں تو اسے اس سے حسین خدوخال دے سکتے ہیں لیکن یہ اس بچی کی زندگی کے لئے بے حد ضروری ہے کہ آپ اس کی شکل بدل دیں جس طرح بھی ہو جہاں تک ہو۔" میں نے ڈاکٹر کپاڑیا سے کہا اور کچھ سوچنے لگا تب ڈاکٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے مسٹر شکیل مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے ہم واپس چلیں گے اور اس کے بعد میں اسے اپنے ہسپتال میں داخل کر لوں گا اور اس ملک میں میرا پہلا کام یہی ہو گا" ڈاکٹر نے کہا۔

میں نے ڈاکٹر کپاڑیا کا خلوص دل سے شکریہ ادا کیا تھا۔ "لیکن ایک اور بات ہے مسٹر شکیل۔" کپاڑیا نے کہا۔

"کیا؟ ----"

"اس بچی کے ذہن پر اپنے خدوخال کی تبدیلی کا کوئی اثر نہ ہو۔"

"ابھی اس کی عمر بہت کم ہے ڈاکٹر کپاڑیا اس لئے اسے احساس ہی نہ ہو گا لیکن جو نقصان وہ اپنے اس خدوخال سے اٹھائے گی ان سے محفوظ ہو جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"بہتر ----" ڈاکٹر کپاڑیا نے کہا۔

بہرصورت ڈاکٹر کپاڈیا نے مجھ سے اتفاق کر لیا تھا اور یہ بات ہمارے درمیان طے پا
گئی تھی کہ ہم واپس چل کر یہ کام بھی انجام دے لیں گے تھوڑے دنوں کے بعد میں مری
سے واپس آ گیا ڈاکٹر کپاڈیا اور اس کی منگیتر بھی میرے ساتھ تھی مریم نے بھی اس بات پر
حیرانی کا اظہار کیا تھا کہ بچی بہت خوبصورت ہے' خدوخال بدلنے سے کہیں بدصورت ہی نہ
ہو جائے لیکن ڈاکٹر کپاڈیا نے کہا تھا کہ میں اسے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دوں گا
مریم تم میرے فن کو چیلنج مت کرو۔

واپس آنے کے بعد ڈاکٹر کپاڈیا نے عذرا کو اپنے کلینک میں داخل کر لیا' وہ اس کی
پلاسٹک سرجری میں مصروف ہو گیا تھا اور مجھے عذرا کا شدید احساس تھا کیونکہ وہ بہت چھوٹی
سی تھی۔

معصوم بچی کو اتنی تکلیف میری وجہ سے اٹھانا پڑ رہی تھی لیکن یہ اس کی زندگی کے
لئے بہت ضروری تھا اور میرے لئے بھی بہت ضروری تھا بمشکل تمام مجھے اس کا موقع ملا تھا
اب اگر اس کے خدوخال بھی تبدیل ہو جاتے تو یہ اچھا ہی تھا۔

تقریباً ایک ماہ تک عذرا ڈاکٹر کپاڈیا کے کلینک میں رہی اور ڈاکٹر کپاڈیا اس میں
مصروف رہا تقریباً ایک ماہ کے بعد اس کی پٹی کھلی اور بلاشبہ ڈاکٹر کپاڈیا نے جو کچھ کہا تھا وہی
کر دکھایا عذرا کے خدوخال بدل گئے تھے اور وہ بے حد خوبصورت نظر آنے لگی تھی۔

بلاشبہ وہ کپاڈیا کے فن کا کمال تھا اس نے عذرا کو جو حسن بخشا تھا وہ بے مثال تھا'
مریم بھی خوش ہو گئی اور میری زندگی سے بھی وہ منحوس کانٹا نکل گیا وقت گذرتا رہا۔

اور پھر ایک شام جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی عذرا آیا کے ساتھ کہیں گئی
ہوئی تھی کہ ایک ملازم نے اطلاع دی۔

"صاحب ایک بیگم صاحبہ آئی ہیں۔"

"بھیج دو۔" میں نے کہا لیکن آنے والی کو دیکھ کر میرے بدن کا خون کھول اٹھا وہ
پدما تھی کالے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس اجڑی اجڑی بے نور سی اس کے چہرے پر وہ بات
نہیں تھی۔

"ہریش۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اب کیوں آئی ہے منحوس عورت۔ اب کیا چھیننا چاہتی ہے مجھ سے سب کچھ تو تو
نے لے لیا اب کیا رہ گیا ہے میرے پاس؟"

"میرے پاس بھی تو کچھ نہیں ہے ہریش کٹھنائیں بھوگی ہیں میں نے تمہارے لئے
پر یہ جنم سازگار نہیں ہے میں کسی طرح تمہیں نہیں پا سکی اب میں تھک گئی ہوں لیکن
ہریش میں تمہارے اگلے جنم کا انتظار کروں گی میری آتما بھی تھک گئی ہے ممکن ہے اگلے
جنم میں تم ہریش ہی بن جاؤ۔"

"میں تیری بکواس سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوں۔"

"سکھی رہو ہریش بھگوان تمہیں سکھی رکھے آج میں تم سے دور جا رہی ہوں اب
تمہارے شریر پر میرا سایہ نہیں پڑے گا تم آزاد ہو۔" اس نے کہا —— بادل زور سے
گرجے اور اس کے چہرے پر خوف و ہراس پھیل گیا۔

"میں آ رہی ہوں بھگوان میں آ رہی ہوں' اچھا ہریش اگلے جنم تک کے لئے
الوداع۔" اس کا بدن لرزنے لگا۔ اور پھر میں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا اس کا بدن
راکھ بن کر بکھرتا جا رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد راکھ کا ایک ڈھیر پڑا رہ گیا جسے ہوا نے
آہستہ آہستہ منتشر کر دیا اور اس طرح ایک بری روح سے میرا پیچھا چھوٹ گیا۔

یہ واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے لیکن آواگون کے مسئلے کا آج بھی میں قائل نہیں
ہوں۔

آگ کا جزیرہ

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر زندگی نے وفا کی اور قسمت نے ساتھ دیا تو ایک بار تنہایا کچھ ایسے بے تکلف دوستوں کے ساتھ جو میرے ہم مزاج ہوں ایک بار یہ خوبصورت شہر دیکھوں گا بھلا غور کریں مغرب کے حسین اور مشہور شہر اور والد صاحب کی ناچتی ہوئی پریاں اور بوڑھے باپ کا احترام کہاں کہاں جاکر رہ جانا پڑا ہے کیا بیان کروں!

لیکن بہرحال میں اپنے ڈیڈی سے بے پناہ محبت کرتا ہوں' وہ میرے بہترین دوست ہیں لڑکیوں کے علاوہ ہر معاملے میں مجھ سے بے تکلف۔

میں نے بارہا دعائیں مانگی تھیں کہ خدایا۔ میرے ڈیڈی کی بوڑھی امنگیں پھر سے جوان ہو جائیں یورپ کی کوئی حسینہ ان پر ایسا جال ڈالے کہ وہ عقل و ہوش کھو بیٹھیں۔ شرمائی شرمائی نگاہوں سے میری طرف دیکھیں اور گردن کھجاتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کریں۔ تب میں نہایت فراخ دلی سے انہیں نہ صرف عشق کرنے کی اجازت دے دوں بلکہ اس سلسلہ میں ان کی حتی الامکان مدد کروں۔

اور جب وہ اپنی پسندیدہ محبوبہ کے ساتھ گلچھرے اڑانے میں معروف ہو جائیں تو میں بھی گردن کھجاتے ہوئے شرمائے شرمائے انداز میں اپنی کسی گرل فرینڈ سے ملنے کی اجازت مانگوں۔ ظاہر ہے میری فراخ دلی کے جواب میں انہیں بھی اسی فراخ دلی سے کام لینا ہوگا۔

لیکن ہر دعا پوری نہیں ہوتی۔ اور یہ یورپ کی حسینائیں بھی احمق تھیں کسی نے ڈیڈی کی طرف توجہ نہیں دی۔ اب وہ ایسے گئے گذرے بھی نہیں تھے سرخ و سفید رنگ'

جاندار آنکھیں' بلند و بالا قد عمر بھی پچاس سال کے قریب۔ لیکن انہوں نے جسم کو خوب بنا کر رکھا تھا۔ آج تک ورزش کرتے تھے۔ یورپین بوڑھوں کی طرح ان کے چہرے پر ایک بھی جھریاں نظر نہ آتی۔ لیکن یورپ کی بدذوق لڑکیاں۔ بس کیا کہوں انہیں اری بھاگوانو میری طرف دیکھنے سے کیا حاصل مجھ سے عشق کرنا ہے تو پہلے میرے والد صاحب سے عشق کرو۔ ارے کوئی انہیں بھی تو سنبھالو۔
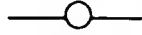
ہمارا تعلق کشمیر سے ہے بلند و بالا قدوقامت اور سرخ و سفید رنگ ہماری خصوصیت ہے میں نے زندگی میں پہلی بار ملک سے باہر قدم نکالا تھا۔ یہ بھی والد صاحب کا ایک وعدہ تھا انہوں نے کہا تھا کہ ایم کرنے کے بعد وہ مجھے سیاحت کی اجازت دے دیں گے اور انہوں نے بہرحال اپنے وعدے کا پاس کیا۔ میں ہی بد قسمت تھا جو جوش سیاحت میں والد صاحب کو دعوت دے بیٹھا۔ کاش اس رات کی گفتگو نہ ہوئی ہوتی۔ کاش اس رات مجھے سخت نیند آرہی ہوتی اور میں کافی پینے میں ڈیڈی کے ساتھ شریک نہ ہوتا۔ میں ان سے نیند آنے کا کہہ کر اپنے کمرے کی راہ لیتا۔ لیکن ان دنوں تو میرے اوپر سیاحت کا بھوت سوار تھا میں ہر وقت سفر کی باتیں کرتے رہنا چاہتا تھا۔چنانچہ میں نے اپنے والد صاحب سے بڑے پیار سے کہا:

"تو ڈیڈی میری تیاریاں مکمل ہوگئیں اب کیا پروگرام ہے؟"

"ٹھیک ہے چند کام باقی رہ گئے وہ بھی ہو جائیں گے' اس کے بعد روانگی۔" انہوں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اور میں ان کی شکل دیکھنے لگا۔

کیا بات ہے ڈیڈی کیا آپ میرے جانے سے خوش نہیں ہیں؟"

"نہیں ناخوشی کی کیا بات ہے میں نے تم سے وعدہ کیا ہے بیٹے بہرحال اس کا پاس ضروری ہے۔ بس ذرا تنہائی کا احساس ہے' تم سے جدا ہونے کی وجہ سے۔ میں نے کبھی باہر کا ٹور نہیں کیا۔ حالانکہ غیر ممالک میں ہمارے اسٹاکسٹوں نے کئی بار دعوت دی۔

"تو ڈیڈی آپ بھی میرے ساتھ ہی کیوں نہ چلیں'۔" میں نے بے ساختہ کہہ دیا اور یہی بات قیامت ہوگئی۔ ڈیڈی خاموش ہوگئے چند لمحات سوچتے رہے پھر بولے۔

لیکن یہاں کے معاملات صرف ملازمین پر چھوڑ دیئے جائیں؟؟"

"مجھے اس وقت اپنی حماقت کا احساس نہیں تھا۔ نہ میرے ذہن میں حسیناؤں کے قربت کے حصول کا تصور تھا۔ نہ یہاں کے نائٹ کلبوں اور ہوٹلوں کا خیال چنانچہ میں نے کہہ دیا۔

"کیا حرج ہے سب کے سب ایماندار ہیں آج تک کسی نے بھی بے ایمانی نہیں کی۔"

"ہوں۔" ڈیڈی آہستہ سے بولے۔ پھر کہنے لگے۔ اچھا دیکھو میں کل کمال صاحب سے بات کرتا ہوں۔"

"کمال صاحب ہمارے کاروبار کے جنرل مینجر تھے۔ دراصل ہمارا قالینوں کا کاروبار تھا۔ اعلیٰ پیمانے پر قالین ایکسپورٹ کرتے تھے اور یورپ کے بہت سے ممالک میں ہماری زبردست ساکھ تھی۔ والد صاحب کی مجھ سے قربت کی خاص وجہ یہ تھی کہ میری پیدائش کے فوراً بعد میری والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ والد صاحب والدہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے انہوں نے دوسری شادی کا تصور بھی نہیں کیا۔ اور اپنی پوری توجہ میرے اوپر مرکوز کردی اور ظاہر ہے آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ میری پرورش کس انداز سے ہوئی ہوگی۔

بہرصورت دوسرے دن والد صاحب نے مجھے خوش خبری سنائی کہ انہوں نے کمال صاحب سے بات کرلی ہے اور کمال صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کی کمی محسوس نہ ہونے دیں گے چنانچہ ڈیڈی صاحب بھی میرے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔

اس وقت میں نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ جی ہاں کچھ بھی نہیں سوچا تھا لیکن بعد میں بہت کچھ سوچنا پڑا۔ ڈیڈی نے اس طرح پروگرام بنایا کہ وہ ان جگہوں کو بھی دیکھ لیں جہاں ان کا کاروبار چل رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے ابتدا میں ایشیا کے چند ممالک کی سیر کی اس کے بعد یورپ چل پڑے۔

ترکی کے قیام میں مجھے شدت سے احساس ہوا کہ والد صاحب کی موجودگی میری تفریحات میں مانع ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی زندگی میں پہلی بار ملک سے باہر قدم نکالا۔ وہ بھی والد صاحب کے ساتھ لیکن اب پچھتائے کیا ہوسکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ

دل کو بہلاوے دوں' کہ ایک بار پھر سفر کروں گا اور اس وقت دل کی حسرتیں نکال لوں گا۔

لیکن کس طرح اس دوسرے سفر کا کیا جواز ہوگا؟

یہ بات ابھی سوچی بھی نہیں تھی۔ ویسے عام حالات میں والد صاحب ایک بہترین دوست تھے۔ خود بھی ایڈونچر پسند تھے۔ اس لئے ان کی تفریحات میں ایک ندرت تھی۔ ایسے غیر متوقع سفر کرتے جو دلچسپ بھی ہوتے تھے ان کے اسٹاکسٹ انہیں مدعو کرتے تھے لیکن والد صاحب قبلہ کاروباری الجھنوں میں بالکل نہیں پھنسے تھے۔ انہوں نے کسی کی دعوت قبول نہیں کی تھی۔ حالانکہ سفر کے بہترین ذرائع موجود تھے۔ لیکن تفریح طبع کی خاطر ہم بعض اوقات اس انداز میں سفر کرتے جو یقینی دلچسپی کا حامل ہوتا۔

چنانچہ استنبول سے اطالیہ کا سفر مشہور زمانہ اورینٹ ایکسپریس کے ذریعہ طے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ٹرین براستہ صوفیہ' بلغراد میلان' سوزان ہوتی ہوئی پیرس تک جاتی ہے صاف ستھرے آرام ڈبے شیشے کی بڑی کھڑکیاں اور ان کے اوپر خوبصورت پردے۔ روشنی گل کیجئے تو ایک ننھی منی سی بیڈ لائٹ خود بخود جل جاتی۔ اور پھر جگمگاتے ہوئے سفید غسل خانے۔

ٹیلی ٹرین کا سفر میرے لئے بہت دلکش تھا۔ یہ ٹرین جو کسی زمانے میں بلقان کی تاریخ میں رومان و اسرار کی ایک علامت بن گئی تھی اس گاڑی میں بلقان کے شاہی خاندانوں کے ایلچی۔ سفیر اور طرح طرح کے مشتبہ افراد کام کرتے اور دوران سفر سفارتی اور سیاسی جھگڑے گولی اور خنجر کی زبان سے طے کئے جاتے تھے۔ اگاتھا کرسٹی کے مشہور ناول اورینٹ ایکسپریس میں قتل کا مرکزی خیال اسی ٹرین سے لیا گیا تھا۔

اور میں اسی ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ بڑی عجیب سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ رات بھر کے سفر کے بعد صبح کو آنکھ کھلی تو بلغاریہ میں داخل ہو چکے تھے۔ ترک عملہ بلغار عملہ سے بدل گیا پھر یوگوسلاویہ اور پھر سیزان' اطالیہ میں داخل ہو چکے تھے۔

اور یہیں ہماری ملاقات بوڑھے انکل غزنوی سے ہوئی۔

ڈیڈی خوب ہیں۔ نکلے کہاں کو تھے اور انکل کہاں آ گئے لیکن غور کیا جائے تو کارخانہ قدرت میں ایسے ہی عجوبے بھرے پڑے ہیں' زندگی بھی ایڈونچر پسند ہے ایسے

ایسے چکر دیتی ہے انسان کھوپڑی میں سا نہیں سکتے۔ آپ غور کریں میں نے تعلیم سے فراغت کی ڈیڈی نے اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے مجھے سفر کی اجازت دی۔ میں نے ڈیڈی کی تنہائی سے متاثر ہو کر انہیں اپنے ساتھ سفر کی دعوت دی۔ ہم نے بے تکے سفر کئے اور پھر انکل غزنوی مل گئے۔

گویا یہ سب ان واقعات کی کڑیاں تھیں جو ہمیں پیش آنے والے تھے۔ اور ان واقعات سے ایک خوبصورت کہانی جنم لینی والی تھی۔

میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا رہے ہوں گے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کیا کہنا چاہتا ہوں۔ ابھی تک تو آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہو گا البتہ پتہ یہ ہے کہ اس پورے سفر میں زندگی کے اس شاندار سفر میں میں نہیں رہا ہوا۔ اور جب غور کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ڈیڈی کی موجودگی بھی قدرت کا ایک راز تھی۔ ایک پراسرار راز۔

اگر یقین نہ آئے تو بلاؤں افشاں کو۔

لیکن افشاں کے بارے میں ابھی اس کے علاوہ اور کچھ نہ بتاؤں گا یہ میرا پسندیدہ نام ہے بس بچپن میں اے آر خاتون کے ایک ناول میں تھا افشاں اس کی ہیروئن ایسی ذہن سے چپک کر رہ گئی کہ یہ میری زندگی بن گیا۔ لیکن اس وقت بڑی کوفت ہوئی جب افشاں نے مجھ سے ملنا شروع کر دیا۔

کالج کی یہ تیز و طرار لڑکی بہت سی نگاہوں کا مرکز تھی۔ بڑی امیر تھی اس لئے پھوہڑ تھی سب کو اپنی امارت سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتی۔ عمدہ سے عمدہ لباس اور اعلیٰ درجے کے میک اپ میں آتی لیکن آئیڈیل کی یہ مٹی پلید دیکھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی۔

کاش اس کا نام افشاں نہ ہوتا۔

لیکن اس کا نام افشاں تھا۔ گو میں افشاں کو اس رنگ میں نہیں دیکھتا تھا۔ مجھے تو اے آر خاتون کے ناول کی وہ معصوم سی ہیروین پسند تھی۔ یہ وہ افشاں تو نہ تھی پھر اس نے مجھ سے پینگیں بڑھانے کی کوشش کی۔ دوستوں نے مجھے مبارکباد دی لیکن بہت جلد یہ افواہیں پھیل گئیں کہ افشاں میرے عشق میں گرفتار ہے اور میں اسے لفٹ نہیں دے رہا۔

دوستوں نے سفارش کی اور میں نے کہا کہ اس سے کہو کہ اپنا نام بدل دے اور سچ سچ افشاں نے اپنا نام بدل دیا۔ عرف عام اسے رخشندہ کہا جانے لگا۔ اور میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس سے کہا کہ شکر ہے کہ اس نے اپنے بھونڈے کردار پر سے اس خوبصورت نام کو ہٹا دیا۔

تو میری بیوی کا نام افشاں ہے۔

لیکن افشاں کی حقیقت سے ابھی پردہ نہیں اٹھے گا ورنہ کہانی کا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ تو آپ وہیں سے سنیں۔ اطالیہ میں ہماری ملاقات انکل غزنوی سے ہوئی اور اس وقت ہوئی جب ہم وینس میں سان مارکو چوک کے ایک قہوہ خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ قہوہ خانے بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ اکثر کے پاس اپنے آرکسٹرا ہیں جن کے موسیقار سرشام چوک میں کرسیاں بچھا کر کلاسیکی کا الاپ شروع کر دیتے ہیں۔ خوب رونق تھی گھنٹہ گھر اور کلیسا کے سامنے خوش پوش نوجوان کے غول گھوم رہے تھے۔ سیاح لڑکیاں نظر آتیں تو ان میں سے چند اپنے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ٹائی کی گرہ کو ٹٹولتے کسی خوبصورت لڑکی کے پیچھے چل پڑتے کبھی کام بن جاتا کبھی نہ بنتا۔ درمیانی عمر کے اطالوی بھی سیڑھیوں پر بیٹھے ہر آنے والی سیاح عورت کو ہیٹ اتار کر سلام کرتے۔

میری نگاہیں اس پورے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ طویل القامت کشمیری باشندہ بہت سی نوجوان نگاہوں کا مرکز بنا تھا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ اس کا باپ بھی ساتھ ہے اور وہ کسی نوجوان کنواری مشرقی لڑکی کی مانند بے بس ہے۔

ڈیڈی نے ویٹر کو مشہور اطالوی کھانے' قیمے اور سیویوں کا آرڈر دے دیا تھا۔ تب ان کی نگاہ سامنے کی میز پر پڑی' جہاں ایک درمیانی عمر کا جسیم آدمی سامنے سرخ شراب کا جگ رکھے اخبار پڑھنے میں مشغول تھا۔ ایک بار اس نے صفحہ پلٹنے کے لئے اسے چہرے سے ہٹایا اور ڈیڈی کی نگاہ اس پر جا پڑی۔

"ارے" ان کے منہ سے نکلا اور میں چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے ڈیڈی؟" میں جلدی سے پوچھا۔

"منصور ذرا اس سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھو۔" ڈیڈی نے کہا۔
میں دیکھ چکا ہوں ڈیڈی کیا بات ہے؟"
"کیا تمہیں اس کی شکل جانی پہچانی نہیں محسوس ہوتی؟"
"نہیں تو۔ کون ہے یہ؟"
"تم نے میرے البم میں فرہاد غزنوی کی تصویر دیکھی تھی؟"
"شاید" میں نے کہا۔
"ذرا غور سے اس کی شکل دیکھو۔" ڈیڈی نے کہا۔ فرہاد غزنوی کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ ڈیڈی اکثر ان کے تذکرے کرتے رہتے۔ فارسٹ آفیسر تھے کسی زمانے میں یوں بھی مالدار لوگوں میں شمار ہوتے تھے ڈیڈی کے بچپن کے دوست تھے پھر ملازمت چھوڑ کر سیاحت کو نکل گئے اور کہیں مستقل اقامت اختیار کرلی۔
میں نے کئی بار ان کی تصویر دیکھی تھی۔ لیکن اصلیت اور تصویر میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے مجھے تو یہ شخص اطالوی ہی معلوم ہوتا تھا۔ البتہ خدوخال تصویر سے ضرور ملتے تھے۔
"آپ کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی ڈیڈی؟" میں نے کہا۔
"وار کیے لیتے ہیں۔" ڈیڈی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ ڈیڈی اس شخص کی میز پر پہنچ گئے اور وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا پھر نہ جانے کیا گفتگو ہوئی۔ البتہ چند لمحات کے بعد میں نے دونوں کو ایک دوسرے پر جھپٹتے دیکھا اور پھر وہ ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔
میں نے ایک گہری سانس لی۔ گویا وہ انکل غزنوی ہی تھے۔ پھر ڈیڈی نے میری طرف ہاتھ ہلایا اور میں بھی اٹھ کر ان کی طرف بڑھ گیا۔ انکل نے مجھے بھی اسی انداز میں لپٹایا تھا۔
"ابے تو تو باپ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اسی کی ضد نے مجھے بھی بالآخر وطن سے قدم نکالنے پر مجبور کردیا مگر تم سے ملاقات خوب ہوئی کیا کر رہے ہو بھئی یہاں کب سے مقیم ہو؟"

"بس ایسے ہی نکل آیا تھا۔ کچھ نہیں کر رہا ہوں عیش کر رہا ہوں ویسے میرا قیام وینس میں نہیں ہے۔"
"پھر کہاں ہے؟"
"جہاں ہے تم دیکھ ہی لوگے۔"
"کیا مطلب؟"
بکواس مت کرو جی مطلب پوچھنے کی اجازت نہیں ہے انکل غزنوی نے کہا اور ڈیڈی ہنسنے لگے۔
تو ابھی نہیں بدلا ہے یار بالکل اسی طرح
"کبھی نہیں بدلوں گا۔" غزنوی نے ہنستے ہوئے کہا۔
بیرے نے ہمارا آرڈر اسی میز پر سرو کر دیا تھا انکل غزنوی نے اس میں اضافہ کیا اور پھر بیرے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
ابے ہٹاؤ یہ سب یہاں سے' کیا میرے سامنے لغویات رکھ دیتے ہو بال بچوں کا بھی خیال نہیں کرتے۔ انہوں نے شراب کے جگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
ڈیڈی ہنسنے لگے مجھے بھی ہنسی آگئی تھی۔ بہرحال دلچسپ آدمی تھے پھر ان میں دنیا جہان کی باتیں ہونے لگیں' تب اچانک ڈیڈی نے ان سے پوچھا۔
"او، وہ مسز کہاں ہیں؟"
"مسز کیا ہوتا ہے؟" انکل غزنوی نے حیرت سے پوچھا۔
سچ بتاؤ کیا شادی نہیں کی؟"
"کیوں' پاگل نظر آتا ہوں کیا۔ کیوں کرتا شادی؟"
"اوہ۔" ڈیڈی ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولے۔ "تو تو آج تک اپنی ضد پر قائم ہے؟"
"ارے ضد کا ہے کی بھائی عقل مندی کہو' بزرگوں کے حشر سے عبرت پکڑی۔ وہ بھی شادی کرکے کونسے خوش تھے کہ میں بھی شادی کرلیتا جنگلوں میں عیش کرتا ہوں اور آج بھی شیروں سے ٹکرا جانے کی قوت رکھتا ہوں۔ ڈیڈی ہنستے رہے پھر انکل غزنوی نے پوچھا۔

"کہاں قیام ہے؟"

"پلازہ میں۔"

"روم نمبر؟" انکل نے پوچھا اور ڈیڈی نے روم نمبر بتادیا۔ تب انکل اجازت لے کر اٹھے اور کہیں چلے گئے۔ چند منٹ کے بعد وہ واپس آگئے۔

"کہاں گئے تھے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"ذرا پلازہ فون کیا تھا اور انہیں ہدایت دی تھی کہ روم نمبر بائیس کا سامان ڈبل بیڈ میں پہنچادیا جائے۔ میں وہیں مقیم ہوں۔" انکل غزنوی نے کہا اور ڈیڈی ہنسنے لگے۔

"ذرا بھی نہیں بدلا ہے تو وہی جارحانہ انداز وہی بدمعاشی۔"

شادی جو نہیں کی ہے۔" انکل غزنوی نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

بہرحال ہم انکل غزنوی کے ہوٹل آگئے بلاشبہ یہ شخص مجھے پسند آیا تھا۔ بے حد زندہ دل بہت ہی بے تکلف' ان کی وجہ سے مجھے ایک آسانی بھی مل گئی تھی۔ اب ڈیڈی ان کے ساتھ الجھے رہتے اور مجھے تنہا سیر کی اجازت مل جاتی۔

لیکن انکل غزنوی انتہاپسند تھے ایک رات انہوں نے کھانے کے دوران کہا۔

پلازہ ہم چھوڑ رہے ہیں۔"

"اوہ کیوں۔" ڈیڈی نے تعجب سے پوچھا۔

"واپس نہیں چلنا کیا؟"

"کہاں؟"

"جہاں میں رہتا ہوں تمہارا کیا خیال ہے اتنے دن کے بعد ہاتھ لگے ہو کیا بچ کر نکل جاؤ گے؟" انکل آنکھیں نکال کر بولے۔

لیکن جانا کہاں ہے؟" ڈیڈی ہنستے ہوئے بولے۔

"جہاں رہتا ہوں بس اس کے علاوہ کچھ نہیں بتایا جاسکتا۔"

"یہ تو بتادو' وینس میں یا وینس سے باہر؟"

"احمقانہ سوال ہے میں بتاچکا ہوں کہ میں یہاں نہیں رہتا۔"

"وینس سے باہر چلنا ہے۔"

"ہاں۔"

"لیکن پاسپورٹ ویزا وغیرہ بھلے آدمی۔"

"تو کیا اس قدر ناکارا انسان ہوں کہ تمہارے سوٹ کیس سے پاسپورٹ نکال کر ویزا بھی حاصل نہیں کر سکتا ایں۔" انکل نے منہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے خدا کی پناہ تو تم یہ بھی کرچکے ہو۔"

"ہاں اور کل دس بجے کی فلائٹ سے سیٹیں بھی بک کرا چکا ہوں۔"

مگر کہاں کے لئے؟"

"جہنم کے لئے۔" انکل نے چڑچڑے انداز میں کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ وہاں کے علاوہ اور تم کہاں رہ سکتے ہو۔ میرا خیال ہے وہاں تمہارا مناسب عہدہ ہوگا۔"

"ہاں ہاں داروغہ جہنم ہوں تم سے مطلب؟" انکل غزنوی نے کہا میں ان دونوں کی گفتگو پر مسکراتا رہا۔ ہمیں اس وقت تک نہیں معلوم ہو سکا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ جب تک ایئرپورٹ پر اناؤنسر نے نہ پکارا۔

"ناہیتا کی فلائٹ کے مسافروں سے التماس ہے کہ وہ طیارے پر پہنچ جائیں۔" فلائٹ تیار ہے اور انکل غزنوی نے بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔" آؤ۔

"ناہیتا۔" ڈیڈی حیرت سے بولے' معمولی سفر نہیں تھا اور ہمارے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم اتنا طویل سفر کرنے والے ہیں۔ لیکن بہرحال جانا تو تھا انکل اور ڈیڈی ایک سیٹ پر تھے اور میں کم از کم اس بات پر خوش تھا کہ میرے سفر کی پارٹنر ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

دوران سفر ایڈی منیر مجھ سے دلچسپ گفتگو کرتی رہی' وہ ایک اخباری رپورٹر تھی۔ ستھرے مذاق کی مالک۔ اس کی گفتگو بھی صاف ستھری تھی گو اس میں رومان کا عنصر نہیں تھا لیکن ایک حسین ساتھی کی معیت ہی کیا کم ہوتی ہے۔ سفر خوب گذرا انکل غزنوی نے ایڈی کو میری طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ ناہیتا کے مارلبرو ائرپورٹ پر اتر کر ایڈی نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہوگئی لیکن ہمارا سفر ختم نہیں ہوا تھا۔ اس

رات ہم نے ملبرو میں قیام کیا۔ دوسری صبح ناشتے کے بعد ہوٹل چھوڑ دیا گیا۔ انکل غزنوی نے ایک آٹو گیرج سے اپنی گاڑی حاصل کی اور سفر شروع ہوگیا۔ راستے میں انکل غزنوی نے بتایا کہ وہ آبادی سے دور انتہائی دور ایک ویرانے میں قیام پذیر ہیں۔

فیزو کا غیر آباد ہے' اس کے دوسری طرف قدیم باشندوں کی آبادی ہے جو آج تک تہذیب سے ناآشنا ہے اور افریقی جنگلیوں کی مانند زندگی گزارتے ہیں لیکن اس علاقے کا حسن انسان کو جکڑ لیتا ہے اور پھر وہ وہاں سے کہیں اور جانا پسند نہیں کرتا۔ اس اطراف میں شکار کی بہتات ہے بس شکار کھیلو اور زندگی گزارو۔ یہ زندگی میری طبیعت سے میل کھاتی ہے۔ اور یہاں سے زیادہ میں کہیں خوش نہیں رہ سکتا۔

"ہمیشہ کے جنگلی ٹھہرے۔" ڈیڈی نے جل کر کہا۔ اور انکل غزنوی ہنسنے لگے۔

گاڑی سفر کرتی رہی بہت طویل سفر تھا۔ پہلے دن ہم مسلسل سفر کرتے رہے۔ راستے میں کئی بستیاں ملی تھیں لیکن انکل غزنوی نے کہیں قیام نہ کیا اور سفر جاری رہا۔ رات کو البتہ ایک غیر آباد علاقے میں قیام کیا گیا تھا۔ چاروں طرف سیاہ رنگ کے پہاڑ منہ پھاڑے کھڑے تھے وہ کوئلے کے پہاڑ معلوم ہوتے تھے شاید یہاں پہلے آتش فشاں رہے ہوں بہرحال یہ جگہ مجھے پسند نہیں آئی تھی۔ دوسری صبح ہم آگے بڑھ گئے۔

انکل نے ڈرائیونگ میرے حوالے کردی تھی اور ناہموار پہاڑی راستوں پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے البتہ مجھے بہت لطف آرہا تھا۔ دوپہر تک ہم مسلسل چلتے رہے۔ پھر ایسے ہی ایک ویران علاقے میں قیام کیا گیا۔ ڈیڈی اس سفر سے بہت ناخوش تھے اور ان کی انکل سے جھڑپیں جاری تھیں لیکن انکل غزنوی ان کی ہربات پر ہنس پڑتے تھے۔

پھر شام ہوئی اور پھر رات ہوگئی۔

"آخر یہ سفر کہاں جاکر ختم ہوگا؟" ڈیڈی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں بتا چکا ہوں۔" انکل نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"جہنم کا سفر اتنا آسان تو نہ ہوگا۔"

"ارے جہنمی تو ہمیں وہاں کیوں لے جارہا ہے؟"

"دوستی جو ٹھہری۔" انکل نے ایک قہقہ لگا کر کہا۔ اور ڈیڈی بھی بے چارگی سے ہنستے رہے لیکن دوسرے دن کا سفر خوشگوار تھا اب سرسبز علاقے شروع ہوگئے تھے۔ برف پوش پہاڑ سبزے سے گھرے ہوئے میدان ہواؤں میں ایک انوکھی خوشبو رچی ہوئی تھی اور خواہ مخواہ فطرت میں ایک عجیب سی جولانی پیدا ہوگئی تھی۔

بس دوپہر تک ہم منزل پر پہنچ جائیں گے۔" انکل نے اطلاع دی۔

"خدا کا شکر ہے۔ تمہارے منحوس منہ سے کوئی خوشخبری تو سنی۔" ڈیڈی نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جارہے تھے ماحول کا حسن نکھرتا جارہا تھا۔

"تھوڑی دیر چل کر انکل غزنوی کی بات پر یقین آنے لگا۔ ایسے پر سحر مناظر تھے کہ آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ قدرت نے زمین کو بھی کیا کیا حسن بخش دیا تھا گنگناتی ندیاں سفید جھرنے جو سبز پہاڑوں سے ابل رہے تھے اور کلیلیں کرتے ہوئے جانور ہرنوں کی ڈاریں کی ڈاریں نظر آرہی تھیں۔ لگتا تھا اترو اور پکڑلو واقعتاً بے نظیر علاقہ تھا اور پھر دور پہاڑوں کی آغوش میں بانسوں اور لکڑی کے شہتیروں سے بنا ایک عظیم الشان قلعہ نظر آیا۔

گاڑی اس وقت انکل غزنوی ہی ڈرائیو کر رہے تھے۔ اور اس کا رخ اس قلعے کی سمت ہی تھا۔

"ہوں تو یہ ہے تمہارا ڈربہ۔" ڈیڈی نے کہا۔

"ہاں اب تمہارا بھی ہے۔" انکل غزنوی بہت حاضر جواب تھے۔

"لیکن کیا تم یہاں تنہا رہتے ہو؟؟"

"ہاں میں اپنی ذات میں تنہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہاں دوسرے لوگ بھی ہے لیکن میں تنہا ہوں۔"

ہمیشہ فلسفہ بگھارتے ہو ایک بھی عادت تو نہیں بدلی ہے تم نے۔"

"عادات نہ خود ڈالی جاتی ہے' نہ بدلی جاتی ہے انسان بے بس ہے۔" انکل غزنوی

نے کہا۔ اور پھر ہم اس قلعے کے پھاٹک پر پہنچ گئے جہاں بہت سے مرد' عورتیں اور بچے کھڑے تھے مختصر ترین لباسوں میں ملبوس' قوی ہیکل اور جفاکش یقیناً یہ مہذب لوگ نہ تھے۔

وہ سب خوشی سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔

"بونارا آگیا ـــــ بونارا آگیا ـــــ" بچے چیخ رہے تھے۔ گاڑی اندر داخل ہو گئی۔ اور سب کے سب اس کے پیچھے دوڑتے رہے میں یہ تمام باتیں دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انکل غزنوی اتنے پراسرار انسان ہوں گے۔ انکل ایک ایک بچے کو اٹھا اٹھا کر پیار کر رہے تھے عورتوں کے سروں پر ہاتھ پھیر رہے تھے' مردوں کے شانے تھپتھپا رہے تھے جیسے یہ سب ان کی اولادیں ہوں۔

پھر انہوں نے اپنے سامان کے بنڈل کھولے۔ بڑے بنڈل تھے جو پیٹوں سے کسے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے بھی میں نے ان بنڈلوں کے بارے میں سوچا نہ تھا نہ جانے ان میں کیا ہے' لیکن کھلنے پر معلوم ہوا کہ ان میں ان سب کے لئے تحائف ہیں کپڑے کھانے پینے کی چیزیں اور اور نہ جانے کیا الابلا جو انکل نے ان سب میں تقسیم کردیں اور پھر وہ گردن اٹھا کر بولے۔

"شینا کہاں ہے۔"

"جھرنے پر گئی ہے۔" ایک مرد نے بتایا اور انکل ایک گہری سانس لے کر رہ گئے نہ جانے یہ شینا کون ہے میں ڈیڈی اور انکل اب ان لوگوں سے فارغ ہو گئے تھے۔ تب وہ ہمیں لئے ہوئے اندر آئے پوری عمارت لکڑی سے بنائی گئی تھی ضروریات زندگی کے سارے لوازمات موجود تھے کسی چیز کی کمی نہیں تھی کئی بڑے بڑے کمرے جن میں سے ایک کمرہ ہمیں دے دیا گیا' وہاں ہمارا سامان رکھ دیا گیا تھا۔

وہ باتھ روم ہے' نہا دھو کر فارغ ہو جاؤ۔ پھر چائے پئیں گے۔" انکل غزنوی نے کہا اور ڈیڈی نے گردن ہلا دی۔ انکل کمرے میں چلے گئے۔

"خوب ہے یہ شخص بھی" ڈیڈی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میرے گمان میں بھی نہیں تھا ڈیڈی کہ انکل اس قدر پراسرار انسان ہوں گے۔"

"وہ ہمیشہ کا ایسا ہے' کیا کرتا ہے' کیا سوچتا ہے کبھی اس کے بارے میں صحیح انداز نہیں لگایا جاسکا ویسے بڑا خوبصورت علاقہ ہے کیا تمہیں پسند آیا"

"بے حد۔" میں نے جواب دیا۔

"تب کیا حرج ہے چند روز یہاں گزار لئے جائیں تو۔؟"

"کیوں نہیں ڈیڈی' ضرور"

"ویری گڈ مجھے تمہارا ہی خیال تھا مجھے تو ایسی جگہیں بہت پسند ہیں اور پھر غزنوی کے ساتھ یہاں شکار بھی رہے گا۔ کسی زمانے میں میرا محبوب مشغلہ تھا۔"

"یقیناً" میں نے جواب دیا۔

"جاؤ پہلے تم غسل کر کے لباس بدل لو۔" ڈیڈی نے کہا اور میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم درمیانی کمرے میں جہاں ایک اعلیٰ درجے کی ڈائننگ ٹیبل پڑی ہوئی تھی' چائے کے لئے بیٹھے تھے۔ مقامی لوگوں میں سے تین افراد میز پر چائے کا سامان لگا رہے تھے' خاصے لوازمات تھے جن میں کچھ اجنبی تھے۔

"یہ میری دریافت ہیں۔ یہاں کچھ خصوصی پھل پائے جاتے ہیں۔ جن سے یہ اشیا تیار کی جاتی ہیں۔ یہ اندرونی علاقوں کے جنگلی باشندوں کی خوراک ہے میں نے اسے کچھ جدید شکلیں دے دی ہیں' مثلاً حلوہ۔ درحقیقت حلوہ بے حد لذیذ تھا کسی پھل سے تیار کیا گیا تھا۔

"ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے" ڈیڈی نے پوچھا۔

یہ بچے میرے ساتھی اندرونی علاقوں کے باشندے ہیں میرا مطلب ہے تہذیب یافتہ قوموں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بس میرے ساتھ رہتے ہیں میرے کام کرتے ہیں کھیتی باڑی خود کر لیتے ہیں اور دوسری ضروریات میں پوری کر دیتا ہوں۔ میں نے اپنی زبان بھی سکھا دی ہے۔ پوری طرح قابل بھروسہ مکمل طور سے قابل اعتماد۔"

"بڑی عجیب زندگی گذار رہے ہو' ویسے یہاں کچھ حادثے بھی پیش آتے رہتے ہوں گے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"حادثات کا تو زندگی سے گہرا تعلق ہے حادثات نہ ہوں تو زندگی بے مزہ ہو

جائے۔"

"یہاں کی کیا کیفیت ہے!"

"اکثر زلزلے رہتے ہیں کبھی کبھی شیر ادھر آنکلتا ہے تو خاصی گہما گہمی رہتی ہے اور اسے ہلاک کرنے کے نت نئے طریقے سوچے جاتے ہیں اور جب وہ ہلاک ہو جاتا ہے تو ایسی خوشی ہوتی ہے جیسے نہ جانے کیا مل گیا۔

"خوب اور کچھ؟"

بس کبھی کبھی قریبی وحشی لوگوں کے ذہنوں پر خناس سوار ہوتا ہے تو وہ حملہ کر دیتے ہیں لیکن ابھی تک ان کے یہاں آتشی ہتھیار نہیں استعمال ہوئے اس لئے اب وہ ادھر کا رخ نہیں کرتے ہاں سمندر کے اس طرف بہت سے جزائر ہیں جہاں کے لوگ زیادہ ہوشیار اور چالاک ہیں وہ آتشیں ہتھیاروں کا استعمال بھی جانتے ہیں۔ صرف ایک بار ان سے مڈبھیڑ ہوئی تھی ایک شخص کی تلاش میں آئے تھے۔ تقریباً بارہ سال پہلے کی بات ہے جب شینا آٹھ سال کی تھی اور سوبیتو اسے لایا تھا۔

"سوبیتو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں انہیں میں سے کسی جزیرے کا باشندہ تھا۔ ان کا آپس میں جھگڑا چل گیا' سوبیتو نے مجھے اس کی تفصیل بتائی تھی۔"

"کیا قصہ تھا انکل مجھے بتایئے میں اس علاقے میں بڑی کشش محسوس کر رہا ہوں۔"

"بارہ سال قبل کی بات ہے۔ سمندر کی اس طرف موجود جزیروں کی طرف سے ایک چھوٹی سی کشتی ساحل سے آ لگی اس میں ایک نوجوان آدمی اور ایک آٹھ سالہ بچی سوار تھی۔ میں اس وقت سمندر کے کنارے پر موجود تھا میں نے ان دونوں کو کشتی سے نکالا۔ مرد سخت زخمی تھا۔ اس کے جسم پر بھالے کے وار تھے۔ ان سے کافی خون بہہ گیا تھا۔ میں اسے لے آیا۔ اور پھر میں نے اس کی مرہم پٹی کی لیکن اس نے بتایا کہ اب وہ شاید ہی بچ سکے کیونکہ جن بھالوں کے نشان اس کے جسم پر ہیں وہ زہریلے تھے ان کا زہر کسی طور جسم سے زائل نہیں ہوتا۔ میں نے اس وقت اس کے بارے میں تفصیل نہیں پوچھی بلکہ پوری محنت سے اس کے زخموں کا علاج کرنے لگا۔ میرے علاج' نے اس کے

زخم ٹھیک تو نہ کئے۔ البتہ وہ کسی حد تک خشک ضرور ہو گئے تھے۔

تب ایک دن سوبیتو نے مجھے اپنے بارے میں تفصیل بتائی۔ اس نے بتایا کہ وہ قبیلہ ساگو سانتو کا باشندہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ جو بچی ہے وہ اس کی بیٹی ہے ساگو سانتو پر پجاریوں کا راج ہے اور قبیلے کے عوام کی زندگی ان پجاریوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ ایک سردار بھی ہے مگر وہ کٹھ پتلی ہوتا ہے ا ر پجاریوں کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ سوبیتو نے بتایا کہ اسے اپنے قبیلے کی ایک لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس نے رسم رواج کے مطابق شادی کا پیغام دے دیا اور پھر وہ رسم بھی پوری کر دی جو شادی کرنے کے لئے ہوتی ہے یعنی ایک جنگلی سانڈ شکار کر کے لڑکی کے باپ کے گھر بھجوا دیا جاتا ہے۔ اس کی محبوبہ کے باپ نے لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کر دی تھی۔ سوبیتو کے کہنے کے مطابق اس کی بیوی بہت حسین تھی۔ پجاری قبیلے کی جس لڑکی کو پسند کر لیں وہ ان کی ملکیت ہوتی ہے اس لئے سوبیتو نے اپنی بیوی کو پجاریوں کی نگاہوں سے بچا کر رکھا تھا یہاں تک کہ سوبیتو کے ہاں شینا پیدا ہوئی پھر دو سال کے بعد اور ایک بچی ہوئی وہ سکون کی زندگی گزار رہا تھا کہ اس کی زندگی میں اچانک ایک بھونچال آ گیا کسی دن ایک پجاری اپنی خانقاہ سے نکل آیا۔ عیاش پجاری کی نگاہوں کے سامنے جو پہلی لڑکی آئی وہ سوبیتو کی بیوی تھی حالانکہ اس کے دو بچے ہو گئے تھے لیکن آج بھی وہ اتنی ہی خوبصورت تھی کہ پجاری نے اسے پسند کر لیا۔ اور پھر سوبیتو کی دنیا کو اجڑنے سے کون روک سکتا تھا۔

اس کی بیوی پجاری کی خانقاہ میں پہنچ گئی۔ سوبیتو نے ہر دروازہ کھٹکھٹایا اس نے بڑے پجاری سے فریاد کی لیکن بڑے پجاری نے اسے دھکے دے کر نکلوا دیا۔ بھلا قبیلے کی رسوم کی خلاف ورزی کرنے والے کو کون منہ لگا سکتا تھا سردار کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ سوبیتو کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ جسے اپنی بپتا سناتا۔ وہ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگتا تھا بھلا یہ کوئی بات تھی اگر اس کی بیوی دو بچے کے بعد بھی پجاری کو پسند آ گئی تو یہ اس کی خوش قسمتی تھی۔ اسے واپس کرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

تب مجبور ہو کر سوبیتو بغاوت پر اتر آیا۔ وہ اپنی بیوی سے چوری چھپے ملا اور اس نے اس سے کہا کہ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ خاموشی سے اس

کے ساتھ نکل چلے۔ اور اپنی دونوں بچیوں کو لے کر وہ سمندر پار کے کسی دور دراز مقام پر چلے جائیں۔

لیکن اس کی بیوی نے اسے دھتکار دیا۔

"تو پاگل ہو سکتا ہے سوبیتو' میں پاگل نہیں ہوں جو پجاری کو دھوکہ دینے کا گناہ کروں' میں یہاں بہت خوش ہوں۔"

"اور سوبیتو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جس کے لئے وہ اس قدر سرگرداں تھا خود اسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اور ایک کالی رات میں جب پجاری اور سوبیتو کی بیوی ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے سوبیتو نے تیز بھالے سے دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دونوں کی بھیانک چیخ سے دوسرے لوگ جاگ پڑے اور سوبیتو وہاں سے سرپٹ دوڑا۔ پروگرام کے مطابق وہ بچیوں کو لے کر سمندر کے کنارے کی طرف بھاگا جہاں فرار کے لیے کشتی موجود تھی۔

لیکن جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی تھی کہ سربیتو نے پجاری کو ہلاک کردیا ہے۔ لوگ اپنے اپنے ہتھیار لے کر پجاری کا انتقام لینے دوڑ پڑے تھے۔ کیونکہ یہ بے حد ثواب کا کام تھا۔ ایک جگہ سوبیتو چند لوگوں کے ہاتھوں لگ گیا اور اس نے ان سے خوفناک جنگ کی اس نے اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا لیکن اس کوشش میں اس کی ایک بچی سمندر میں نکل گئی تھی لوگوں نے غول کے غول مشعلیں لئے اسے تلاش کر رہے تھے۔ اس نے بچی کو بہت سی آوازیں دیں لیکن وہ نہ ملی۔ لوگ قریب آتے جارہے تھے خود اس کا جسم زخموں سے نڈھال تھا۔ اس لئے مجبوراً وہ ایک ہی بچی کو لے کر چل پڑا۔ اور پوری رفتار سے، کشتی چلاتا ہوا ان سے دور نکل آیا۔ اس طرح وہ ایک بچی کے ساتھ یہاں تک پہنچا تھا۔

یہ سوبیتو کی کہانی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک ماہ تک زندہ رہا لیکن زہر اپنا کام کر رہا تھا۔ چنانچہ ایک صبح اس نے دم توڑ دیا۔ اس کی بچی کو میں نے پال لیا تھا۔ پورے پانچ سال کے بعد اچانک ایک شام بہت سی کشتیاں ساحل سے آلگیں ان سے اترنے والے ساکو سانتو قبیلے کے لوگ تھے جن کی قیادت ایک قوی ہیکل جوان کر رہا تھا۔ یہ لوگ آتشیں

ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ساکو سانتو قبیلے کا سردار مجھ سے ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ سوبیتو سے پجاری کے قتل کا انتقام لینے آیا تھا۔ وہ نیا سردار بنا ہے اور نئے سردار کے لئے ضروری ہے کہ وہ ثواب کا کام کرے۔ چنانچہ سوبیتو کو گرفتار کرکے وہ ثواب کمانا چاہتا ہے میں نے اسے بتایا کہ سوبیتو مرچکا ہے صرف اس کی بچی میرے پاس موجود ہے۔ سردار نے میری بات نہ مانی اور اس پوری عمارت کی تلاشی لی پھر اس نے مطالبہ کیا کہ بچی کو اس کے حوالے کردیا جائے۔

تب میں نے اس سے کہا کہ وہ شرافت سے واپس چلا جائے ورنہ پھر اس کے ساتھی اس کے انتقام کے چکر میں پھریں گے۔ یوں ہماری ٹھن گئی۔ سردار باہر نکل گیا۔ لیکن چند گھنٹوں کے اندر اپنے آدمیوں کو منظم کرکے اس نے عمارت کو گھیر لیا۔ ان کی تعداد مناسب تھی لیکن میرے ساتھی تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے بہترین مورچے بنائے اور وہی ہوا جو میں نے کہا تھا۔ نیا سردار بمشکل تمام جان بچا کر بھاگ سکا اس کے آدھے آدمی بھی زندہ نہیں گئے تھے۔

بہرحال اس کے بعد کئی سال تک ہم ان کے دوسرے حملے کا انتظار کرتے رہے لیکن ان کی اس طرف آنے کی ہمت نہیں پڑی اور اب شینا بڑی ہوگئی ہے۔

انکل غزنوی نے کہانی ختم کردی۔ درحقیقت دلچسپ کہانی تھی اس رات میں کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرے دل میں اس جنگلی لڑکی کو دیکھنے کی خواہش تھی لیکن دوسرے دن ناشتے پر بھی وہ موجود نہیں تھی دوپہر کے کھانے پر بھی وہ نظر نہیں آئی' نہ ہی انکل غزنوی نے اس کے بارے میں کوئی تذکرہ کیا تھا۔ وہ تو بس ڈیڈی میں کھوئے ہوئے تھے' ہروقت سر جوڑے بیٹھے رہتے۔ شام کو چار بجے کے قریب میں اکتا کر اس قلعے سے نکل آیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا۔ کہ خود ہی اسے تلاش کروں گا۔ یہ لوگ تو مجھے بھول ہی گئے ہیں۔ چنانچہ میں جنگل میں ایک سمت چل پڑا۔

اس علاقے کی بے پناہ خوبصورتی سے کون انکار کرسکتا تھا۔ درحقیقت قدرت نے اسے پوری فیاضی سے حسن بخشا تھا ان حسین مناظر میں گم ہو کر میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ میرے قدم اس خوبصورت جھرنے کی طرف بڑھ گئے جو جھاگ اڑاتا ہوا کافی بلندی

سے گر رہا تھا۔ میں جھرنے کی طرف بڑھ گیا۔

اور پھر ایک پتھر پر بیٹھ کر قدرت کے ان حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔

اچانک میری نگاہ کسی متحرک شے پر پڑی اور میں خیالات سے نکل آیا۔ ایک سیاہ رنگ کا ہرن تھا جو جھرنے سے بن جانے والی ندی کا شیریں پانی پینے آیا تھا۔ میں چونکہ ساکت و جامد تھا۔ اس لئے اس کی نگاہ میرے اوپر نہیں پڑی تھی۔ اس نے نہایت خاموشی سے پانی میں منہ ڈال دیا۔ میں بھی بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ تاکہ ہرن آرام سے اپنی پیاس بجھا سکے۔

لیکن پھر اچانک میری نگاہ ہرن سے تھوڑے فاصلے پر پانی کے جھرنے میں ایک سر پڑی۔ کوئی جل پری تھی جو پانی سے برآمد ہو رہی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا بھالا تھا۔ اور دوسرے لمحے بجلی کی سی تیزی سے اس نے بھالا ہرن کی سمت پھینکا۔ بلا کی قوت تھی۔ بالا ہرن کے پیٹ میں پیوست ہو گیا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

میں بہت مایوس ہوا اور ہرن کی موت پر میرا دل رو پڑا تھا۔ لیکن میں گھبرائے ہوئے انداز میں اس کو دیکھ رہا تھا جس کے جسم پر لباس نام کی کوئی شے نہ تھی۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگی اس کا جسم برہنہ تھا اور مکمل طور پر ننگا تھا۔ اس نے بھالا ایک جگہ پر رکھ کر اس کے تڑپنے کا نظارہ کرنے لگی۔ میں آنکھیں اور منہ پھاڑے اس کی وحشت کا نظارہ کرنے لگا۔

پھر جب ہرن کی تڑپ ختم ہو گئی تھی تو وہ جھکی اور اس نے ہرن کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں۔ پھر اسے گھسیٹتی ہوئی ایک چٹان کے عقب میں لے جانے لگی۔ میں اسے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور احتیاط سے اس کی طرف جانے لگا۔ لیکن وہ کافی تیز حس رکھتی تھی اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہو گیا دوسرے لمحے اس نے جلدی سے ہرن کے جسم میں گھسا ہوا نیزہ نکالا اور تن کر کھڑی ہو گئی۔

اس کی نگاہیں میرے اوپر جمی ہوئی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں اس کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھا لیکن اس کی وحشت سے خوفزدہ تھا۔ نہ جانے یہ وحشی لڑکی میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ لیکن حیرت کی بات یہ

تھی کہ اسے اپنی برہنگی کا ذرا سا بھی احساس نہیں تھا جبکہ وہ مجھے دیکھ بھی چکی تھی۔

اور جب اس نے کوئی احساس نہ کیا تو میں دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ چونکی کھڑی تھی۔ میں اس کے مقابل پہنچ گیا۔

"تم تم کون ہو؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تم کون ہو؟" اس نے فوری سوال کیا۔ اور میں بھونچکا رہ گیا وہ تو صاف زبان بول رہی تھی۔

"میں —— اس جگہ رہتا ہوں۔ غزنوی کا مہمان ہوں۔"

"ارے۔" اس نے حیرت سے کہا۔ اور پھر اس کا بھالے والا ہاتھ نیچے ہو گیا۔ "تم بوآنا کے وہ مہمان ہو جن کے بارے میں سوتا نے مجھے بتایا تھا۔"

"ہاں۔" میں نے جلدی سے گردن ہلائی حالانکہ نہ میں بوآنا کو جانتا تھا نہ سوتا کو۔

اور وہ ہنس پڑی۔ بڑی دلکش ہنسی تھی اس نے جھک کر دوبارہ ہرن کی ٹانگیں پکڑیں اور ہاتھ سے مجھے اشارہ کرتے ہوئے بولی:

"آؤ میرا نام شینا ہے اور میں بھی وہیں رہتی ہوں۔"

اور میرے اوپر بجلی سی گر پڑی۔ یہ، یہ شینا ہے یہ بیباک اور برہنہ لڑکی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چٹان کے عقب میں اس کا کچھ اور سامان پڑا تھا۔ مثلاً لکڑیوں کا ڈھیر گوشت بھوننے کی ٹکٹکی اور کچھ کپڑے اس نے بیزاری سے ایک ڈھیلا ڈھیلا لبادہ اٹھایا اور اپنے کاندھوں پر ڈال دیا۔ جیسے اسے لباس سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ لیکن فرض پورا کرنے کے لئے پہن لیتی ہو۔

پھر اس نے اپنے سامان سے ایک چاقو نکالا۔ اور ہرن کی گردن کاٹ کر اس کی کھال ادھیڑنے لگی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کیا ٹائپ ہے اس لڑکی کا۔ لیکن لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ آزاد ماحول کی پروردہ، حسین جسم کی مالک، خود سے ناآشنا ایسی کسی لڑکی کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

میں اسے کھال ادھیڑتے دیکھتا رہا۔ وہ نہایت چابکدستی سے ہرن کی کھال اتاری جا رہی تھی جیسے وہ اس کام کی ماہر ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کھال اتار، ہرن کی آلائش

صاف کر دی اور پھر اسے ٹکٹکی میں اڑس دیا۔ اور اس کے بعد وہ ہرن کے نیچے آگ جلانے لگی اس کام سے فارغ ہو کر اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ دیکھتی رہی پھر ایک پتھر کی طرف۔ اشارہ کرکے بولی۔

بیٹھ جاؤ تم کہاں سے آئے ہو؟"

"دور سے بہت دور سے۔"

"میں سمجھ گئی جہاں سے بو آنا کپڑے اور کھانے پینے کا سامان لاتا ہے۔"

"ہاں کیا تم نے وہ دنیا دیکھی؟"

"میں دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟!"

"مجھے وہ پسند نہیں ہے' مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"اوہ۔" میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ الجھی ہوئی تھی اس کے چہرے پر کش مکش رقصاں تھی۔

تمہیں یہ دنیا پسند ہے۔

ہاں۔" اس نے اسی انداز میں کہا۔ اور پھر ہرن کو گھمانے لگی۔ شعلے تیز ہو گئے تھے۔

"تمہیں شکار کرنے کی خاصی مہارت ہے۔" میں نے کہا۔

"ایں —— ہاں —— وہ اچانک ہنس پڑی۔ "کیا تم نے مجھے شکار کرتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"ہاں۔"

"یہ صرف میرا طریقہ ہے میں پانی میں چھپ جاتی ہوں اور جب ہرن پانی پینے آتے ہیں تو میں انہیں آسانی سے شکار کر لیتی ہوں۔"

"تمہیں ان معصوم جانوروں پر رحم نہیں آتا؟"

"کیوں۔ رحم کی کیا بات ہے' کیا تمہیں ان کا گوشت پسند نہیں ہے؟" اس نے کہا۔

"کھاؤ گے!"

"ہاں۔" میں نے گردن ہلا دی۔ مجھے اس کی اداؤں میں بڑی کشش محسوس ہو رہی تھی اس نے چاقو سے بھنے ہوئے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میری طرف بڑھا دیا۔ اور دوسرا خود کھانے لگی اس کے کھانے کا انداز بھی بڑا وحشیانہ تھا۔ حسین اور پر کشش لڑکی تھی۔ میرے ذہن میں رومان کے کیڑے کلبلانے لگے۔ لیکن بہرحال اس سے عشق ٹیڑھی کھیر تھا۔ شکاری لڑکی تھی۔ نہ جانے رومان کو کیا سمجھے۔ بالکل الھڑ اور وحشیانہ فطرت کی مالک تھی بہرحال میں نے سوچا کہ اگر ڈیڈی یہاں کچھ دن رک گئے تو اسے رام کر ہی لوں گا کونسی بڑی بات تھی بہرحال لڑکی تھی کوئی بچی نہ تھی۔

اسی رات جب ہم دستر خوان پر بیٹھے تو میں اپنا تجسس نہ روک سکا ڈیڈی انکل غزنوی سے گفتگو رہے تھے میں نے بھی ان سے سوال کر دیا۔

"ساکو سانتو قبیلے کی اس لڑکی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا انکل کیا وہ آپ کے پاس نہیں رہتی؟"

"شینا —— " انکل غزنوی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "عجیب و غریب فطرت کی مالک ہے وہ لڑکی۔" بچپن سے یہاں ہے میں نے اسے انسان بنانے کی بہت کوشش کی۔ تم یہاں موجود دوسرے لوگوں کو دیکھ رہے ہو کافی حد تک انسان بن گئے ہیں لیکن شینا میری اپنی تربیت کے باوجود انسان نہ بن سکی۔

وہ بے حد ذہین ہے بہت چالاک اور پھرتیلی ہے ایک بات سمجھتی ہے لیکن یقین کرو منصور میاں۔ اس نے بچپن ہی سے یہاں کے ماحول کو قبول نہ کیا۔ وہ ابتدا سے وحشی ہے مار باندھ کر بٹھا لو کچھ بھی کر لو لیکن مہلت ملتے ہی وہ پھر سے وہی بن جاتی ہے۔ وہ یہاں ایک بار بھی نہیں مسکرائی۔ آج تک کسی نے اسے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ انکل غزنوی نے کہا۔ اور میرے ذہن میں اس کی ہنسی آ گئی۔

میرے سامنے تو وہ ہنسی تھی۔ ہاں لیکن اپنی ایک وحشیانہ حرکت پر۔

"وہ کہیں ایک جگہ نہیں سوتی کبھی کبھی تو جنگل میں ہی رات بسر کر لیتی ہے کبھی میرے ساتھ کھانا نہیں کھاتی۔ جانوروں کا شکار کر کر کے کھاتی ہے۔" انکل غزنوی نے اس کے بارے میں مزید بتایا۔

"شینا سامنے آؤ۔" بوڑھے نے چیخ کر کہا۔ اور مجمع سے ایک لڑکی نکل کر سامنے آگئی۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے مخصوص انداز میں بال باندھے ہوئے تھے اور اس کے بالوں میں ایک خوبصورت پھول لگا ہوا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر عجیب سی بے باکی تھی اور اس کے کندھے پر ایک خونخوار عقاب بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم بتاؤ۔ تمہارے غدار باپ نے پادری اور تمہاری ماں کو قتل کر دیا تھا۔ انتقام کے لئے وہ موجود نہیں ہے لیکن وہ موجود ہے جس نے تمہاری ماں کے قاتل کو پناہ دی تھی بولو اسے کیا سزا دی جائے۔"

شینا تو کچھ نہ بولی۔ لیکن شینا آگے بڑھی اور ہمارے نزدیک پہنچ گئی اس نے ہمارے گرد تین چکر لگائے میرے سامنے رکی مسکراتی سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھا اور واپس چلی گئی۔

"میری رائے ہے کہ انہیں آزاد کر دیا جائے۔" اس نے کہا اور تمام پادری کھڑے ہو گئے۔

"یہ ناممکن ہے انہوں نے ہمارے آدمیوں کو بھی قتل کیا ہے۔"

"اس سلسلہ میں لڑکیوں سے رائے لینے کی ضرورت نہیں ہے مقدس پادری انہیں قتل کر دیا جائے۔" سردار ہاڑا نے تجویز پیش کی۔

"ہاں انہیں قتل کر دیا جائے۔ انہیں قتل کر دیا جائے' چاروں طرف سے آوازیں ابھریں۔

ہم ان کے ساتھ صرف ایک رعایت کر سکتے ہیں وہ یہ کہ انہیں لڑ کر مرنے دیا جائے۔ یہ تینوں ہمارے ایک ایک آدمی سے مقابلہ کریں گے۔ اگر انہوں نے انہیں قتل کر دیا تو انہیں آزاد کر دیا جائے گا ورنہ یہ ان کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔

اور اس فیصلے پر سب خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

کل دن میں ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ پادریوں نے فیصلہ کر دیا اور سب اس فیصلے سے متفق ہوئے ہمیں دوبارہ واپس کٹہرے میں بند کر دیا گیا۔ اب تو میری بھی بری حالت تھی۔

انکل غزنوی افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

افسوس اس وحشی لڑکی نے بھی وفا نہ کی جسے میں اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ وہ کس قدر خوش ہے۔

"ڈیڈی کی تو آواز ہی بند ہو گئی تھی چاند سفر کر رہا تھا۔ اس وقت رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا کہ اچانک کٹہرے کے عقب سے شی شی کی ایک آواز ابھری۔ ڈیڈی اور انکل غزنوی اونگھ گئے تھے میں نے چونک کر ادھر دیکھا شینا تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے بلایا اور میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

شینا نے کٹہرے سے اپنے دونوں ہاتھ نکال دیئے۔ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک ہار تھا۔ اور وہ چمک دار آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اس نے اشارے سے مجھے اور قریب بلایا اور میں بادل ناخواستہ کٹہرے سے لگ گیا۔ تب اس نے پھولوں کا ہار میری گردن میں ڈال دیا اور پھر میرے ہاتھ پکڑ کر چومے۔ اور پھر اس نے دوسری سمت چھلانگ لگا دی۔

میں بیوقوفوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑا رہ گیا۔ اتنا تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ اس لڑکی نے مجھ سے چاہت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اب —— اب کیا ہو سکتا ہے میں یا کوئی کیا کر سکتا ہے؟

"رات بھر میں اسی الجھن میں رہا میں نے ہار اتار کر باہر پھینک دیا صبح کو ہمیں ناشتہ دیا گیا۔ ڈیڈی نے تو کچھ نہیں کھایا تھا۔ ہم نے لاکھ کوشش کی۔ لیکن ان کی حالت بہت بری تھی۔ بالآخر ہمیں کٹہرے سے نکال لیا گیا اور میرے ہاتھ کھول دیئے گئے میرے مقابل ایک تنومند وحشی تھا۔ ہم دونوں کے سامنے بھالے ڈال دیئے گئے۔

"نہیں نہیں اسے قتل نہ کرو' اس کے بجائے میری زندگی لے لو' اسے قتل نہ کرو۔" ڈیڈی چیخ پڑے اور پھر وہ بلک بلک کر رونے لگے میرے ہاتھ میں بھالا دے دیا گیا اور میں بے وقوفوں کی طرح اسے لیے کھڑا تھا۔ میں تو آج تک کسی سے گھونسہ بازی نہ کی تھی میں اس ہتھیار کا استعمال کیا جانتا۔ میرے مدمقابل نے نیزہ تول لیا تھا۔ لیکن پھر اچانک ہی میں نے فضا میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنی اور اس سے قبل کہ میرا مدمقابل میرے اوپر

حملہ کرتا۔ اچانک ایک خونخوار عقاب نے اس کے چہرے پر جھپٹا مارا اور اپنے پنجے اس کی آنکھوں میں گاڑھ دیئے۔

میرے مدمقابل کے ہاتھوں سے نیزہ چھوٹ گیا اور وہ پوری قوت سے عقاب کو اپنے چہرے سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا نہ جانے میرے ذہن میں کیا آئی کہ میں نے ہاتھوں میں پکڑا ہوا نیزہ پوری قوت سے مدمقابل کے پہلو میں گھونپ دیا۔ اور اسی وقت عقاب نے اسے چھوڑ دیا۔ پورے مجمع پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔

میرا مدمقابل دم توڑ رہا تھا۔ لیکن اسی وقت مجمع جاگ اٹھا۔ چاروں طرف سے شینا۔ شینا کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور لوگ منتشر ہوگئے سب کے سب شینا کو تلاش کر رہے تھے۔ لیکن شینا اور اس کے عقاب کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ہم تینوں کی سزا آج کے لئے ملتوی کردی گئی۔ وہ سب نئی مجرمہ کو تلاش کر رہے تھے۔

اور یہ کوشش پورے دن جاری رہی یہاں تک کہ رات ہوگئی آج ہمیں کھانے کو بھی کچھ نہ ملا تھا۔ ہم سب کی آنکھوں میں نیند کہاں سے آتی سب کی بری حالت تھی۔

پھر رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا کہ جزیرے کے آخری حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔

ایک شور بلند ہوا۔ اور کٹہرے کے گرد پہرہ دینے والے بھی آگ کی طرف دوڑ پڑے نہ جانے کونسی آگ تھی جو جگہ جگہ بھڑک رہی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے جزیرے کی جھونپڑیوں میں آگ بھڑک اٹھی۔

تب ہی کٹہرے کے پاس شینا نظر آئی اس کے ہاتھ میں ایک مشعل تھی۔ اس نے آناً فاناً کٹہرے کا دروازہ کھول دیا اور شی شی کرکے ہمیں اشارہ کیا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ساحل کی طرف بھاگنے لگی۔ ڈیڈی اور انکل غزنوی ہمارے پیچھے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

شینا ہمیں ایک کشتی تک لے گئی۔ اس نے پوری قوت سے کشتی سمندر میں دھکیل دی۔ اور اب انتظار بے کار، ہم لوگ کشتی میں سوار ہوگئے شینا بھی ہمارے ساتھ تھی اور پھر ہم چاروں ہی پوری قوت سے کشتی کھینچنے لگے جزیرے کی آگ زبردست تھی۔ پورا جزیرہ آگ کا جزیرہ معلوم ہو رہا تھا شینا نے مشعل سمندر میں پھینک دی تھی اور ہم

جزیرے سے دور ہوتے گئے۔

کیا بعد کی کہانی بھی سنانی ضروری ہے؟ ڈیڈی نے انکل غزنوی کے علاقے میں پہنچتے ہی واپسی کا تقاضا شروع کردیا انکل اب کس منہ سے انہیں روک سکتے تھے چنانچہ گاڑی ہمیں لے کر چل پڑی۔ شینا میرے ساتھ تھی بھلا ڈیڈی کی مجال کیا تھی کہ اسے مجھ سے عشق کرنے سے روکتے۔

وہ جنگلی کھلم کھلا مجھے پیار کرتی اور میں بوکھلائے ہوئے انداز میں ڈیڈی کی طرف دیکھتا۔ لیکن ڈیڈی عموماً ایسے موقعوں پر منہ دوسری طرف کرلیتے گویا مجھے اجازت تھی اور جناب والا۔ آج شینا افشاں ہے اور میری بیوی ہے گو اسے انسان بنانے میں کافی دقتیں پیش آئیں اور بلاشبہ اس میں ڈیڈی نے بھی میری مدد کی۔ اگر شینا جزیرے کو آگ نہ لگاتی اور اس کا عقاب میرے مدمقابل کی آنکھیں نہ پھوڑ دیتا تو آج آپ کو یہ کہانی کون سناتا؟ افشاں میری پیاری بیوی۔ آج بھی مجھے بے پناہ چاہتی ہے۔

——O——